
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
دسمبر 2018
URDU TUBE
Digitized by Google

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض
مدیرہ ——— رضیہ جمیل
مدیر منتظم ——— آذر ریاض
مدیر اعزازی ——— امت الصبور
فلم ٹیلی وژن ——— شاہین رشید
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ——— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز















زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

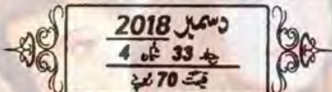
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

subecriptions@khawateendigest.com







دسمبر 2018

جلد 33 شمارہ 4

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [redacted]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

پہلی شمع

دسمبر کا شعاع لیے حاضر ہیں۔

اسلامی تاریخوں کے حساب سے یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ سرور کائنات، آقائے دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اسی مہینے میں دنیا میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے دنیا سے جہالت کے اندھیرے چھٹ گئے۔ ہر سو علم کا اجالا پھیل گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور قدسی زیب کائنات کا سب سے بڑا احسان ہے۔ پروردگار عالم نے ہماری زندگیوں کو سنوارنے اور ہمیں کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محسن انسانیت، تمام جہانوں کے لیے، تمام مخلوقات کے لیے رحمۃ اللعالمین بن کر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہ السلام میں بھی سب سے افضل مقام پر فائز ہیں۔ آپ کے بعد کوئی پیغمبر، کوئی نبی نہیں آئے گا۔

امام انبیاء، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات قیامت تک کے لیے ہیں۔ آپ کی ذات مبارک انسانیت کا کامل نمونہ ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ جہاں آپ کی حیات طیبہ سے رہنمائی نہ حاصل کی جاسکے۔ تاریخ انسانی ایسی شخصیت کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

آج مسلمان تعداد میں دیگر قوموں سے بہت زیادہ ہیں۔ دنیا کے ستر فیصد سے زیادہ وسائل کے مالک ہیں۔ اس کے باوجود دنیا میں سب سے زیادہ خون مسلمانوں کا بہایا جارہا ہے۔ سب سے زیادہ ظلم مسلمانوں پر ہو رہا ہے۔ مٹھی بھر مسلمانوں نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج اگر ہم بھی کا شکار ہیں تو اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ ہم نے غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعوا تو کرتے ہیں لیکن عزیز ان لوگوں کو رکھتے ہیں جو دین و اخلاق میں آپ سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتے۔ جس دن ہمارے قول و عمل میں یکسانیت آگئی، ہماری زندگیاں بدل جائیں گی۔

سروے۔ نیا سال،

ایک اور سال اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شعاع کا اگلا شمارہ یعنی جنوری کا پرچا سالنامہ ہوگا۔ سالنامے میں حسب روایت قارئین کی شمولیت کے لیے سروے بھی شامل ہوگا۔ ہماری خواہش ہے کہ سروے میں زیادہ سے زیادہ قارئین شامل ہوں اس لیے اس بار ایک ہی سوال کر رہے ہیں۔

سوال یہ ہے۔

- گیا سال آپ کو کیا دے گیا۔ کیسا گزرا۔ گئے سال کی کوئی تحریر، کوئی بات جو یاد گار رہی؟

اس سوال کا جواب اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 دسمبر تک موصول ہو جائے۔

اس شمارے میں،

- کاسۂ ذات۔ قرۃ العین خرم کا مکمل ناول، ٭ چوڑی منڈی۔ فرزانہ کھرل کا مکمل ناول،
- راشدہ رفعت کا ناولٹ۔ ممی ڈیڈی کے جھگڑے، ٭ رخسانہ نگار عدنان اور صائمہ اکرم کے ناول،
- سندس جبیں، حمیرا نوشین، انعم یوسف رضوی، عطیہ خالد اور شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے،
- اے پی لاشاری سے ملاقات، ٭ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کے تجربات،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ ہم آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور ان کے درمیاں جو ہیں، مکینوں اور مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اُس کی یاد آتی ہے
ستارے، چاند، سورج ہیں سبھی اس کے نشانوں میں

اسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خوابِ ہستی کی
وہ نام اک حرف نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اسی کے پاس اسرار جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کر سکتا ہے جو چاہے، وہ ہر اک شے پہ قادر ہے
وہ سن سکتا ہے رازوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوفِ باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیر اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی ملے شاید پرانی داستانوں میں

منیر نیازی

حقیقت میں مدینے کا سفر کیسا لگے گا
خوابوں کی تعبیر کا ثمر کیسا لگے گا

میں اُڑ کے چلی جاؤں کسی روز مدینے
ہو جائے اگر رب کا امر کیسا لگے گا

ہر شے جو نرالی ہے وہاں دیکھ لوں جا کر
مل جائے مجھے نورِ نظر کیسا لگے گا

آواز نبیؐ جی کی مرے کانوں میں گونجے
معطر ہو کے مری روح کا نگر کیسا لگے گا

مل جائے اگر یادوں کا نوری سا نوشتہ
ہر سو رہے رحمت کا ابر کیسا لگے گا

سرکار اگر رکھ لیں مدینے میں تو کیسا
سودا جو وہاں جائے گزر کیسا لگے گا

کوثر خالد سودا

ادارہ

پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں

عیادت اور تدفین

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مریض کی بیمار پرسی کرنے، جنازے کے ساتھ چلنے، چھینکنے والے کی چھینک کا جواب دینے، قسم دینے والے کی قسم پوری کر دینے، مظلوم کی مدد کرنے، دعوت کرنے والے کی دعوت قبول کرنے اور سلام کے پھیلانے اور عام کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری و مسلم)

پانچ حق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا، بیمار کی مزاج پرسی کرنا، جنازوں میں پیچھے چلنا، دعوت کا قبول کرنا اور چھینکنے والے کی چھینک کا جواب دینا۔"

(بخاری و مسلم)

اللہ کا قرب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بے شک اللہ تعالیٰ روز قیامت فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت (مزاج پرسی) نہیں کی۔"

انسان کہے گا: "اے میرے رب! میں کیسے تیری عیادت کرتا جب کہ تو تمام جہانوں کا پروردگار ہے؟"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"کیا تجھے علم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا لیکن تو نے اس کی مزاج پرسی نہیں کی؟ کیا تجھے علم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی بیمار پرسی کرتا تو یقیناً تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھلایا نہیں۔"

وہ کہے گا: "اے میرے رب! میں تجھے کس طرح کھانا کھلاتا جب کہ تو تو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے؟"

اللہ فرمائے گا:

"کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا؟ کیا تجھے علم نہیں تھا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو یقیناً اس کو میرے پاس پاتا؟ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔"

وہ کہے گا: "اے میرے رب! میں تجھے کیسے پانی پلاتا؟ تو تو تمام جہانوں کا رب ہے؟"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

"تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا تو نے اسے پانی نہیں پلایا۔ کیا تو نے نہیں جانا کہ اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو یقیناً اس کو میرے پاس پاتا؟"

(مسلم)

فوائد و مسائل:

اللہ کی ضرورت مند مخلوق کی خدمت کرنا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اللہ کو بہت پسند ہے اور وہ اس کی بہترین جزا عنایت فرمائے گا۔

اس میں اہل حاجات کے ساتھ حسن سلوک

کرنے کی نہایت موثر اور بلیغ انداز میں تعلیم دی گئی ہے۔

''تو مجھے اس کے پاس پاتا'' اللہ تعالیٰ کا اس کے پاس ہونا ایسے ہے جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔

تلقین

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مریض کی عیادت کرو، بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور قیدی کو رہا کراؤ۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

اسلام نے مسلمانوں کو باہم تعاون کرنے کی جو تاکید کی ہے، گزشتہ حدیث کی طرح یہ حدیث بھی اسی تعلیم کا حصہ ہے۔

2۔قیدی سے مراد وہ مسلمان قیدی ہے جو کسی وجہ سے یا جنگ میں کافروں کا قیدی بن گیا ہو۔ایسے مسلمانوں کو کفار کے زنداں خانوں سے آزاد اور رہا کرانا ضروری ہے اور اس میں وہ قیدی بھی آسکتے ہیں جو ناجائز مقدمات میں پھنسے ہوئے یا جیلوں میں محبوس ہوں۔اور اسی طرح وہ بھی اس میں شامل ہیں جو قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے یا کسی کے ضمانتی بننے کی وجہ سے مالی تعاون کے ضرورت مند ہوں۔ان کو بھی اس بوجھ سے نکالنا اور ذلت وخواری سے بچانا ضروری ہے۔

عیادت کا ثواب

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو واپس آنے تک وہ جنت کے تازہ پھلوں کے چننے میں مصروف رہتا ہے۔'' (مسلم)

فرشتوں کی دعا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''جو مسلمان کسی مسلمان کی صبح کے وقت مزاج پرسی کرتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے خیر کرتے رہتے ہیں۔اور اگر شام کے وقت بیمار پرسی کرتا ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے حق میں دعا کرتے رہتے ہیں۔اور جنت میں اس کے لیے چنے ہوئے پھلوں کا حصہ ہے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ: اس میں اور اس سے ماقبل کی روایت میں مریض کی عیادت کی فضیلت بیان کی گئی ہے تاکہ لوگوں کے اندر ترغیب موجود رہے۔

غیر مسلم کی عیادت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔وہ بیمار ہوگیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اس سے فرمایا:

''اسلام قبول کرلے۔''

اس نے (سوالیہ نظروں سے) اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے پاس ہی تھا۔اس نے کہا ''ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لے۔''

چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے:

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اس لڑکے کو جہنم کی آگ سے بچالیا۔'' (بخاری)

فائدہ:

اس میں کافر کی عیادت کرنے کا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے کا، صالحین کی صحبت کے اثرات کا، اہل کفر سے مایوس نہ ہونے کا اور والدین کا اپنی اولاد کو نیکی اختیار کرنے کی، گو وہ خود اس سے دور ہوں، تلقین کرنے کا بیان ہے۔

بیمار کے لیے دعا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی آدمی اپنی کسی بیماری کی بابت عرض کرتا یا اس کو کوئی پھوڑا یا زخم ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگلی کے ساتھ ایسے کرتے، اور حدیث کے راوی حضرت سفیان نے اپنی انگشت شہادت زمین پر رکھی پھر اسے اٹھایا (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کرتے) اور یہ دعا پڑھتے: "اللہ کے نام سے ہماری زمین کی مٹی ہم میں سے بعض کے لعاب دہن سے مل کر ہمارے رب کے حکم سے ہمارے مریض کی شفایابی کا ذریعہ ہو گی۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگشت شہادت زمین پر رکھ کر اٹھا لیتے اور اس میں اپنے لعاب دہن کی آمیزش کر کے مریض کے درد والے حصے یا زخم پر رکھتے اور مذکورہ دعا پڑھتے، جس سے اللہ کے حکم سے مریض شفایاب ہو جاتا۔

بعض کے نزدیک یہ آپ کا معجزہ تھا، اس لیے یہ عمل آپ کے ساتھ خاص تھا کیونکہ یہ مٹی بھی مدینے کی خاص مٹی تھی اور آپ کے لعاب دہن کو بھی خاص شرف حاصل تھا۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے اس قول کو محل نظر کہا ہے۔ تھوک اور مٹی تو ظاہری اسباب ہیں جنہیں اختیار کرنے کا حکم ہے، اس میں تاثیر شفا کا پیدا ہو جانا من جانب اللہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دم مسنون ہے اور اس میں اصل تاثیر باذن ربنا کے لفظ کی ہے۔ مومن کے منہ کا لعاب اور مٹی، خواہ کسی بھی سرزمین کی ہو، اس شفا بخشی کا صرف ایک حصہ ہیں اور تجربے سے اس دم کا بے حد موثر ہونا ثابت ہے۔

اہل علم و اہل صلاح و تقویٰ کی طرف بھی دم کروانے کے لیے اور دعا کے لیے رجوع کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ تعویذ گنڈوں اور مشرکانہ طریقوں سے علاج نہ کرتے ہوں۔

بیمار کے لیے دعا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعض گھر والوں کی بیمار پرسی کرتے تو اپنا دایاں ہاتھ (مریض کے درد والے حصے پر) پھیرتے اور یہ دعا پڑھتے:

"اے اللہ! لوگوں کے پروردگار! تکلیف کو دور فرما دے۔ تو شفا عطا فرما، تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری ہی شفا شفا ہے۔ تو ایسی شفا دے جو بیماری کو نہ چھوڑے۔ (اسے بالکل ختم کر دے۔") (بخاری)

دم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ثابت (بنانی، تابعی) رحمتہ اللہ سے کہا۔

"کیا میں تم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا دم نہ کروں؟"

انہوں نے کہا: "کیوں نہیں۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ دعا پڑھی:

"اے اللہ! لوگوں کے پروردگار! تکلیف کو لے جانے والے! تو شفا عطا فرما۔ تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی شفا دینے والا نہیں۔ تو ایسی شفا عطا فرما جو بیماری کو نہ چھوڑے۔ (بخاری)

فائدہ:

مذکورہ روایات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا دم کرنا ثابت ہے، اس لیے دم کرنے کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔ تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے اسماء و صفات اگر مسنون دعاؤں کے ذریعے سے ہو یا معوذات و سورہ فاتحہ وغیرہ قرآنی سورتوں اور آیات سے ہو۔ اور اس کے ساتھ یہ عقیدہ ہو کہ یہ ظاہری اسباب بذات خود موثر نہیں، یہ اللہ کی مشیت اور تقدیر ہی سے موثر ہو سکتے ہیں۔

مریض کے لیے دعا کرنا

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے تو دعا فرمائی:

"اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما۔ اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما۔ اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما۔" (مسلم)

فائدہ:

مریض کے لیے بطور خاص اس کا نام لے کر دعائے صحت و شفا کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح تکرار کے ساتھ بار بار بارگاہ الٰہی میں آہ وزاری سے التجا و دعا کی جائے تاکہ اللہ کے ہاں شرف قبولیت پائے۔

حضرت ابو عبداللہ عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس درد کی بابت بتلایا جو وہ اپنے جسم میں محسوس کر رہے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا:

"اپنا ہاتھ جسم کے اس حصے پر رکھو جو درد کرتا ہے اور تین مرتبہ بسم اللہ اور سات مرتبہ اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر کہو۔" یعنی میں اللہ کی عزت کی پناہ اور اس کی قدرت میں آتا ہوں اس برائی سے جو میں پاتا اور جس سے ڈرتا ہوں) (مسلم)

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ انسان خود بھی مسنون دعائیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کر سکتا ہے۔ دوسروں سے ہی دم کرانا ضروری نہیں۔ بلکہ بہتر ہے کہ از خود دم کرے اور دوسروں سے دم کا مطالبہ نہ کرے تاکہ وہ ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں جانے والوں میں سے ہو جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص کسی ایسے مریض کی عیادت کرے جس کی موت کا وقت ابھی نہ آیا ہو اور اس کے پاس سات مرتبہ یہ دعا پڑھے:

"میں اللہ برتر سے، جو عرش عظیم کا مالک بھی ہے، یہ سوال کرتا ہوں کہ وہ تجھے شفاء عطا فرمائے۔" تو اللہ تعالیٰ اسے اس بیماری سے ضرور عافیت بخش دے گا۔"

(اسے ابو داود اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔ اور امام حاکم نے کہا ہے: یہ حدیث شرط بخاری پر صحیح ہے۔)

فائدہ:

صدق و اخلاص سے کی گئی دعا کی قبولیت کا بہت امکان ہوتا ہے، اس لیے پورے یقین و اذعان سے مریض کی صحت یابی کی دعا کرنی چاہیے۔ علاوہ ازیں مسنون دعاؤں میں بھی خصوصی تاثیر و برکت ہے، اس لیے اصل منقول الفاظ پڑھے جائیں۔

مریض کی دل جوئی کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دیہاتی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے تو فرماتے: لا باس، طھور ان شاء اللہ "کوئی فکر نہیں، اللہ نے چاہا تو یہ بیماری گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

طھور کے معنی ہیں: یہ بیماری تیرے نفس کو گناہوں سے پاک کر دے گی۔

مریض کے پاس بیٹھ کر اس کی دل جوئی کرنا اور اس سے حوصلہ افزا باتیں کرنا سنت ہے۔

مومن اگر بیماری میں صبر کرے تو اس کی یہ بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ اسلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا:

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا آپ بیمار ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہاں۔"

تو حضرت جبریل علیہ السلام نے ان الفاظ میں دعا فرمائی:

"اللہ کے نام سے آپ پر دم کرتا ہوں، ہر اس چیز سے جو آپ کو ایذا پہنچائے، ہر حاسد نفس اور آنکھ کے شر سے، اللہ آپ کو شفا عطا فرمائے، اللہ کے نام

سے آپ پر دم کرتا ہوں۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے اور بشری عوارض (بیماری، تکلیف وغیرہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لاحق ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان چیزوں سے صحت و سلامتی کی دعا کی گئی۔ ہمیں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ السلام کی اتباع میں یہ دعائیں پڑھنا چاہئیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے پوچھنے پر بتانا کہ میں بیمار ہوں اللہ تعالیٰ کے شکوے کے زمرے میں نہیں آتا۔

مریض کے گھر والوں سے پوچھنا

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ”حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آپ کی اس بیماری میں باہر نکلے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو لوگوں نے پوچھا:

”اے ابوالحسن! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے صبح کی؟“

حضرت علی نے جواب دیا: ”الحمد للہ! آپ نے بہتر ہونے کی حالت میں صبح کی ہے۔“
(صحیح بخاری)

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ مریض زیادہ نازک حالت میں ہو اور اس سے ملنا ممکن یا مفید نہ ہو تو اس کی بابت اس کے گھر والوں سے پوچھنا مستحب ہے۔ اسی طرح گھر والوں کے لیے ضروری ہے کہ مریض کی حالت، مسرت افزا انداز میں بیان کریں تاکہ پوچھنے والوں کے دلوں کو بھی ہمت و حوصلہ ہو۔

زندگی سے مایوس ہونے والا شخص کیا دعا پڑھے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں: ”میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف سہارا لگائے ہوئے تھے:

”اے میرے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما اور مجھے رفیق اعلیٰ سے ملا دے۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

رفیق اعلیٰ سے مراد اکثر علماء کے نزدیک ذات باری تعالیٰ ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد فرشتے، انبیاء و شہداء اور صالحین ہیں، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی: الحقنی بالصالحین (یوسف 12:101) ”مجھے نیکوں کے ساتھ ملا دے۔“ بہرحال موت کے وقت اپنا تعلق دنیا سے منقطع کر کے آخرت سے جوڑ لینا چاہیے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب مغفرت کا مطلب رفع درجات اور اضافہ حسنات ہے۔

دروازہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف فرما تھے کہ انہوں نے اپنے اوپر سے ایک آواز سنی۔ انہوں نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا۔

”یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے اور آج سے پہلے یہ کبھی نہیں کھولا گیا تھا اور اس سے ایک فرشتہ اترا ہے۔“

حضرت جبریل علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا: ”یہ فرشتہ جو زمین پر اترا ہے، آج سے پہلے کبھی نہیں اترا۔“ چنانچہ اس فرشتے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اور کہا۔

”آپ سے پہلے یہ کسی نبی کو نہیں دیے گئے: (ایک) سورۃ فاتحہ اور (دوسرا) سورۃ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان میں سے جس ایک حرف کی بھی تلاوت کریں گے (مضمون کی مناسبت سے) وہ چیز آپ کو عطا کر دی جائے گی۔“ (مسلم)

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ک۔ ناز

ستاروں سے خالی اب تو آسمان لگتا ہے
بن ماں باپ کے ہر گھر ہی سنسان لگتا ہے
جن گلیوں میں کھیل کود کر وقت گزارا ہے
ہم بن تو وہ محلہ ہی ویران لگتا ہے

جانتی ہوں کہ میرے حالات زندگی بھی ان ہی پچانوے فیصد لڑکیوں جیسے ہیں جو سکہ نہ پا سکیں لیکن پھر بھی شرکت کرنے کو دل کیا...... سو کر ڈالی۔

س: شادی کب ہوئی ؟

ج: 12 اپریل 2015ء بروز اتوار کو ہوئی۔ اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ مگر پھر بھی بہت کچھ سیکھنے کو مل گیا۔

س: شادی سے پہلے کے مشاغل و دلچسپیاں؟

ج: دلچسپیاں تو ساری رسالوں میں تھیں۔ چھوٹی بہنوں کی منت کرتی تھی کہ اپنی کسی سہیلی سے پوچھ لینا۔ فلاں کی بہن پڑھتی ہے، اس سے لا کے دے دو۔ چونکہ ہمارے گھر میں رسالے پڑھنے پر پابندی تھی اور ہے...... اس لیے بہت مشکل ہوتی تھی منگوانے میں مگر منگوا لیتے تھے۔ گرمیوں میں دوپہر کو پڑھتی تھی اور سردیوں میں دس روپے والا لائٹر منگوا کر، لحاف میں گھس کر......

س: رشتے میں مرضی شامل تھی؟

ج: ہمارے ہاں رشتے کرتے ہوئے مرضی نہیں پوچھی جاتی اور لڑکیوں سے تو بالکل بھی نہیں۔ ہمارے ہاں تو تصویر تک نہیں دکھائی جاتی، نہ لڑکی کو لڑکے کی، نہ لڑکے کو لڑکی کی اور تو اور کنواری بہنیں بھی بہنوئی کو شادی کے بعد ہی دیکھ پاتی ہیں اور بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری منگنی ساڑھے تین سال رہی، مگر اس دوران ہماری کبھی بھی بات نہیں ہوئی البتہ چھوٹی بہن کی امی نے ابو سے چھپ کر بات کروا دی تھی۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں خیالات؟

ج: بات یہ ہے کہ میری ساس بہت پہلے وفات پا چکی تھیں اور نند سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو میرے شوہر کی ساری ذمہ داری ان کی بھابھی پر تھی، نہ پڑھائی، نہ لکھائی۔ بچپن سے ہی کام پر لگا دیا تھا۔ میری جٹھانی بہت نہ سہی مگر خوب صورت ہے۔ مگر جیسے چالاک لفظ اس کے ماتھے پر لکھا ہوا تھا، اس لیے کچھ نیک خیالات نہیں تھے۔ مگر ایک سکھ کی امید باندھی تھی، جو چھ ماہ بعد پوری ہوئی، صد شکر کہ ہو گئی۔

س: شادی بخیر و خوبی ہوئی ؟

ج: میرے والدین نے میرے سسرال والوں کو بری میں کسی بھی چیز کے لیے اپنے منہ سے نہیں کہا۔ جو کچھ بھی کیا اپنی پسند سے کیا اور رسم تو بس دودھ پلائی کی، کی تھی۔ ہم دو بہنوں کی شادی اکٹھی ہوئی تھی۔ چھوٹا والا تو ہنس بھی رہا تھا اور ضرورت پڑنے پر بول بھی دیتا مگر یہ تو گھس ہی بیٹھے رہے۔ جیسے دودھ پینے کے علاوہ انہیں اور کوئی کام نہیں۔ یہ سب میں نے دیکھا نہیں ہے، میری چھوٹی بہنوں نے بتایا ہے، جنہوں نے رسم کی تھی کیونکہ اکثر دیہاتوں کی طرح ہمارے ہاں بھی دولہا دلہن کو اکٹھے نہیں بٹھایا جاتا۔

س: شادی کے لیے قربانی؟

ج: نہیں کوئی خاص قربانی تو نہیں دینی پڑی۔ بس اپنا غصہ قربان کرنا پڑا۔ میں غصے کی بہت تیز ہوں ابھی بھی۔ شادی سے پہلے میرے ہاتھ میں موجود چیز اگر کوئی مانگ لیتا تو میں دیتی نہیں تھی، پھینک دیتی تھی۔ گھر میں سب بہن بھائیوں سے بڑی ہوں تو خوب رعب تھا سب پر۔ مگر یہاں میں

خود جٹھانی کے رعب تلے آ گئی۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج: کہنا کیا تھا؟ جب وہ آئے تو میرے پاس ان کی بھابھی صاحبہ بیٹھی تھیں۔ آ کر سامنے صوفے پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ بھابھی نے سلام کرنے کی تلقین کی تو "بیبا" بن کر سلام کر دیا اور بس......

س: شادی کے بعد تبدیلیاں؟

ج: تبدیلیاں......؟ تبدیلیوں کا ڈھیر کہنا چاہیے۔ میری جٹھانی نے میرے کمرے کی سیٹنگ اپنی مرضی سے کی اور ڈریسنگ ٹیبل کو عین دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ اس طرح سے کہ ہم بیڈ پر بیٹھے ہوتے یا صوفے پر، سامنے شیشے میں باہر بیٹھے سب ان کو نظر آ رہا ہوتا یا تو ہم اپنے کمرے میں کھانا کھاتے ہی نہ تھے، اگر کبھی میں لے بھی جاتی تو ساتھ بھابھی ہوتیں یا ان کے بچے۔

جب تک میرے شوہر ان کے تسلّط میں رہے تو میرے گھر والوں کو انہیں دیکھ کر مایوسی ہی ہوئی کہ میرے گھر جا کر نہ ہنستے تھے، نہ بولتے تھے۔ بس ایک طرف جا کر بیٹھ جاتے۔ میری بہنیں بہت کوشش کرتی تھیں، وہ بھی ان کے ساتھ ہنسیں، بولیں، مذاق کریں۔ مگر چھ ماہ تک تو بھابھی کا دیا خول ہی خود پر چڑھائے رکھا۔ مگر اب ماشاء اللہ سے جب سے الگ ہوئی ہوں، میرے گھر والے ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ گھر کا بڑا داماد ہونے کی حیثیت سے ہر صلاح و مشورے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کی اپنی تو چونکہ بہن ہے نہیں تو یہ میری بہنوں کو نہ صرف بہنیں کہتے ہیں، بلکہ مانتے بھی ہیں۔

س: کتنے عرصہ بعد کام سنبھالا؟

ج: شادی سے پہلے جٹھانی کہتی تھیں کہ میں تو سوئی ہوئی کو جگایا بھی نہیں کروں گی مگر کام پر مکلاوے سے جانے کے بعد ہی لگا دیا۔ یعنی شادی کے پانچویں دن باقاعدہ کام کرنے لگی تھی میں۔

س: میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟

ج: میرے خیال میں ہر ہاتھ کے کھانے میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح میرے میکے اور سسرال کے کھانوں میں بھی فرق تھا۔ میکے میں کم مرچیں استعمال ہوتی تھیں جب کہ جٹھانی تیز مرچ کھانے کی شوقین تھیں (ان مرچوں کا سارا اثر زبان پر آیا تھا)۔ بھنڈی بھونے بغیر پکاتی تھیں، یوں ہی لیس دار۔ چپڑی چپڑی سی۔ کریلوں کی کڑواہٹ ہی نہ جاتی اور گوشت کے سالن میں سے ایک آدھ بوٹی سرخ ضرور نکلتی تھی۔

س: سسرال میں وہ مقام ملا جو آپ کا حق تھا؟

ج: بالکل بھی نہیں۔ میرے شوہر اپنی بھابھی کو ماں کا درجہ دیتے تھے اور میں نے بھی ساس سمجھ کر اس کی خدمت کی۔ بخار ہو گیا تو سر دبا دیتی۔

اس کا شوہر کام سے گھر آتا تو کھانا میں دیتی۔

اس کے بچے نہانے کے لیے جاتے تو کپڑے پریس کر کے غسل خانے میں رکھ کر آتی۔ تولیہ، شیمپو اور صابن خود رکھ کر آتی۔ اس کے آنے سے پہلے تیل کنگھا تیار رکھتی۔

اس کے بچے سارا دن میرے کمرے میں اودھم مچاتے، شور کرتے۔ اگر کبھی یہ بھی کہہ دیا کہ "شور نہ کرو" تو بچے تو چپ ہو جاتے مگر تھوڑی دیر بعد جو شور بچوں کی ماں مچاتی وہ کسی طور بند نہ ہوتا۔

دن میں کی گئی میری عام سی بات کو اپنی مرضی کے لفظوں اور معنوں میں ڈھال کر شام کو میرے ہی سامنے میرے شوہر کے کانوں میں انڈیل دیتی اور میں حق دق رہ جاتی کہ یہ بات تو میں نے ہی کی تھی، مگر ایسے تو نہیں کہا۔ نفی صرف دل ہی دل میں کرتی تھی، اس کے سامنے زبان کھولنے سے ڈرتی تھی کیونکہ ان سب دیورانیوں جٹھانیوں کو چھوٹی بات پر واویلا کرنا اور پورے محلے کو اکٹھا کرنے کی

عادت تھی۔

میں چونکہ ایک امام مسجد کی بیٹی ہوں تو میں پردہ کرتی ہوں اور ایسی باتوں کو ہم لوگ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ کہاوت ہے "شرم والا اپنی شرم کو روئے، بے شرم سمجھے مجھ سے ڈر گیا"۔

میری جٹھانی تعویذ گنڈوں پر کفر کی حد تک یقین رکھتی ہیں۔ میں نماز کے بعد معمول کے مطابق اپنے وظائف کرتی (تسبیحات، درود اور استغفار) تو وہ سمجھتی میں ٹونا کرتی ہوں۔ ایک بار فریج سے مٹی نکل آئی ذرا سی، نام ہی میرا لگا دیا کہ یہ مولویوں کی بیٹی ہے، تعویذ کروا دیا ہوگا۔

صبح شام صحن میں لگے ٹاہلی کے درخت کے نیچے چارپائی بچھاتی۔ اوپر سفید چادر اور تکیہ رکھتی پھر روٹی پانی رکھ کر کہتی "بابا جی! روٹی کھالو" اور کچھ ہی دیر بعد وہ روٹی چڑیا کوے کھا رہے ہوتے۔ مجھے بڑی ہنسی آتی تھی ان کی باتوں پر۔

س: سسرال سے وابستہ توقعات؟

ج: ایک بھی پوری نہیں ہوئی۔ ایک سکون چاہیے تھا، وہ بھی نہ ملا۔ صبح و شام کھانے کے ساتھ پانی پینے کی نوبت ہی نہ آتی، آنسو ہی کافی تھے۔ امی کہتی تھیں کہ تمہارا تو رونا بھی اوپر ہی پڑا رہتا ہے، مگر یہاں تو آنسو بھی اندر ہی کہیں مرکھپ جاتے۔

بقول میری جٹھانی "تمہارے شوہر کی اتنی کمائی نہیں ہے جتنی میرے شوہر کی۔"

جب تک ساتھ رہے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ الگ ہونے کے بعد قرضہ تھا لاکھوں کا، وہ بھی اتارا۔ گھر کی مرمت بھی کروائی۔ فریج اور موٹر سائیکل بھی لے لیا۔ سولر سسٹم بھی کروالیا۔

س: پہلے بچے کی پیدائش؟

ج: پہلی الحمدللہ بیٹی ہوئی ہے۔ ابھی دس ماہ کی ہے۔ میں گھر میں اکیلی ہوتی تھی تو اس لیے ڈیلیوری کے لیے امی کے پاس آ گئی۔ اللہ کا شکر ہے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔

س: سسرال کے ماحول میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش؟

ج: میرے سسرال میں سب ان پڑھ تھے۔ میں نے بھی بس پرائمری ہی کیا ہے لیکن علم نہ ہو تھوڑا بہت شعور تو ہو۔

میرے جیٹھ گرمیوں کی شام میں عصر کے بعد ٹاہلی کے نیچے بیٹھ جاتے۔ گھٹنوں تک پائنچے چڑھا لیتے اور قمیص اتار کر بنیان بغل میں اکٹھی کر لیتے۔ مجھے بے انتہا شرم آتی۔ اگر میں کچھ کہہ دیتی تو پڑھی لکھی کا طعنہ ملتا (اندھوں میں کانا راجا)۔ کوشش تو کی مگر بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ اب تو الگ ہوں چونکہ الگ بھی جھگڑوں جھمیلوں کے بعد ہوئی تھی سو آنا جانا ابھی تک بند ہے۔

س: جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟

ج: اگر تھوڑی بہت چپقلش کے بعد بھی سب ایک دوسرے کو سمجھنے والے ہوں۔ خیال رکھنے والے ہوں تو اتفاق جیسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اگر منہ میں شکر اور دلوں میں کدورت و بغض ہو تو علیحدگی ہی بھلی۔

میں پانچ جماعتیں پاس ہوں، جانتی ہوں کہ بہت کٹنگ کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ املا میں بھی غلطی ہو لیکن پھر بھی اس سلسلے میں حاضر ہونے کا دل کیا تھا۔ اب سب کچھ آپ سب کے ساتھ شیئر کر کے دماغ ہلکا پھلکا سا محسوس ہو رہا ہے کیونکہ میں نے بھی اپنے میکے میں بھی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔

آپ سب خدمت بھی کریں، عزت بھی کریں۔ مگر جہاں حقوق غصب اور عزتِ نفس مجروح ہو، وہاں لحاظ بالائے طاق رکھ دیں۔

اللہ پاک کل جہاں کی بچیوں کے نصیب اچھے کرے، آمین۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید



ماریہ واسطی

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"نیک پروین اور دیگر ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔ ماشاء اللہ پرفیکٹ نظر آرہی ہیں۔ نیگیٹو رول زیادہ نہیں کرنے لگیں آپ؟"

"شکریہ...... نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں نیگیٹو پازیٹو پر اتنا دھیان نہیں دیتی...... بلکہ یہ دیکھتی ہوں کہ کردار کیا ہے...... کتنا اہم ہے۔ کتنا پاور فل ہے۔"

"ماریہ جی...... یوں تو آپ کو سب ہی جانتے ہیں لیکن پھر بھی آج کے لوگ آپ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں؟"

"جی ضرور...... میں چودہ اگست کے دن تنزانیہ کے دارالحکومت دارلسلام میں پیدا ہوئی۔ اور میری فیملی خاص طور پر میری خالہ اس فیلڈ سے وابستہ رہیں۔ طاہرہ واسطی کو کون نہیں جانتا۔ وہ میری خالہ تھیں جبکہ میری والدہ نجمہ واسطی بھی اسی فیلڈ میں رہیں۔ مگر انہوں نے اتنا کام نہیں کیا جتنا کہ طاہرہ واسطی صاحبہ نے کیا۔"

"چونکہ بچپن سے ہی اس فیلڈ کو دیکھ رہی تھیں۔ تو آپ کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ اس فیلڈ میں آؤں؟"

"جی...... بالکل...... میں تو بچپن سے ہی اس فیلڈ کی دلدادہ تھی۔ مگر میرے والدین مجھے ڈاکٹر بنانے کے خواہش مند تھے یا پھر بھی میرا دل چاہتا تھا کہ میں بزنس وومن بنوں۔ مگر دونوں ہی خواب پورے نہ ہوسکے۔ ڈاکٹر بننے کا خواب تو والدین کا تھا...... خیر...... اللہ جہاں بہتر سمجھتا ہے بندے کو وہیں ایڈجسٹ کردیتا ہے...... چونکہ اداکاری کے جراثیم ورثے میں ملے تو زمانہ طالب علمی میں بھی ڈراموں وغیرہ میں حصہ لیتی رہتی تھی۔"

"تقریباً بیس سال ہوگئے آپ کو اس فیلڈ میں۔ اپنی مقبولیت کو کس طرح برقرار رکھ رہی ہیں اور پہلا ڈرامہ کون سا تھا؟"

"اپنی مقبولیت کو تو برقرار رکھنے کے لیے خواہ میں ہوں یا کوئی بھی، اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد اور بھروسا ہونا چاہیے۔ محنت اور لگن ہو۔ کام کے ساتھ ایمان داری ہو۔ پھر آپ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اور جہاں تک پہلے ڈرامہ کا نام پوچھا، اس کا نام "سارہ اور عمارہ" تھا۔"

"انتخاب کیسے ہوا تھا؟ خالہ یا والدہ کی وجہ سے؟"

"تھا تو کچھ ایسا ہی۔ کیونکہ میں اپنی والدہ کے

ساتھ اکثر اسٹوڈیو اور سیٹ پر جایا کرتی تھی۔ تو وہاں سب مجھے جانتے تھے۔ ایک دن معروف ڈائریکٹر پروڈیوسر بختیار احمد نے اپنے ڈرامے کے لیے آفر دے دی...... میں نے لیس کر دیا اور یوں ''سارہ اور عمارہ'' میرا پہلا ڈرامہ تھا۔ اور کافی پسند کیا گیا تھا۔ مگر مجھے جس ڈرامے کے بعد لگاتار آفرز آنی شروع ہوئیں۔ وہ ''بانو قدسیہ'' کا لکھا ہوا ڈرامہ ''کلو'' تھا۔ بس یوں سمجھیں کہ پھر میں بہت زیادہ معروف رہنے لگی۔''

''فلم ''رام چند پاکستانی'' میں بھی آپ نے کام کیا۔ کچھ یاد ہے کہ کتنی فلمیں اور کتنے ڈرامے کر چکی ہیں آپ؟''

''صحیح طرح تو یاد نہیں لیکن میں نے کافی ڈراموں میں کام کیا ہے۔ اب تو تعداد بھی یاد نہیں ہے۔ مگر متعدد ڈرامہ سیریلز میں ٹیلی فلمز میں اور سنگل ڈراموں میں کام کر چکی ہوں۔ اور شاید قارئین کو یاد نہ ہو۔ میں نے ایک پشتو فلم میں بھی کام کیا ہے جس کا نام ''یارانہ'' تھا۔

''آپ کا پروڈکشن ہاؤس کیسا چل رہا ہے؟''

''الحمد للہ...... بہت خوب چل رہا ہے۔''

''چلیں جی بہت شکریہ بات کرنے کا۔ ان شاء اللہ پھر بات ہوگی۔''

ان شاء اللہ۔''

☆☆☆

عائزہ خان

''کیا حال ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''بیٹی کیسی ہے؟''

''جی الحمد للہ! وہ بھی ٹھیک ہے۔''

''آج کل آپ اور دانش اسکرین پر چھائے ہوئے ہیں۔ اچھا لگ رہا ہوگا۔''

''جی بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں تو خیر کچھ گیپ کے بعد آئی ہوں۔ جبکہ دانش تو مسلسل کام

کر رہے ہیں۔ میرے گیپ کے دوران انہوں نے فلم بھی کی۔ وہ تو بڑی اسکرین پر ہی مصروف رہے۔"

"لوگ سمجھ رہے تھے کہ بس اب عائزہ ایک روایتی بیوی بن گئی ہے۔ ماں بھی بن گئی ہے تو شاید انڈسٹری کو خیر باد کہہ دے گی؟"

"نہیں جی......انڈسٹری کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ ایک دفعہ اسکرین پر آجاؤ تو پھر اتنا آسان کہاں ہوتا ہے کہ بندہ انڈسٹری کو چھوڑ دے۔ سو بیٹی تھوڑی بڑی ہوئی تو پھر سے ٹی وی جوائن کرلیا۔ اور میرے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔

"آج کل آپ کا سیریل "کوئی چاند رکھ" آن ایر ہے، اس میں آپ ڈاکٹر دکھائی گئی ہیں۔ عام لائف میں کیا بننا چاہتی تھیں؟"

"میں تو بی اے کر رہی تھی کہ ایک کمپنی نے ماڈلنگ کی آفر کردی جو کہ میں نے قبول کرلی۔ یہ ایک بیوٹی کونٹیسٹ تھا۔ بس اس کے بعد آفرز آنا شروع ہوگئیں۔ تو پڑھائی ایک طرف ہی رہ گئی۔ شوبز نے بہت مصروف کردیا۔ مجھے۔"

"خواہش تھی شوبز میں آنے کی؟"

"نہیں ایسا کچھ ارادہ نہیں تھا۔ بس میں تو اتفاقیہ آگئی اور پھر اس فیلڈ میں آکر میں نے بہت کچھ سیکھا۔ جب شوبز میں نہیں تھی تو مجھے میری دوستیں اور دیگر لوگ کہتے تھے کہ تم اس فیلڈ کے لیے فٹ ہو۔ تو بس اللہ کا کرم ہوگیا۔ سولہ سال کی عمر میں اس فیلڈ میں آئی اور اب 9 سال ہوگئے ہیں اس فیلڈ میں آئے ہوئے۔ ابتدا میں میری امی میرے ساتھ آیا کرتی تھیں پھر میں خود آنے لگی۔"

"جن لوگوں کو آپ ڈراموں میں دیکھا کرتی تھیں۔ پھر ان کے ساتھ کام کرنا کیسا لگا؟ ڈرتی تھیں یا جھجکتی تھیں؟"

"ڈرتی تو نہیں تھی...... بہت اچھا لگتا تھا ان کے ساتھ کام کرنا......بس جھجک ضرور تھی کہ پتہ نہیں میں صحیح کام کرسکوں گی یا نہیں۔ مگر جب آہستہ آہستہ سب کے ساتھ دوستی ہوگئی تو مزہ آنے لگا کام میں۔"

"کافی ڈرامے کیے، بہت اچھے کردار بھی، مشکل کہاں ہوئی؟"

"مشکل صرف "می رقصم" کے کردار میں ہوئی۔ کیونکہ یہ کردار ایسا تھا جو مشکل بھی تھا اور اس میں، میں نے میک اپ بھی نہیں کیا تھا۔ اگر اسے چیلنجنگ رول کہوں تو غلط نہ ہوگا۔"

"فیلڈ میں کامیابی کے لیے خوبصورتی زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا ٹیلنٹ؟ یقیناً آپ کا جواب ٹیلنٹ ہوگا۔ مگر میرے نزدیک ایسا نہیں ہے؟"

"بے شک پہلے خوبصورتی پھر ٹیلنٹ اور ٹیلنٹ والا ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ ہمیشہ "ان" رہتا ہے جبکہ خوبصورتی عارضی ہوتی ہے اور اگر ٹیلنٹ کے ساتھ خوب صورتی بھی ہو تو کیا کہنے۔ اور ہماری بہت سی فنکارائیں خوب صورت بھی ہیں اور باصلاحیت بھی اور فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے بہت محنت اور لگن سے کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"عائزہ! آپ خاتون خانہ بھی ہیں۔ بیوی بھی ہیں اور ماں بھی...... پھر ایک نامور فنکارہ......تو فیملی لائف کتنی متاثر ہوتی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ کرتی ہوں۔ اور پھر میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں وہ مجھے بہت سپورٹ کرتے ہیں تو اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ مینج ہوجاتا ہے۔"



اے بی لاشاری سے مُلاقات

شاہین رشید



ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوجوان کمائی کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ کس طرح کمانا ہے کتنا کمانا ہے۔ مستقبل میں کیا کرنا ہے لیکن کچھ نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں فلاحی کاموں سے بہت دلچسپی ہوتی ہے اور وہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور لوگوں سے محبت اللہ ہی ان کے دل میں ڈالتا ہے "اے بی لاشاری۔" بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں۔ جو وکیل بھی ہیں۔ ایڈووکیٹ بھی ہیں۔ سوشیالوجسٹ بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان لوگوں کے لیے بھی بہت کام کرتے ہیں جو کسی حادثے میں اپنے ہاتھ پاؤں سے محروم ہو جاتے ہیں یعنی Artificial Limbs (مصنوعی اعضا) بھی لگاتے ہیں۔ ڈاکٹرز اور انجینئرز کے تعاون سے اور مخیّر حضرات کے تعاون سے اور مزید کیا کرتے ہیں آپ کو ان کی گفتگو سے پتا چلے گا۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ جو بھی فلاحی کام کر رہے ہیں اس کے بارے میں تو آپ سے گفتگو ہو گی لیکن جو آپ مصنوعی اعضا لگواتے ہیں ان کے بارے میں پہلے بتائیے۔ تاکہ لوگوں کا بھلا ہو؟"

"بالکل جی...... ہم تو کام ہی لوگوں کی بھلائی کے لیے کرتے ہیں۔ مصنوعی بازو ٹائٹینیم کی، وہ اٹلی سے درآمد کرتے ہیں اور ہمارا ایک سینٹر ہے۔" شاہ ولی اللہ وہاں ہم لگاتے ہیں اور اس میں دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ ایک ڈاکٹرز کی ٹیم اور ایک انجینئرز کی ٹیم، جو اس کو تیار کرتے ہیں اور انجینئرز ہیں اور جو اس کو فٹ کرتے ہیں وہ ڈاکٹرز ہوتے ہیں۔ ہماری ڈاکٹرز کی ٹیم "آغا خان اسپتال" سے آتی ہے اور انجینئرز "این ای ڈی یونیورسٹی" کے کوالیفائیڈ ہوتے ہیں اور خاص طور پر جب ہاتھ لگانے ہوتے ہیں تو این ای ڈی یونیورسٹی کے ہی کوالیفائڈ لوگوں کو بلاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں سنسر لگے ہوتے ہیں ۔ ریموٹ لگا ہوا ہوتا ہے اور موٹر لگی ہوئی ہوتی ہے۔

"ایک بچے بچی کو میڈیا نے بھی بہت ہائی لائٹ کیا کہ "بجلی کے تار گرنے سے وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گیا تھا تو اس کے لیے کچھ کیا آپ نے؟"

"جی...... ہم اس کے لیے بھی کام کر سکتے ہیں مگر اس وقت جب اس کا "زخم" مکمل طور پر صحیح ہو جائے، زخم ٹھیک ہونے کے بعد پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ اس کے ہاتھ میں جو سینسرز ہیں وہ کام کر رہے ہیں یا نہیں، یعنی جو سینسرز ــــــــــ ہیں وہ کام

کررہی ہیں یا نہیں۔ تو یہ لڑکا ہماری نظر میں ہے اور ہم اس کا علاج کریں گے۔ جب اس کا زخم بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"حکومت اس سلسلے میں کیا تعاون کرتی ہے آپ سے؟"

"یہ وضاحت میں ضرور کروں گا کہ حکومت سے، یا کسی بھی ادارے سے کسی بھی قسم کی امداد ہم نے کبھی نہیں لی اور یہ مصنوعی اعضا اٹلی کے ایک ادارے نے بھیجی تھیں ہم کسی سے کوئی امداد نہیں لیتے بلکہ ہمارے جو ممبرز ہیں وہ آپس میں اخراجات بانٹ لیتے ہیں...... اور میری اپنی فیلڈ کی جو فیس ہے اس کا پچیس فیصد میں نے ہر فیس کا شیئر کیا ہوا ہے "فرینڈز آر ہیومن رائٹس" کے لیے اور اس میں جو بھی پیسہ آتا ہے اس کو امانت سمجھ کر خرچ کرتے ہیں۔ اور کسی کی بھی مدد ہم پیسے کی صورت میں نہیں کرتے بلکہ سامان کی شکل میں کرتے ہیں۔ اور مخیر حضرات جو مجھے جانتے ہیں اور وہ اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے کچھ ڈونیٹ کرنا ہے تو ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جیسے کتابیں، جیسے کسی کا علاج کروانا ہو تو ہم ان کو بتا دیتے ہیں گزشتہ دنوں سندھ میڈیکل کی پوزیشن ہولڈر کا علاج ہم نے خود کروایا تھا اور کسی سے کوئی امداد نہیں لی بلکہ میں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر علاج کروایا اور میڈیسن دیں اور جناح اسپتال میں ہم نے وہیل چیئر اور بیساکھیاں وغیرہ بھی لے کر دیں اور جو بھی ضرورت ہوتی ہے سامان کی صورت میں ہم وہ پوری کرتے ہیں۔"

"لاشاری صاحب! یہ بتائیں کہ مصنوعی بازو کو بنوانے میں اور پھر لگوانے میں خرچ کتنا ہوتا ہے اور کتنا عرصہ پہلے آرڈر دینا پڑتا ہے۔"

"اس میں سات، ساڑھے سات لاکھ کا خرچا آتا ہے۔ کیونکہ اس میں ٹائٹینیم جو کہ ایک خاص قسم کی دھات ہوتی ہے وہ لگی ہے اور ڈاکٹرز وغیرہ کی فیس ملا کر ایک لاکھ ہم دیتے ہیں یعنی ایک لاکھ کا خرچہ ہوتا ہے جبکہ اعضا فری آف کاسٹ ہوتے ہیں جو "جرمنی" کا ایک ہمدرد جو کہ خود بھی معذور ہیں، ہمیں بھیجتا ہے۔ تو ہمیں صرف لاکھ روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں۔"

"ٹائم کتنا لگتا ہے؟"

"مریض کو ہم تین بار بلاتے ہیں۔ پہلی بار اس وقت جب ہم مریض کو بلا کر اس کی ٹانگ یا ہاتھ کا ناپ لیتے ہیں۔ دوسری بار اس وقت جب ہمیں چیک کرنا ہوتا ہے اور تیسری بار اس وقت جب ہم اسے فٹ کرتے ہیں اور اسے چلا کر روانہ کر دیتے ہیں۔"

"اس سلسلے میں اگر کسی نے آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کس طرح کر سکتے ہیں؟"

"فیس بک پر ایک پیج ہے اے بی لاشاری کے نام سے میرا۔ لاٹھیکنگ پیج بھی ہے لاشاری کے نام سے۔ اور اس کے علاوہ ٹوئٹر پر بھی لوگ مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور واٹس اپ نمبر بھی 03322175550 ہے۔ فیس بک پر میرا ایڈریس بھی لکھا ہوا ہے۔ تو جو لوگ رابطے میں آجاتے ہیں ہم ان کی ہر طرح سے مدد کر دیتے ہیں۔"

"قدرتی اعضا کی طرح تو یہ مصنوعی اعضا کام نہیں کرتے ہوں گے۔ تو کیا وہ اپنی ضرورتیں پوری کر لیتے ہیں۔"

"اس میں آدمی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ مصنوعی ہاتھ یا بازو ہے۔ ٹانگ کے گھٹنے میں ایسا اسپرنگ لگاتے ہیں کہ مریض آسانی سے اٹھ بیٹھ سکتا ہے اور گاڑی ڈرائیو کر سکتا ہے۔ عام دیکھنے والا بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ آدمی ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ ہاں البتہ ہاتھ کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ وزن نہیں اٹھا سکتا اس کے علاوہ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔" "ہاتھ" کے اوپر ہم اور بھی کام کررہے ہیں

ان شاء اللہ وہ بھی بہتر سے بہترین ہو جائے گا۔
”کیا پولیو کے مریض بھی ان مصنوعی اعضا سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟“
”پولیو میں ٹانگ سکڑ جاتی ہے مگر ٹانگ موجود ہوتی ہے اور ٹانگ سکڑنے کی وجہ سے پوری باڈی متاثر ہوتی ہے۔ تو ہمارے پاس تو وہ لوگ آتے ہیں جو کسی حادثے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں گنوا دیتے ہیں یا وہ لوگ آتے ہیں جن کی شوگر کی وجہ سے ٹانگ کاٹ دی جاتی ہے۔ کٹ جانے والے اعضا کو باڈی کے ساتھ ورک کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔“
”یہ گفتگو تو بہت کارآمد رہی، اب پہلے آپ اپنے بارے میں بتایئے اور اپنے دیگر کاموں کے بارے میں بھی بتایئے؟“
”میں جیکب آباد کے دور دراز علاقے (جو بلوچستان کے قریب سرحد ہے) چھوک لاشار جو کہ بعد میں ”چوک لاشار“ کہلانے لگا، وہاں سے میرا تعلق ہے۔ اور 1993 میں جب میں نے ایس ایم لاء کالج میں داخلہ لیا تھا تب سے کراچی میں ہوں۔ میٹرک میں نے جیکب آباد سے ہی کیا۔ میرے والد ایگری کلچر سے تعلق رکھتے تھے، کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا...... اور پڑھائی کے معاملے میں انہوں نے مجھے بہت شعور دیا۔ میں گاؤں میں رہتا تھا مگر پھر بھی وہ اخبار جہاں ”گاؤں“ میں منگواتے تھے کہ میں پڑھوں...... اور ہمارے گاؤں میں بجلی نہیں تھی مگر جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہمارے گھر میں بجلی آچکی تھی اور یہ اسی کی دہائی تھی۔ انہوں نے ٹی وی بھی میسر کیا اور اس وجہ سے جو مولوی صاحب مجھے پڑھانے آتے تھے ان کا موڈ بہت خراب ہو گیا کہ ان کے گھر ٹی وی کیوں آیا ہے۔ تو بچپن میں ٹی وی دیکھنا، کھیلنا کودنا یا بڑوں کی کچہری میں بیٹھا رہتا تھا اور ٹی وی پر جب نشریات کا آغاز ہوتا تھا تو ”فہم القرآن“ سے ہوتا تھا اور ”فرمانِ الٰہی“ پر اختتام ہوتا تھا تو میں اپنا ہوم ورک کر کے ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتا تھا۔ اس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میری اردو بھی اچھی ہوتی گئی اور سمجھ میں بھی آنے لگی۔ اس طرح سندھی کے ساتھ ساتھ اردو بھی آگئی مجھے۔“
”والد صاحب نے بچپن میں آپ کو اتنی سہولیات دیں تو وہ کیا چاہتے تھے کہ آپ پڑھ لکھ کر کیا بنیں؟“
”میرے والد صاحب تو مجھے انجینئر بنانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں ہر حال میں انجینئر بنوں۔ لیکن میری خواہش تھی کہ میں ایک نامور وکیل بنوں اور اس خواہش نے اس طرح جنم لیا کہ میرے والد ”جرگا“ میں ”برادری میں“ کچہری میں لوگوں کے مسائل سن کر اور اختلافات سن کر ان کے درمیان تصفیہ، صلح وصفائی کرواتے تھے۔ اور میرے والد صاحب جو دلائل دیتے تھے ان کو سن کر اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ جو حاجی الٰہی بخش لاشاری ہے یہ تو وکیل کی طرح سوال جواب کرتے ہیں۔ تو میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ یہ وکیل کیا ہوتا ہے؟ لوگ بار بار میرے والد کو وکیل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ تو میں بہت سوچتا تھا اس بارے میں لیکن اس دوران میں نے انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا ”ٹنڈو جام یونیورسٹی“ میں لیکن میں نے اس تعلیم کو جاری نہیں رکھا اور وکالت کو ہی ترجیح دی۔“
”وکالت میں کس سے متاثر تھے؟“
”متاثر تو میں اپنے والد صاحب سے ہو کر اس شعبے میں آیا اور لیکن جب میں اس پروفیشن میں آیا تو مجھے بہت سی اعلیٰ شخصیات سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ اور میں خاص طور پر ”عاصمہ جہانگیر“ صاحبہ سے بہت متاثر ہوا، ان کی شخصیت سحر انگیز تھی اور ان کے ساتھ اکثر میٹنگز ہوتی تھیں۔
2011ء میں جب لطیف کھوسہ صاحب گورنر تھے تو انہوں نے ایک ڈنر کا اہتمام کیا تھا جس میں ہم سب وکلاء بھی شریک ہوئے تھے۔ تو وہاں عاصمہ جہانگیر صاحبہ کے ساتھ بیٹھنے کا زیادہ موقع ملا تو میں

نے ان سے پوچھا کہ اللہ نے آپ کو اتنی زیادہ عزت وشہرت دی ہے اس کے باوجود آپ اتنی ہارڈ ورکر ہیں اور لوگوں کے لیے اتنا سوچتی ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے تو انہوں نے سمجھایا کہ کس طرح لوگوں کے حقوق کو تلف کیا جاتا ہے اور انہیں انصاف نہیں ملتا تو میں ان کے لیے کام کرتی ہوں۔"

"پھر آپ نے ان سے متاثر ہو کر اپنی این جی او بنائی؟"

"جی بالکل۔ ہم نے فرینڈز آر ہیومن رائٹس رسپانسبلیٹی آف پاکستان" بنائی اور سوچا کہ لوگوں کے لیے کام کریں تو ہماری "اے بی لاشاری لاء ایسوسی ایٹ" ہے۔ اس کے ذریعے جتنے بھی غریب اور خواتین کے مسائل ہوں یا بچوں کا مسئلہ ہو تو ہم نے بلا معاوضہ کیسز لینا شروع کیے اور ان کے مسائل کو بھرپور طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی اور حل کیا بھی اور کر بھی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے پبلک لائبریریز تحصیل ہیڈ کوارٹرز میں قائم کیں۔ ابھی تک ہم اٹھارہ لائبریریاں قائم کر چکے ہیں۔ جو کہ مختلف شہروں کے تحصیل ہیڈ کوارٹرز میں ایک ایک ہے۔ جیسے "دھمبر" ڈسٹرکٹ میں ایک "علی اکبر" لائبریری ہے اس کو ہم نے ______ بڑھانے کا کام شروع کیا۔ اسکولوں میں بھی لائبریریز قائم کی ہیں اور ہم نے اپنے گاؤں میں بھی شہید عبدالمجید لاشاری لائبریری قائم کی ہے اور مستقبل میں ان لائبریریوں کو کمپیوٹرائز کرنے کی بھی کوشش جاری ہے۔"

"فلاحی کاموں سے فارغ ہو کر کیا مشاغل اپناتے ہیں؟"

"میرے مشاغل میں شاعری بھی ہے۔ سندھی میں میری شاعری کی ایک کتاب "ترچھا تیر" کے نام سے مارکیٹ میں آگئی ہے اور دوسری "عشق نہ ہے آسان" ابھی زیر تکمیل ہے اور اس میں "سچل سرمست" کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، اس کے

علاوہ 1998ء سے 2001ء تک مستقل طور پر مضامین لکھے ہیں اخبارات میں۔ سندھی کے نامور روزنامہ "جاگو" اس کا میں مستقل کالم نگار تھا۔ اور ان کالموں کو بھی کتابی شکل دی جا رہی ہے۔ لکھنے پڑھنے کا ہمیشہ سے ہی بہت شوقین رہا ہوں اور فلاحی کاموں کی طرف اپنے والد اور عاصمہ جہانگیر سے متاثر ہو کر آیا ہوں۔"

"روٹری کلب کے تحت کیا کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

روٹری کلب ڈیفنس کا میں "صدر" ہوں۔ گزشتہ سال منتخب ہوا تھا اور ابھی بھی یہ عہدہ میرے پاس ہی ہے تو اس روٹری کلب ڈیفنس کے پلیٹ فارم سے ہم روٹری انٹرنیشنل پروگرام جیسے "پولیو" اور ایجوکیشن کو برقرار رکھا ہوا ہے اور اس کلب کے ذریعے بہت سے ایسے کام ہیں جو ہم کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی امداد اس انداز میں کرتے ہیں کہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ مصنوعی اعضا کے پروگرام کے بارے میں تو میں آپ کو تفصیل سے بتا ہی چکا ہوں۔ اس کے علاوہ ہمارے اسکولز ہیں۔ لرننگ سینٹرز ہیں۔ جو "سی کراچی" کے نام سے ہم نے قائم کیے ہوئے ہیں۔ روٹری کلب اور اے بی پلیٹ فارم — سے ہم نے "نعمت کیٹرنگ" سینٹر قائم کیا ہوا ہے اور "تھر" کے لوگوں کے لے بھی ہم بڑے پیمانے پر کام شروع کرنے کا ارادہ رکھتے



ہیں۔ خاص طور پر "تھر" کے بچوں کی خوراک پر۔

"اور کچھ کہنا چاہیں گے آپ نوجوان نسل سے؟"

"بالکل نوجوانوں سے بھی اور دیگر لوگوں سے بھی اور ان نوجوانوں کو بھی جو چھوٹے شہروں اور گاؤں سے آتے ہیں۔ مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے۔ پہلے میں خواتین سے مخاطب ہو کے کہوں گا کہ جب انہیں مردوں کی طرف سے "ہراس منٹ" کا پرابلم یا ایشو ہو تو اپنی زبان کو بند نہ رکھیں اور نہ ہی ڈریں اور نہ ہی چھپائیں۔ کیونکہ یہی طریقہ ہوتا ہے اپنی عزت کو برقرار رکھنے کا۔

اور دوسری بات یہ کہ میں رولر ایریا سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک گاؤں سے میرا تعلق ہے تو گاؤں سے کسی لڑکی اور لڑکے کو یہ چانس ملتا ہے کہ وہ شہر میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں تو وہ ایک طرح سے اپنے گاؤں کے لوگوں کے لیے "رول ماڈل" ہوتے ہیں (اپنے ماں باپ کے لیے تو ہوتے ہی ہیں) اس لیے ان کو اپنے شعبے میں زیادہ سے زیادہ محنت کرنی چاہیے اور کھلے لفظوں میں یہ بات کہوں گا کہ "اپنے دل پر کنٹرول رکھیں" اور دماغ سے کام کریں۔ کیونکہ ان کے ساتھ کوئی ایشو ہو جاتا ہے تو پورے گاؤں کے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور پھر کوئی اپنے بچوں کو شہر نہیں بھیجتا کہ شہر جا کر بچے خراب نہ ہو جائیں۔

میری درخواست ہے کہ بچے جب شہر آئیں تو دل لگا کر پڑھائی کریں اور جو ٹارگٹ حاصل کرنے آئے ہیں وہ کریں...... جیسا کہ میں نے کیا۔ اب جیکب آباد میں وکیل تو ہوں گے مگر میں اپنے گاؤں کی پوری سوسائٹی اور اپنی برادری میں واحد بندہ ہوں جو سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ میں ایل ایل ایم اور ماسٹرز آف کرمنالوجسٹ اینڈ سوشیالوجسٹ ہوں اور اب میری کوشش ہے کہ لاء میں پی ایچ ڈی کرلوں۔ تو بس نوجوانوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے تعلیمی عزم کو لے کر جب شہر آئیں تو پھر اسی پر توجہ دیں۔

☆

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

کوثر خالد...... جڑانوالہ

بارہا سوچا شعاع کے ساتھ ساتھ چلوں۔ لوگوں نے بھی چاہا کہ اپنا تعارف بھیجوں مگر یہ ساتھ ابھی صرف چھ سال کا ہے۔ کبھی خیال نہیں آیا تھا چھ سال میں اتنی عزت ملے گی کہ گمنام خط اور ڈھیروں فون آئیں گے۔

بات کچھ یوں ہے کہ ہر لکھاری کی طرح مجھے بھی لکھنے کی حسین بیماری اور خوب صورت روگ جب لگا تو میں چھٹی ساتویں میں پڑھتی تھی اور ہر وہ رسالہ جو مل جاتا فری یا کرایہ پر پڑھنا اپنا فرض اولین سمجھتی تھی۔ نوائے وقت اور امروز میں چند کہانیاں اور ایک غزل شائع ہوئی۔ تب شعاع کہیں نہ تھا۔ 1982ء میں شادی ہوئی، سب رسالے ختم شد۔

مگر میں سہیلیوں کو شعر بنا بنا کر عید کارڈ لکھا کرتی پھر نعتیں لکھنے لگی۔ ایک ڈائری شاعری سے بھر گئی۔ 2009ء میں خالد فوت ہو گئے۔ ان کی تین ڈائریاں ملیں۔ وہ بھی بھر دیں۔ اپنی زندگی کی روداد بھی شاعری میں لکھی۔ دوبار شاعری جلا کر ضائع کر دی۔ تین کاپیاں خالد صاحب کے ساتھ دفنا دیں۔ گھر والوں کی حوصلہ شکنی کی وجہ سے۔ جن میں ماں بھی شامل تھی۔ بچوں کو بھی پڑھنے سے خاص شغف نہ تھا۔

یہ 2012ء کی بات ہے۔ بیٹی ایم اے کر کے فارغ تھی۔ ساتھ جاب کرتی تھی، اس نے میری سہیلی سے خواتین ڈائجسٹ منگوایا اور مجھے کہا کہ پڑھ لو۔ میں نے کہا اب اس عمر میں رسالہ پڑھ کے کیا کروں گی، بولی۔ نعت وغیرہ شائع کروالیں، خواتین میں تو نعت کا صفحہ ہی نہ تھا۔ شعاع نام بچپن سے پسند تھا۔ اس میں حمد و نعت کا سلسلہ بھی تھا تو جناب جولائی 2012ء میں پہلا خط شعاع میں جگمگایا۔ حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ خطوط بہت پسند کیے گئے۔ بعد ازاں "حمد" بھی شائع ہوئی پھر حمد شائع ہوئی پھر پہلی حمد دوبارہ شائع ہوئی۔ بس اس کے بعد باری نہ آئی آج تک یہ شاید......

شعاع کا معیار اونچا ہے
اور ہم ہیں ابھی بونے سے

2۔ دن کا آغاز...... جب آنکھ کھلے۔ اکثر بچوں کے ناشتے کے وقت۔ زندگی بالکل بھی باقاعدہ ایک روٹین والی نہیں گزری۔ قرآن تو ترجمہ والا خوب پڑھا مگر نمازیں سسرال میں نصیب نہ ہوئیں باقاعدہ۔ ابھی بھی یہی حال ہے، البتہ گھر کا ہر کام خود ہی کرتے ہیں۔ قضائے عمری کی نمازیں بھی شروع کر لی ہیں۔ دس نمازیں جب وقت ملے پڑھتی ہوں۔ آپ کہہ سکتے ہیں، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ عشاء کے بعد ہم ہیں اور کتابیں، مگر کبھی کبھی ہم عصر کے بعد ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں پھر جب جاگ آئے تب جو ہو سو ہو۔

3۔ شعاع کی سب ہی تحریریں منفرد ہوتی ہیں۔ خاص ہوتی ہیں، لفظ نایاب استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن کے نام کہانی سے مناسبت رکھتے ہوں وہ یاد رہ جاتی ہیں جیسے سرسوں کے پھول، ضبط عشق۔ نایاب لفظ۔ من شرالوسواس۔ بت شکن۔ یارم۔ بوند بوند تماشا وغیرہ۔

4۔ خامیاں اور خوبیاں......

خامی جو تمام لوگ بتاتے ہیں، اونچی آواز ہے اور یہ کہ میں ہر بات عیاں کر دیتی ہوں۔ کسی کا راز نہیں رکھتی لہٰذا ہر غلط کام اور غلط بات مجھ سے چھپا کر ہی کی جائے ورنہ خیر نہیں۔ خوبی...... شوہر تو کہتے تھے تم کوئی بات غلط نہیں کرتی ہو۔ وقت آخری وہ فرشتہ کہہ کر گئے اور ہسپتال میں لوگوں کو بتا کر گئے

کہ لوگوں میں پیسے کو اہمیت دیتا تھا، اچھے کھانے پسند کرتا مگر میری بیوی باسی واسی، بچا کھچا کھا کر خوش رہتی۔ آج کھانا ہے مگر کھا نہیں سکتا لہٰذا سادگی میں صحت ہے۔ بس یہ الفاظ ایوارڈ ہیں میرے لیے۔

باقی لوگ، کچھ پاگل، مجنوں، سائیں لوگ، وکیل، جج، ڈاکٹر وغیرہ کا لقب دے چکے ہیں۔ عالم بھی کہہ چکے مگر گھر والے دنیا دار بتانے پر بضد ہیں جو کہ ناممکن ہے لہٰذا ہر کام میں بچے پھوپھو سے مشورہ لیتے ہیں۔ ہم آدھے میں نہ پونے میں۔ "لکیاں نیں موجاں، ہن لائی رکھیں سوہنیا"۔

5۔ دلچسپ واقعہ تو نہیں، بات ہے۔ شعاع نام ہمیں اتنا پسند تھا جو کہ آٹھویں کے میتھ میں دیکھا۔ پہلی بار شعاع تو بس دل مچلتا تھا کسی کا نام شعاع رکھیں گے۔ عمران سیریز سے متاثر ہو کر خالہ زاد کا نام عمران رکھ چکے تھے۔ پھر ہوا یوں کہ نادرہ خاتون کا ناول شعاع ملا۔ لگا دعا قبول ہو گئی پھر شادی کے بعد یہ والا شعاع بھی نظر آیا تھا۔ اسی لیے پہلا رسالہ شعاع ہی خریدا۔ جو بٹی شمع کا مرہون منت ہے۔

ردا نور

1۔ میں ایک میٹرک پاس لڑکی ہوں۔ میں نے شعاع، کرن، خواتین 2017 سے پڑھنا شروع کیا۔ پر اب تک میں پرانے رسالے پڑھ رہی ہوں اور نئے ڈائجسٹ چھپا کر رکھ رہی ہوں بعد میں پڑھنے کے لیے۔ رسالہ چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے، میرے مالک کا شکر ہے ورنہ ہم جیسی لڑکیوں کا کیا ہوتا پر میرے بھائی جب بھی ہمارے کمرے میں آتے ہیں تو کہتے ہیں جب ہم کمرے میں آتے ہیں تم سب کے چہروں پر ڈائجسٹ یوں ہوتے ہیں۔ اپنا ہاتھ چہرے کے قریب لے جا کر دکھاتے ہیں اور ہماری ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

2۔ میں دوسرا سوال نہیں لکھوں گی بس یہ لکھوں گی پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں اور رات کا کام میرا ہے اور چائے بھی میں بناتی ہوں۔ کبھی میری بہن اور میں نوحے شوق سے سنتی ہوں (میر حسن میر) کے اور اب نیا آیا ہے نوحہ (تو اگر ہوتا تو ایسا نہیں ہوتا غازی) بہت پسند ہے۔ میرے پاس ٹیبلٹ ہے اس پر سنتی ہوں۔

3۔ یادگار تحریر (یہ سلسلے دل کے) آمنہ ریاض کی تحریر ـــــ میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی اور مشا حسن علی کی کہانی (بیلا) میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی اور بہت سی کہانیاں ہیں۔ (جنت کے پتے، پیر کامل، میرے خواب میرے جگنو) یہ سب تحریریں میں نے اپنے بھائی سے ڈاؤن لوڈ کروائی ہیں۔ پچاس کے قریب میں نے کہانیاں کروائی ہیں پر وہ اتنی آسانی سے تھوڑی مانتا ہے، مجھے بھی منت کرنی پڑتی ہے بھئی اس کے کام جو کرتی ہوں۔ خاص کر سر کی مالش وہ بہت شوق سے کرواتا ہے۔

4۔ شروعات کرتے ہیں خامیوں سے میری بڑی خامی دو لوگوں کے درمیان بول دینا۔ اس عادت کی وجہ سے مجھے بہت باتیں سننی پڑی ہیں پر بتاؤں گی نہیں۔ حساس دل تو سب لڑکیاں ہوتی ہیں سو میں بھی ہوں پر دل کی صاف ہوں۔ میری بہن کہتی ہے تمہاری یہ عادت اچھی ہے کہ تم سچ بتا دیتی ہو اور تعریف ماشاء اللہ سے بہت ملتی ہے، میرے بھائی اور بہن کہتی ہے تم منال خان جیسی لگتی ہو ویسے پر چھائی ڈرامے میں وہ بالکل مجھے اپنے جیسی لگی تھی پر تھوڑی مختلف تو ہوتی ہے نا۔

5۔ یادگار واقعہ تو یاد نہیں پر بارش بہت پسند ہے۔

6۔ پسندیدہ بات......

اللہ ناراض ہو کر روٹی نہیں چھینتا
سجدے کی توفیق چھین لیتا ہے
اور یقین مانو یہی سب سے بڑا خسارہ ہے۔

اللہ ہمیں ہر حالت میں نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے، سب پڑھیے، آمین۔

رخسانہ نگار عدنان

شام کی چوکھٹ

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔




MOMIN.08

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میرو خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یادیں جو اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میرو اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول کا بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہیں کہ کیا ہوا ہے اور وہ کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میرو دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میرو شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میرو کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر زینب سے ملتا ہے تو اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آ جاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آزر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پر تکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

(اب آگے پڑھیے)

چوتھی قسط

''میں آپ سے معذرت کرنے آئی تھی خالہ!''

وہ آگے بڑھ کر بڑے مصروف انداز میں مرغیوں کے اوپر پڑا ٹوکرا اٹھا کر منہ سے آ آ آ، کی آوازیں نکالتے ہوئے مرغیوں کو ہاتھ میں پکڑا دانہ ڈالنے لگی جیسے اس نے زینب کی بات سنی ہی نہیں۔

''خالہ! میں آپ سے کچھ کہہ رہی تھی۔'' وہ اپنا غصہ چھپا کر پھر سے اٹھ کر اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

''تو بہتر ہے مجھ سے نہ کہو۔ جا کر اس بالشت بھر کی چھوکری کو سمجھاؤ جو ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے جسے یہ بھی احساس نہیں کہ کون بڑا ہے کون چھوٹا، وہ خود ساروں کی بڑی بنی پھرتی ہے۔'' بتول پھٹ پڑی۔

اور یہ تو زینب کے لحاظ سے وہ کچھ کم بولی تھی ورنہ سارا محلہ جانتا تھا، وہ کوئی بھی ایک جملہ گالی کے بغیر مکمل نہیں کرتی۔

''سمجھاتی ہوں خالہ! اسے بھی سمجھاتی ہوں جتنا سمجھا سکتی ہوں مگر۔'' وہ معاملہ رفع دفع کرنے کو معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''تو یہ کہو ناں وہ تمہارے اختیار ہی میں نہیں، وہ تمہیں سمجھتی کیا ہے، میری مانو کوئی بھلا شریف لڑکا دیکھ کر دو بول پڑھواؤ اور چلتا کرو اس کو۔ تمہارا بڑھاپا عافیت سے گزرے گا۔'' وہ لگی لپٹی رکھے بغیر بولتی چلی گئی۔ زینب کو غصہ تو بہت آیا مگر یہاں وہ بات ختم کرنے آئی تھی بڑھانے نہیں۔

''دعا کریں خالہ! کوئی ایسا مناسب لڑکا مل جائے تو شاید میں دیر نہ کروں کشف کے ہاتھ پیلے کرنے میں۔'' وہ بظاہر خالہ کی رائے کو اہمیت دیتے ہوئے عاجزی سے بولی۔

''ہماری دعاؤں کا تو خیر اس پریا اس کے نصیب پر کچھ اثر نہیں ہونے والا اور کچھ بات تو یہ بھی ہے کہ اسے کسی کی بھی دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔'' بتول اتنی جلدی معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔

اور اب زینب کو پچھتاوا سا ہو رہا تھا۔ وہ یہاں آتی ہی نہیں۔

''یوں تو نہ کہیں خالہ! بچی ہے اور میری زندگی کا واحد سہارا بھی، میں آپ اس کے بڑے ہیں، بڑے بچوں کے لیے دعا نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔'' زینب نے مناسب لفظوں میں اسے بڑے ہونے کا احساس دلانا چاہا جو شاید وہ کبھی تسلیم نہیں کرتی۔

''چھوڑو، ہم کیا، ہماری دعائیں کیا۔'' بتول نے ہوا میں مکھی اڑائی وہ پھر سے اٹھ کر مرغیوں کو دانہ ڈالنے لگی۔ مرغیوں نے اب سرخ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے صحن میں جگہ جگہ گند بکھیرنا شروع کر دیا تھا۔ زینب کو جان

چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔
"اور دور کیوں جاؤ، وہ مسٹنڈا سا لڑکا ہے نا جو آتا رہتا ہے تمہارے گھر بلکہ اکثر تمہاری غیر موجودگی میں بھی آتا ہے۔ اس لڑکی کو ساتھ لے کر اکثر ہی جاتا ہے۔ گاڑی بھی ہے اس کے پاس شاید۔ اسی کے چکر میں اُس کو پھنساؤ نا بلکہ میرے خیال میں پھنس تو چکا ہے۔ بس ہمت کر کے شرعی کام کر لو۔ بیٹی کے دو بول پڑھا دو اس کے ساتھ تاکہ محلے والوں کے منہ تو بند ہو سکیں۔" زینب کو شدید غصہ آیا۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ کشف جو بتول خالہ کے خلاف ہے تو بالکل ٹھیک ہے۔ یہ عورت کسی بھی نرم رویے کی مستحق نہیں ہے۔
"میں چلتی ہوں خالہ! مجھے ابھی جا کر کھانا بھی بنانا ہے۔ کشف آنے والی ہوگی پھر کبھی چکر لگاؤں گی۔"
چارپائی کی پائنتی پر پڑے سبزی گوشت کے سامان کے شاپرز سمیٹتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔
"ہاں تو تم مشورہ مانگتی ہو، دو تو تمہیں برا لگتا ہے۔" بتول کون سا کم تھی۔ اس کا بگڑا موڈ دیکھ کر فوراً جتا کر بولی۔
"یہ بات نہیں ہے خالہ! اور میں ابھی سلامت ہوں اپنی بیٹی کے سر پر، دوسروں کو اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں اور خالہ! ہم اتنے بے شرم لوگ نہیں ہیں کہ خدانخواستہ خود سے اپنی لڑکیوں کے رشتے دیتے پھریں اور بلال میرا بھتیجا ہے۔ وہ گھر میں میری اجازت سے آتا ہے۔ دونوں کالج یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے ہیں، خدانخواستہ وہ یہاں کسی غلط مقصد کے لیے نہیں آتا۔ بہتر ہوگا آئندہ ایسی فضول کوئی بھی بات کرنے سے پہلے سوچ لیجیے گا۔ خدا حافظ!" وہ اپنا غصہ چھپا نہیں سکی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر صاف انہیں سنا گئی۔
"تو بی بی میں اور کیا فرما رہی ہوں۔ جب اتنی بے تکلفی، اتنی محبت ہے دونوں میں تو وہ کام کیوں نہیں کرتیں جو ہمارا معاشرہ اور اللہ بتاتا ہے۔ یوں چھپ چھپا کر ملنے کا کیا مطلب؟" وہ بھی پیچھے آئی ہاتھ نچا کر اپنے موقف پر قائم اس طرح زور زور سے بولی تھی۔
اب زینب کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا۔
"یہ پاگل عورت کسی کی معذرت یا معافی کو کیا سمجھتی ہے بلکہ الٹا جتنی بکواس یہ اس رات کر کے گئی تھی۔ اسے آ کر معافی مانگنی چاہیے تھی۔ ٹھیک کہتی ہے کشف! کبھی کبھی میں مروّت کی انتہا کر دیتی ہوں اور ایسی مروّت ضرور آدمی کو ذلیل کراتی ہے۔"
وہ کڑھتے ہوئے بتول کے گھر کا لکڑی کا دروازہ دھکیلتی باہر نکلی، لیکن وہ پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی تیزی سے باہر نکلی تھی۔
"برا نہیں مانو بی بی! میری بات کا، ایسا کچھ غلط، برا مشورہ نہیں دیا میں نے۔ اگر تو وہ لڑکا تمہارا بھتیجا ہے تو یہ اور بھی اچھی بات ہے پھر تو خود سے بات کرنے میں کوئی عار بھی نہیں۔ جا کر بھائی سے سیدھی بات کرو۔ خیال کرنے والا ہوگا تو دوسری کوئی بات نہیں سوچے گا۔ تمہاری بھی مشکل آسان ہو جائے گی۔" وہ بغیر مانگے مشورہ دینے والوں میں سے تھی۔
"شکریہ آپ کے مشورے کا مجھے جا کر گھر کافی کام کرنا ہے۔ خدا حافظ!" اس سے زیادہ زینب مروت نہیں نبھا سکتی تھی۔
بتول کے کھلے منہ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا وہ مزید کچھ بولنے والی ہے۔ چپ تو وہ تب بھی نہیں رہتی تھی جب گھر میں اکیلی ہوتی تھی اور نہیں تو اپنی مرغیوں سے یا جگنو کے کبوتروں سے باتیں کرنے لگتی۔ آج تو زینب خود اسے یہ موقع دینے آئی تھی تو وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑ دیتی، پیچھے گئی مگر زینب نے اپنی رفتار تیز کر لی۔

''زینب خالہ! لاؤ یہ سامان میں چھوڑ آؤں آپ کے گھر۔'' جگنو اپنے موبائل میں مصروف گلی میں آتے جاتے لوگوں سے کندھے ٹکراتا سامنے کھڑی زینب کو دیکھ کر لپکا۔

''شکریہ' مجھے کہیں دور تو نہیں جانا۔ یہ گھر آ گیا میرا۔'' وہ رکھائی سے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر بولی۔

بتول ابھی بھی اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی جگنو کو اس سے باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔

''اس عورت کے شیطانی ذہن کا کیا بھروسا اپنے بیٹے کو مجھ سے باتیں کرتا دیکھ کر کچھ بھی بکواس کر ڈالے۔ اس کو کوئی روک تو نہیں سکتا۔'' زینب جلدی جلدی سامان زمین پر رکھ کر بند دروازے کا لاک چابی سے کھولنے لگی۔

''زینب خالہ ناراض ہیں کیا؟'' جگنو چکو ہو رہا تھا۔

''میں کیوں ناراض ہوں گی، ہاں تمہاری اماں ضرور ناراض ہو جائیں گی۔ تم اگر یہاں میرے دروازے پر کچھ دیر اور کھڑے رہے تو پلیز اپنی اور میری بچت کا خیال کر وا بھی تم جاؤ۔'' کہہ کر دروازہ کھلتے ہی ٹانگ سے دروازہ کھول کر سامان اٹھاتے تیزی سے اندر چلی گئی۔ جگنو چند لمحے کچھ شرمندہ سا کھڑا رہا۔ پھر پلٹ کر ماں کو دیکھتا پھر سے موبائل نکال کر اس میں مصروف دوسری طرف مڑ گیا۔

☆☆☆

''ٹھک......ٹھک، ٹھک۔'' زمین پر کسی سخت چیز کے ساتھ ایک مخصوص وقفے کے بعد ضرب لگائی جا رہی تھی۔ موحد کا پیڈ پر تیزی سے چلتا پین یک لخت رکا تھا۔

وہ چند لمحے تک اس دور سے آتی مخصوص آواز کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اردگرد پھیلی دھوپ کی چمک میں شدت آ چکی تھی۔ کیمپ میں زیادہ مریض نہیں تھے۔ اس کا کام ڈیڑھ دو گھنٹے کا ہی رہ گیا تھا۔

وہ ہفتہ میں ایک دن شہر کے نواحی دیہات میں فری میڈیکل کیمپ لگاتا تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا، اس کے اس روٹین میں فرق نہیں آیا تھا آج بھی وہ اپنے دو ڈاکٹرز کے ساتھ صبح سویرے لاہور کے نواح میں واقع اس گاؤں میں آیا تھا جہاں کے باسی اپنی صحت کی فکر سے آزاد صرف اپنے روزگار اور زمینوں کی فکر میں گھلتے تھے۔ تاآنکہ ان کی صحت ان کے لیے کسی بڑی جسمانی بیماری کا الارم نہیں بجانے لگتی تھی۔

''بابا جی! یہ آواز کیسی ہے؟'' وہ کان لگائے اس آواز کو سنتا کچھ دیر خود سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اپنے پاس بیٹھے ستر پچھتر سال کے بابا امانت سے پوچھنے لگا۔

بابے نے کچھ حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

کیڑی (کون سی) آواز ڈاکٹر صاحب؟'' وہ کان پر ہاتھ رکھ کر خود بھی کچھ سننے کی کوشش کے بعد سمجھتے ہوئے بولا۔

''وہ جی زمین میں پھاوڑا چلا رہا ہے نا گورکن محمد دین!'' بابے امانت کے پاس کھڑا اس کا پوتا جس کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال ہو گی۔ آٹھویں پاس خود کو خاندان میں سب سے پڑھا لکھا سمجھ کر دادے کا چیک اپ کرانے آیا تھا۔

''کس لیے پھاوڑا چلا رہا ہے؟'' موحد نے بے خیالی میں سوال کیا۔

''گورکن محمد دین!'' سوال کے بعد اسے نام یاد آیا تو وہ بے چین سا ہو کر قلم چھوڑ کر ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔

''یہ جی پاس جو وہ چھوٹی سی مٹی کی دیوار نہیں نظر آ رہی وہ قبرستان ہے، ہمارے گاؤں کا۔ آج چاچا حبیب

اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ عصر کے بعد جنازہ ہے اس کا۔ قبر کھود رہا ہے محمد دین گورکن!" بابے امانت کے پوتے نے پوری وضاحت سے جواب دیا۔

موحد ساکت اس چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی مٹی کی دیوار کو دیکھتا رہ گیا جس کے پار اب تھوڑی دیر بعد کوئی شخص پھاوڑا سر سے بلند کر کے جھک کر زمین کے سنگلاخ زینے پہ چلاتا تھا۔

موحد کو عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔

"میں وہاں جا کر دیکھ لوں۔" وہ بے اختیار کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"آپ جی؟" بابے کا پوتا حیران سا ہو کر بولا۔

"بڑا ہی بھلا مانس تھا اپنا حبیب۔ میں نے گودوں میں کھلایا تھا بڑا شریف، نمازی، پرہیز گار، زمین داری میں جان لڑانے والا، پتا ہی نہیں چلا نمانے کو کب دل کا مرض ہوا اور کب یہ مرض اس کی انگلی پکڑ کر اتنی سی عمر میں اپنے ساتھ لے گیا۔ حق ہا۔" بابے امانت کو مرنے والے کی یاد ستانے لگی۔

"جنازہ کب ہے؟" موحد ابھی بھی اسی بے چینی میں تھا۔

"عصر کے بعد ہے جی!" لڑکا ڈاکٹر کی کیفیت پر کچھ حیران سا تھا۔

موحد نے ایک طائرانہ نظر کیمپ پر ڈالی۔

دوپہر ڈھلنے کو تھی۔ کیمپ میں اب بمشکل سولہ یا پندرہ مریض تھے۔ اس کے ساتھ آئے دونوں ڈاکٹر بڑی خوش دلی سے ان غریب دیہاتی لوگوں کا چیک اپ کرتے، ان کو دوائیں لکھ کر دیتے بلکہ اپنے پاس سے لائی ہوئی دواؤں میں سے فری ادویات انہیں دیتے بہت ساری نیکیاں اپنی جھولی میں سمیٹ رہے تھے۔

"آپ لوگ ذرا دیکھ لیں گے باقی پیشنٹس کو ڈاکٹر اسد؟" موحد ان کے پاس جا کر درخواست کرنے والے انداز میں بولا۔

"جی ڈاکٹر صاحب کیوں نہیں، خیریت تو ہے نا؟" وہ سر ہلا کر موحد کے الجھے چہرے کو دیکھ کر بولا۔

"بس...... ٹھیک ہے سب۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں آ جاؤں گا تھوڑی دیر میں۔" وہ عجلت میں تھا۔

"اور سنیں ڈاکٹر اسد! آپ لوگ فارغ ہو جائیں تو بے شک واپس چلے جائیں۔ مجھے تھوڑا ٹائم لگ جائے گا۔" اسد کچھ حیران سا اسے دیکھنے لگا۔

"اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں ڈاکٹر صاحب!" وہ کچھ فکر مندی سے بولا۔

"تھینکس...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جیسے ہی فری ہوا، میں آ جاؤں گا۔ بیٹا آپ میرے ساتھ آئیں۔" وہ بابے کے پوتے کو اشارہ کر کے باہر کی طرف نکل گیا۔ لڑکا بھی حیران سا اس کے ساتھ چل پڑا۔

☆☆☆

اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے اور وہ ضبط کرنے کی کوشش میں بار بار آنکھیں جھپکتی بہت بے چین، اداس لگ رہی تھی۔

"رو لو اگر تمہیں رونا آ رہا ہے تو۔" بلال نے اسے دیکھ کر ہمدردی سے کہا کشف نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا۔

"مجھے رونا نہیں ہے۔" اس کی آواز بھاری تھی۔

"تو پاگل پھر دل کا بوجھ کیسے کم ہوگا؟" بلال اسے پہلی بار اس کیفیت میں دیکھ کر دل میں بہت پریشان ہو

چکا تھا۔ اس کے سامنے اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''مجھے اس بوجھ کو کم نہیں کرنا اور بڑھانا ہے۔'' وہ جیسے ضد سے بولی۔
بلال نے اسے چونک کر دیکھا۔
''کیا ہوا ہے کشف! مجھے نہیں بتاؤ گی؟'' وہ نرمی سے بولا۔
وہ دور پیپل کے اونچے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھے کسی پرندے کو دیکھتی رہی۔
''پرندے کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں نا بلال! ان کے پر ہوتے ہیں، وہ جہاں جی چاہتا ہے اڑ کر اس جگہ چلے جاتے ہیں۔''
بلال نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کر کسی پرندے کو تلاش کرنا چاہا۔
''تم نے کہاں جانا ہے جو تمہیں پروں کی ضرورت ہے۔'' وہ ٹوک کر بولا۔
''امریکہ! اپنے بابا سے ملنے۔'' وہ اس طرح دور بیٹھے اس پرندے پر نظریں جمائے بولی تھی۔
''وہاٹ!'' بلال کے لیے یہ بات کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔
''کیا کہا تم نے ابھی۔'' وہ جیسے اس کے منہ سے دوبارہ سننا چاہتا تھا۔
''سونیا آنٹی جانتی ہیں میرے بابا کے بارے میں کہ وہ کہاں ہیں لیکن خدا جانے انہیں مجھ سے کیا ضد ہے، مجھ سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتیں۔ کچھ بتایا بھی نہیں، میں نے اتنا کریدا مگر وہی جواب کہ انہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اوپر سے ان کی ساس ہٹلر کی نانی، جیسے ہی سونیا آنٹی انہیں دیکھتی ہیں ان کو تو جیسے لرزہ سا آجاتا ہے۔'' وہ بغیر رکے بولتی چلی گئی۔
''ہٹلر کی نانی!'' بلال مسکراہٹ دبا کر بولا۔
''اور تمہیں یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی ہے اپنے بابا سے ملنے کی کشف میں تمہیں اتنی بے وفا، احسان فراموش لڑکی نہیں سمجھتا تھا، سچ میں۔'' بلال سنجیدہ ہوا تھا۔
''کیا مطلب، میں نے تمہارے ساتھ کیا احسان فراموشی کی ہے؟'' وہ گھاس کی پتیاں کھینچ کھینچ کر توڑتے ہوئے بولی۔
وہ دونوں یونیورسٹی کے اتنے بڑے گراؤنڈ میں اکیلے بیٹھے تھے۔
''میرے ساتھ نہیں، میں ان کی بات کر رہا ہوں، انہوں نے جس محبت، جس تندہی کے ساتھ تمہاری پرورش کی ہے یار! تم جو انہیں پس پشت ڈال کر صرف اپنے باپ کے لیے پاگل ہو رہی ہو۔ کیا انہیں اچھا لگا ہو گا۔'' بلال اسے لتاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
میں انہیں پس پشت نہیں ڈال رہی مگر ایک بار مجھے میر منصور سے ملنا ضرور ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں، لو آنی کی کال آرہی ہے پلیز مجھے گھر ڈراپ کر دو گے نا۔ آج تو میں اس پبلک کنوینس کے ہاتھوں بہت ذلیل ہو چکی ہوں۔'' وہ کال ریسیو کرتے ہوئے بولی۔
''ہونہہ جیسے میں تمہیں انکار کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں نا۔''
''وہ تو تم کر ہی نہیں سکتے۔'' وہ پورے استحقاق سے بولی اور دونوں باہر کی طرف چل پڑے۔ کشف زینب سے فون پر بات کر رہی تھی۔

☆☆☆

''یہ قبر میں کھود سکتا ہوں؟'' گورکن جو پوری تندہی سے پھاوڑا چلاتے ہوئے اب تقریباً ایک گہرا گڑھا

کھود چکا تھا۔ پاس آ کر کھڑے ڈاکٹر کی بات سن کر اس کا پھاوڑا ہوا میں اٹھا ہی رہ گیا۔
سترہ سالہ یاسر بھی ڈاکٹر کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔
''ہیں جی؟'' گورکن حیرانگی سے پھاوڑا ایک طرف رکھ کر گردن پر پڑے صافے سے اپنا پسینے سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔
''میں یہ قبر کھودنا چاہتا ہوں۔ مطلب اپنے ہاتھوں سے یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔'' موحد گورکن کی آنکھوں کی حیرت پڑھ کر کچھ جھجک کر بولا۔
''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' گورکن کچھ پریشان ہو گیا۔
''ڈاکٹر جی! یہ تو ان کا کام ہے مطلب گورکن چاچا ہی سارے گاؤں میں۔ کوئی بھی مر جائے تو یہی اس کی قبر کھودتے ہیں۔ پہلے بھی کبھار ان کا بیٹا غلام محمد ان کا ساتھ دیتا تھا۔ اس کام میں۔ پر اب وہ شہر چلا گیا ہے۔ دو چار مہینوں بعد چکر لگاتا ہے۔'' یاسر نے پوری وضاحت سے جواب دیا۔
''ایکچوئلی، اگر انہیں اعتراض نہیں ہو تو میں یہ قبر کھود سکتا ہوں پلیز۔'' موحد کی نظریں گورکن کے پاس پڑے پھاوڑے پر جمی تھیں، دوسرے لمحے وہ گورکن کے جواب کا انتظار کیے بغیر پھاوڑا اٹھا کر اس گڑھے کو مزید گہرائی میں کھودنے لگا۔
اناڑی پن سے پھاوڑا چلاتا ڈاکٹر موحد...... یاسر اور گورکن آنکھیں پھاڑے اسے پورا زور لگاتے دیکھتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

زینب نے کوفتوں کی بُھنائی کرتے ہوئے دوسری طرف رکھے پنیر پالک میں چمچ چلایا۔
برسات کا موسم اختتام پذیر ہو رہا تھا۔ رات میں کچھ ٹھنڈک سی ہو جاتی تھی لیکن دن اسی طرح گرم اور حبس بھرے تھے پھر کچن میں تو اور بھی گرمی ہوتی تھی جبکہ دونوں چولہے پوری شدت سے جل رہے تھے۔
زینب کی عادت تھی وہ جب بھی کسی کی دعوت کرتی، اگرچہ اس کا موقع بہت کم آتا تھا۔ وہ یہ دونوں ڈشز ضرور بناتی جس پر کشف چڑ جاتی۔
''پتا نہیں آپ کو کیوں اتنی محنت طلب ڈشز بنانے میں لطف آتا ہے بندہ سیدھا سیدھا چکن کڑاہی بنائے۔ زیادہ ہی مدارت کرنے کا شوق ہے تو ساتھ میں بریانی بنائے رئیس لوگ مگر آپ کو تو پوری جان لڑانے کی عادت ہے۔ پتا نہیں کیوں خود کو اذیت دینے میں آپ کو مزہ آتا ہے۔''
''فرنی کے لیے چاولوں کا آٹا پانی میں گھولتی وہ مسکرائی تھی۔
اسی وقت باہر صحن میں پڑی تپائی پر رکھا اس کا فون بجنے لگا۔
''اب کس کا فون آ گیا۔ کہیں موحد منع ہی نہ کر دے کھانے پر آنے سے۔ یا اللہ اب تو میں اتنی محنت کر بھی چکی۔''
صافی سے ہاتھ پونچھتے وہ عجلت میں باہر کی طرف آئی تھی۔ نمبر دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ساکت سی رہ گئی۔ فون بجے جا رہا تھا اور وہ بغیر پلکیں جھپکائے فون کو دیکھے جا رہی تھی۔
پھر گہرا سانس لے کر کہ جائے فرار نہیں تھی کوئی بھی، اس نے کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف سونیا تھی۔
مری آواز میں سلام کر کے زینب اس کا حال پوچھنے لگی۔
''کس لیے بھیجا تھا تم نے اس کشف کو میرے پاس؟'' وہ اس کی خیریت والے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے

ہوئے کر خشکی سے پوچھنے لگی۔
اور ایک لمحہ کو زینب گنگ سی رہ گئی۔ اسے سونیا کا سوال ہی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
''کیا کہہ رہی ہو سونیا؟'' وہ الجھ کر بولی۔
''پلیز یوں انجان مت بنا کرو۔ مجھے تمہاری یہ مصنوعی سادگی بہت دھوکے باز لگتی ہے۔'' نجانے سونیا کو کس پر غصہ تھا اور کتنا تھا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے زینب کو ہی لتاڑ گئی۔
وہ اس طرح تو زینب سے کبھی بات نہیں کرتی تھی۔
''کیا ہوا ہے سونیا؟'' وہ کچھ ڈر سی گئی تھی۔
''کشف کے کانوں میں یہ ساری کتھا کس نے ڈالی ہے کہ اس کا باپ امریکہ میں ہے اور وہ اس سے ملنے کے لیے جانا چاہتی ہے۔''
زینب کو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ کشف صبح ہوتے ہی سونیا کی طرف چلی جائے گی یہ سب کچھ پوچھنے کے لیے۔
''وہ تمہاری طرف آئی تھی؟'' وہ بجھے ہوئے ناامید لہجے میں بولی۔
''نہیں تو کیا مجھے خواب آیا تھا یا الہام ہوا ہے۔'' سونیا واقعی بہت غصے میں لگ رہی تھی۔
معلوم نہیں اس کشف نے اس سے کیا کچھ بول دیا ہو۔
''زینب! جو بات ہوئی تھی، طے تھی۔ تمہیں معلوم ہے پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟'' سونیا نے جیسے پتھر اٹھا کر اس کے سر پر مارا تھا۔
''یہ دن ایک نہ ایک روز تو آنا تھا سونیا! وہ بڑی ہو چکی ہے، وہ یہ سوال تو ضرور کرے گی۔ ہم اسے سوال کرنے سے تو نہیں روک سکتے۔'' زینب کچھ بے بسی سے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔
''وہ سوال کرے اور تم محبت سے جواب دے دو...... اپنے بدلے لینے کا ٹائم شاید آ گیا ہے یا شاید تمہیں ایسا لگا ہے۔'' سونیا آج ہر لحاظ بالائے طاق رکھنے پر مصر تھی۔ زینب کو بہت برا لگا۔
''خدا کے لیے سونیا! اس سارے میں مجھے نہیں گھسیٹو اور کشف نے یہ سب کچھ صرف کل نہیں پوچھا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا ہے وہ باپ کے بارے میں پوچھتی چلی آ رہی ہے۔ میں اسے ٹالتی رہی ہوں۔'' زینب تحمل سے کہہ رہی تھی۔
''تو اب بھی ٹال دیتیں ناں، کیوں اس پنڈورا باکس کو کھولنا چاہ رہی ہو تم؟'' سونیا چیخ کر بولی۔
''میں نے اسے ٹالا تھا، بہلایا تھا بہت اور سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بضد تھی تو ظاہر ہے اگر نہیں بتاتی۔''
''ہاں نہیں بتاتیں تو تمہاری سچائی داؤ پر لگ جاتی۔'' سونیا طنز سے اس کا جملہ اچک کر بولی زینب ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔
''وہ آتی ہے تو میں اس سے بات کرتی ہوں۔ سمجھاتی ہوں اسے۔'' زینب نہ چاہتے ہوئے بھی نرم لہجے میں بولی۔
''ایسا ہو جائے تو یہ سب کے لیے بہتر ہوگا ورنہ تم جانتی ہو۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو زینب کو بچھو کی طرح ڈنک مار گیا۔
''بہتر ہے جو میں جانتی ہوں اسے کوئی اور نہ جانے ورنہ میرے تو نہیں بہت سوں کے پرخچے اڑ جائیں

گے۔'' کہہ کر اس نے کانپتے ہاتھ کے ساتھ فون بند کر دیا۔
اس کی سانس یوں تیز تیز چل رہی تھی جیسے وہ پتا نہیں کتنی دور سے بھاگتی ہوئی آ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں شدت جذبات اور بے بسی کے گہرے احساس سے آنسو آ گئے۔
''بے کار کی زندگی، بے کار کی قربانیاں، یہاں کسی کو کچھ نہیں ملنے والا ایک لفظ ستائش یا تحسین کا بھی نہیں پھر کس لیے میں احمقوں کی طرح اکیلی اس رستے پر دوڑتی چلی جا رہی ہوں۔'' اسے بری طرح سے رونا آ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا اندر جا کر کمرہ بند کر کے سارے میں اندھیرا کر دے۔ بستر میں گھس کر اتنا روئے اتنا روئے۔
اسی وقت دروازہ کھول کر کشف اندر آئی۔ زینب نے منہ پھیر کر اپنے آنسو چھپائے۔
''یہ کیا جل رہا ہے کچن میں؟'' کشف اندر داخل ہوتے ہی ناک سکوڑ کر بولی تو زینب تیزی سے کچن میں بھاگ گئی۔

☆☆☆

''پاپا! یہ جبران ہے۔'' آزر اپنے فون میں مصروف تھا۔
یہ شہر کا بہترین ریسٹورنٹ تھا جس میں اس وقت ہائی ٹی چل رہی تھی مگر آزر نے ایک بڑا الگ تھلگ سا میٹنگ ایریا سلیکٹ کیا تھا جہاں وہ بیٹھ کر اطمینان سے اس معاملے کو نپٹا سکے۔
ردا نے اسے کال کی تھی کہ وہ آفس سے فری ہوتے ہی جبران کو لے کر اس کے پاس آ جائے گی۔
پہلے وہ اسے آزر کے آفس لے کر آنا چاہتی تھی لیکن آزر نے منع کر دیا۔ اس میٹنگ کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا جس سے آزر کے لیے کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس نے ردا کو اس مصروف ہوٹل میں آنے کا کہہ دیا بلکہ آج تو اس سے آفس میں کچھ بھی کام نہیں ہو سکا تھا۔
کسی بھی کام میں نہ توجہ لگ رہا تھا نہ توجہ...... صرف ردا کا خیال دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔
کچھ بھی تھا ردا لاکھ مؤدب، خیال کرنے والی حساس بیٹی تھی مگر وہ میچور تھی، خود مختار تھی چاہتی تھی تو کچھ بھی کر سکتی تھی۔
صبح جو جارحانہ پن آزر کے مزاج میں تھا۔ اس وقت تک اس نے خود کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا تھا کہ یہ معاملہ جذبات سے نہیں بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے حل کرنے والا ہے۔
اگر وہ لڑکا واقعی اس قابل ہوا اور اسے ردا کے لیے بالکل مناسب لگا تو اماں جان کے فیصلے سے ٹکرانے کے لیے ہمت کہاں سے لائے گا اور اگر ردا کی پسند کو اس نے مسترد کر دیا تو پھر ردا کو کس طرح قائل کرے گا۔
دونوں ہی صورتوں میں اسے اپنی ہمت کم پڑتی نظر آ رہی تھی۔
اس جوڑ توڑ سے گھبرا کر اس نے ردا کو آفس سے جلد اٹھنے کا کہہ دیا تھا اور خود بھی یہاں گھنٹہ بھر پہلے سے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اب ردا کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔
اٹھائیس انتیس سال کا مناسب شکل و صورت کا ہینڈسم لڑکا جس کے چہرے پر ''سیلف میڈ'' کا ٹیگ اس کا بیک گراؤنڈ جانے بغیر بھی صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔
آزر بزنس کی جس کلاس سے تعلق رکھتا تھا، وہاں آئے دن انہیں اپنے آفسز، فیکٹریوں میں نئی بھرتیوں کے لیے انٹرویوز کی ضرورت پڑتی تھی جبران ایسے ہی چہروں میں سے ایک چہرہ تھا جو اس کے سامنے انٹرویو ٹیبل کے پرے بیٹھے کچھ کنفیوز، کچھ مصنوعی خود اعتمادی کا سہارا لیے کچھ امید کچھ ناامیدی کچھ مایوسی میں ڈوبتے ابھرتے، مڈل کلاس گھروں سے تعلق رکھنے والے یہ عام سے چہرے، انہی میں سے ایک چہرہ!

جیسے اس کی بیٹی اپنے مستقبل کے لیے ایک مضبوط امیدوار کے طور پر لے کر آئی تھی۔ جبران اس کی اندر تک اترتی جانچتی نظروں سے خائف ہو کر اپنے دونوں ہاتھ آپس میں جکڑے، جیسے خود کو سنبھالا دینے لگا۔

"پلیز!" آزر نے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہہ کر گویا اسے ایک جھوٹی امید دلائی تھی۔

ردا اور جبران بیٹھ چکے تھے۔

آزر نے چائے کے ساتھ اسنیکس کا آرڈر دے دیا تھا۔

بات کرنے کا وقفہ طویل ہو رہا تھا اور جبران کا اعتماد ایک اضطراب اور بے چینی میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

اور آزر یوں چائے اور اسنیکس کو انجوائے کر رہا تھا جیسے وہ بھی ٹی پارٹی انجوائے کرنے کے لیے تو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ردا کے لیے بھی باپ کا یہ انداز کچھ اجنبی سا تھا۔

وہ کن انکھیوں سے جبران کے اضطرار بھری انداز کو دیکھ کر اسے کچھ پریشان سی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک آدھ بار نظر بچا کر اس نے باپ سے آنکھوں میں التجا بھی کی تھی جسے آزر یکسر نظر انداز کر گیا تھا۔

"بابا! جبران کو کسی اہم میل پر ابھی کام کرنا ہے آفس جا کر۔ چھ بجے تک اسے یہ میل بھیجنی ہے تو۔" ردا نے آخر ہمت کر کے جبران کی خفگی اور منت بھرے انداز کو محسوس کر کے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"کیوں نہیں، چائے تو پی لی۔ اگر یہ جانا چاہتا ہے تو کیوں نہیں۔ جا کر اپنا کام نپٹائے اور جبران کام کو زندگی میں بہت اہمیت دینی چاہیے ورنہ بعد میں بہت سی کمپلی کیشن ہو جاتی ہیں۔ آئی مین آفس کی اے سی آر وغیرہ میں جو کہ آپ کے کیریئر کے لیے ٹھیک بات نہیں...... نائس ٹو میٹ یو ینگ مین۔" وہ خوش دلی سے اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ ردا اور جبران حیران و پریشان ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے...... کوئی پرابلم ہے۔" آزر دونوں کو دیکھ کر فکر سے بولا۔

"بابا! آپ کو جبران سے بات کرنا تھی۔" ردا احتجاج بھرے لہجے میں بولی۔

☆☆☆

سورج دھیرے دھیرے مغرب کی طرف اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

زردی مائل دھوپ کی روشنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی، جب قبرستان سے جنازہ پڑھ کر جانے والوں میں حبیب کے لواحقین بھی ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے۔ سارے گاؤں والوں کے لیے یہی بات کیا کم حیرت کا باعث تھی کہ ایک باہر سے آیا پڑھا لکھا، اتنا لائق فائق ڈاکٹر جس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے مردے کے لیے قبر کھودی۔

پھر ساتھ مل کر جانے والے کو لحد میں اتارا جنازے کو کندھا دیا تدفین کے اخراجات گھر والوں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اپنی جیب سے ادا کیے۔ ان کے ساتھ مل کر دل سے مرحوم کے لیے فاتحہ پڑھی۔ اب بھی قبرستان خالی ہو چکا تھا مگر موحد ایک قبر کے تعویذ کے سرہانے بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

اس کے دماغ میں بار بار اپنے الجھے خوابوں کا ایک ہی منظر گڈمڈ ہو کر آ رہا تھا جو وہ کئی سالوں سے تواتر سے دیکھتا آ رہا تھا۔

وہ کدال لے کر سخت محنت کشی کی حالت میں زمین کو کھودتا جاتا ہے۔ ایک پوری قبر تیار کرتا ہے اور پھر کسی کفن بند مردے کو بڑی احتیاط اور دھیان سے لحد میں اتارتا ہے اور خواب کے آخری حصہ میں وہ اس قبر پر مٹی ڈال رہا ہے۔ پھر اس قبر کی گیلی مٹی پر پھولوں کی پتیاں رک رک کر پھینکتا جاتا ہے۔

اس نے جھرجھری سی لی۔ اس خواب کے مٹیالے منظر سے نکل کر سامنے بنی تازہ قبر اور اس کے نئے مکین کو چند لمحے سوچا۔

ایک طرف لفافے میں تھوڑی سی پتیاں پڑی تھیں۔ وہ لاشعوری طور پر اٹھ کر وہ پتیاں قبر پر پھینکنے لگا۔

قبرستان میں روشنی اب مٹیالی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر اطراف میں دیکھا۔ ہر طرف خاموشی، سناٹا اور روح کو کھینچ لینے والی بے ثباتی تھی۔ اس کے فون پر میسج ٹون بجی۔

اس نے گہرا سانس لے کر ہاتھ جھاڑے، ایک آخری نظر اس عمیق سناٹے پر ڈالی اور خاموشی سے اس شہر خموشاں سے باہر نکل آیا۔

”موحد بیٹا آج رات کا ڈنر آپ نے ہمارے ساتھ کرنا ہے آپ کو ری مائنڈ کرانا تھا۔“ زینب کا محبت بھرا میسج بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔

”وہ بالکل یہ دعوت نامہ بھول چکا تھا اور جس طرح کی بے حسی اور ڈپریشن اس وقت اس پر طاری تھا اس نے واپس جا کر صرف اپنے کمرے کی تنہائی میں ہی پناہ لینی تھی۔

پانچ بجنے کو تھے وہ تب بھی کوشش کرتا تو سفر میں اسے ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ لگ ہی جاتا جبکہ راستے بھی اجنبی تھے۔

”صبح کولیگز کے ساتھ آنا تھا تو اس نے ڈرائیور کو منع کر دیا اور اب ان کو بھی واپس بھجوا دیا تو ظاہر ہے واپسی کا سفر اب راستہ پوچھ پوچھ کر ہی کٹے گا۔“ وہ سوچتا ہوا ایک طرف کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

”ہاں گئی تھی۔“ وہ اپنے آگے پڑا کھانا تیز تیز کھانے میں مگن تھی۔

”ویسے آنی! بائی دا وے، یہ کس کے لیے دعوت کا اتنا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس بہانے ہم غریبوں کو بھی کچھ اچھا کھانے کو مل رہا ہے۔“ اس نے سلاد کی پلیٹ میں سے چن چن کر کھیرے نکال کر کھاتے ہوئے کہا۔ زینب نے گھور کر اس کے آگے سے سلاد کی پلیٹ اٹھائی۔

''کیا ہے، کھانے دیں۔ ساری تو نہیں کھا جاؤں گی۔'' وہ احتجاجاً بولی۔
''کم ہے سلاد، ساری پلیٹ تو کھا گئی ہو۔ مہمان کے آگے کیا رکھوں گی میں۔'' زینب پلیٹ فریج میں رکھتے ہوئے بولی۔
''مہمان......کون مہمان؟'' کشف آخری نوالہ توڑتے ہوئے چونکی تھی۔
''ڈاکٹر موحد۔'' زینب اطمینان سے بولی۔
کشف چند لمحے ناسمجھی سے اسے دیکھتی رہی۔
''کون ڈاکٹر موحد؟'' اسے بالکل بھی یاد نہیں آیا تھا۔
جواب میں زینب نے اسے فقط گھور کر دیکھا تھا اور دم پر پڑے کوفتے اور پالک گوشت کو آخری نظر دیکھ کر چولہے بند کر دیے۔
ٹھنڈی ہوتی فرنی کا پیالہ اٹھا کر فریج میں رکھا۔ اب صرف چکن بریانی کا کام رہ گیا تھا۔ مسالا وہ بنا چکی تھی، چاول صاف کر لیے تھے۔ کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور تھکن سے اس کے کندھے اکڑ گئے تھے۔
''اچھا یاد آیا وہ جس ڈاکٹر نے آپ کا ٹریٹمنٹ کیا تھا۔ ویسے آنی! قسم لے لیں، وہ ڈاکٹر تو شکل سے بالکل بھی نہیں لگتا۔ بے چارہ، مسکراتا ہی رہتا ہے۔ اس دن بھی جب اس منحوس بتول خالہ نے یلغار کی تھی اس بے چارے ڈاکٹر کی شکل دیکھنے والی تھی۔ باہر کے ملکوں میں ایسے لائیو شو دیکھنے کو کہاں ملتے ہوں گے ان جیسوں کو۔''
وہ اس دن کے منظر کو سوچ کر مسکرائی تھی۔
''اور اگر کشف کو پتا چل جائے کہ میں آج بتول کی طرف گئی تھی وہ بھی معذرت کرنے تو......تو یہ مجھے کتنا کچھ سنائے گی۔ نہیں اسے تو بالکل نہیں بتانا۔'' زینب نے دل میں پکا ارادہ کر لیا۔
''مگر تم اس وقت صرف میرے سوال کا جواب دو، تم وہاں گئی کیوں تھیں۔ میں نے جو کچھ تم سے بولا تھا اس کے بعد بھی تمہیں کچھ اور سننے کی، جاننے کی خواہش تھی جو تم سونیا کے پاس جا پہنچیں۔'' زینب کو نئے سرے سے طیش آیا تھا۔ سونیا کا فون یاد آتے ہی کشف ایک دم سے چپ کر گئی۔
''کیا ہوا؟ اب یوں خاموش کیوں ہو گئی، جواب دو مجھے۔'' وہ صحن میں لگے سنک میں عصر کا وضو کرتے ہوئے گم صم بیٹھی کشف کو دیکھ کر ٹوک کر بولی جو کسی گہری سوچ میں تھی۔
''پتا نہیں میں وہاں کیوں گئی آنی! اینڈ بی لیومی، میں ارادتاً وہاں نہیں گئی تھی۔ میری وین ایک اسٹاپ آگے نکل گئی تو مجھے وہاں جانا پڑ گیا مگر وہاں جا کر ایک بات مجھے بہت شدت سے فیل ہوئی۔'' وہ رک رک کر جیسے کچھ سوچ کر بول رہی تھی۔
''کون سی بات؟'' زینب وضو مکمل کر کے اب اپنا دوپٹا سر پر لے کر کانوں کے پیچھے اڑستی ہوئی سرسری لہجے میں بولی۔
''آنی! کیا بابا بھی ایسے تھے؟'' وہ افسردہ سی تھی۔ زینب کا دل زور سے دھڑکا۔
''کیا مطلب؟'' وہ نظریں چرا کر بولی۔
''پھوپھو جیسے۔'' وہ چارپائی کے رنگین پلاسٹک کے بان کی رسیوں کو انگلیوں سے اِدھر اُدھر کرتے ہوئے رنجیدہ لہجے میں بولی۔
زینب اسے دیکھتی رہ گئی۔
اسے سونیا کا غصے بھرا انداز یاد آیا۔
''پتا نہیں، اس نے کشف کو کیا کچھ کہا ہوگا۔'' زینب کو سونیا پر بیک وقت غصہ اور ناگواری محسوس ہوئی۔

"کون سی بات؟" آزر آرام سے بولا۔
وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ ردا نے آنکھوں میں جبران سے کہا کہ وہ بات شروع کرے۔
"انکل، آپ نے آج ملنے کے لیے بلایا، آپ کا شکریہ۔ اگر ہماری ملاقات نہیں ہوتی تو شاید دو ایک دن میں، میں خود آپ سے ملنے کے لیے آجاتا۔" وہ رک رک کر کچھ اعتماد سے بول رہا تھا۔
آزر بظاہر نارمل مگر دل میں جز بز ہوتا اپنے ابھرتے ہوئے غصّے بھرے جذبات کو دباتا اسے یک ٹک دیکھتا رہ گیا۔
"یہ تو خوشی کی بات ہے اگر آپ کو مجھ سے ملنا تھا۔" وہ سر ہلا کر بے تاثر لہجے میں بولا۔ "ویسے ہے تو یہ مینرز کے خلاف مگر پھر بھی پوچھ سکتا ہوں آپ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟" آزر بھی اب اس معاملے کو جلد سے جلد لپیٹنا چاہتا تھا سو جبران کو ہی بات کرنے کی دعوت دیتا ہوا بولا۔
جبران کن انکھیوں سے مضطرب سی نظریں جھکائے اپنے ناخنوں سے نیل پالش کھرچتی ردا کو ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔
"ایکچوئلی انکل...... میں اور ردا......" اس نے بولنے کی کوشش کی۔
"ینگ مین! اپنی بات کرو، ردا کا آپ کی کسی بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ درمیان میں ہی اس کی بات اچک کر سرد مہری سے بولا۔
"ایسا نہیں ہو سکتا انکل! میری بات ردا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور نہ ردا کی بات مجھ سے جڑے بغیر مکمل ہو سکتی ہے۔" آزر کے حساب سے جبران کافی بہادری کا مظاہرہ کر رہا تھا اس کے سرد، بے تاثر رویّے کے باوجود!
"ایسا کیا ہے؟" آزر کا ماتھا شکنوں سے بھر چکا تھا۔ ردا کا رنگ فق ہو رہا تھا۔
"انکل! میں ردا کو پسند کرتا ہوں۔ آئی مین پروپوز کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی مجھے۔" وہ ہمت کر کے بات کر چکا تھا۔
"ایک منٹ رکو۔" آزر کی برداشت کی حد ختم ہونے کے قریب تھی۔
"یہ سب کچھ سوچنے اور اس کے بعد زبان پر لانے سے پہلے کیا تم نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ تمہاری اور ردا کی کلاس میں کتنا فرق ہے۔"
وہ اب ٹھیک اسی لیول پر آ کر بات کر رہا تھا جس نے جبران کو اتنے سارے دن اس موضوع پر سوچنے اور ردا سے اظہار محبت کرنے سے روکے رکھا تھا۔
"بہت سارے دن اور بہت ساری راتیں میں نے اس فرق کو سوچا تھا۔" وہ بغیر کسی جھجک کے ردا پر نظریں جما کر اعتماد سے بولا۔
"اور پھر بھی تم نے یہ سب کہہ ڈالا، حیرت ہے۔" آزر تمسخر بھرے انداز میں کندھے اچکا کر بولا۔
"حیرت تو مجھے بھی بہت ہوئی تھی انکل میں جتنا اس فرق کو سوچتا تھا۔ مجھے یہ فرق اتنا ہی کم ہوتا نظر آ رہا تھا اور آج آپ کے پاس آنے سے چند لمحے پہلے یہ فرق میرے نزدیک بالکل مٹ گیا۔ میں ردا سے اتنی محبت کرتا ہوں جتنا کوئی۔" وہ لگاوٹ سے بول رہا تھا۔
جب آزر ایک دم سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا کھڑا ہو گیا۔
"اسٹاپ اٹ۔" بامشکل اپنی آواز کو نیچا کرتے ہوئے بھی اس کی ٹون کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ

حقارت اس کی نظروں میں تھی جبران کے لیے۔
"اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کروں گا۔" وہ جھک کر جبران کو غصیلی نظروں سے گھور کر بولا۔
"مگر میں نے تو ابھی ایسا کچھ کہا ہی نہیں انکل۔" جبران کو اس کے ایسے ہی ردعمل کی امید تو تھی مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ ردعمل اتنی جلدی دکھا دے گا۔
"مجھے تم سے مزید کچھ سننا بھی نہیں ہاں تمہیں بتانا ضرور ہے کہ ردا کی شادی وہیں ہوگی جہاں اس کے ماں باپ کی مرضی اور رضامندی ہوگی۔ میں تم سے ملنے اس لیے آیا تھا کہ میں ردا کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ تم میری امیدوں پر فورٹی پرسنٹ بھی پورے اترتے تو، تو شاید میں کچھ سوچ لیتا۔" وہ ردا کے اترے چہرے کو سرسری نظر سے دیکھ کر حقارت سے جبران سے بولا۔
"میں اس لیے آپ کی امیدوں پر پورا نہیں اترا انکل کیونکہ آپ یہاں آنے سے پہلے ہی مجھے مسترد کرنے کا سوچ کر آئے تھے۔" وہ بھی اس کے مقابل اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
"صرف اس لیے کہ آپ اپنی بیٹی کو مطمئن کر سکیں کہ اس کی خوشی کی خاطر آپ مجھ سے ملنے تو آ گئے مگر میں کسی بھی طرح اس کے لائق نہیں ہوں۔ آپ اس کے لیے کوئی حجت نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔" وہ بھی جواباً طنز کے تیر برساتا گویا حساب برابر کر رہا تھا۔
ردا کی آنکھوں سے اب ٹپ ٹپ آنسو اس کی گود میں رکھے دونوں ہاتھوں کی پشت پر گر رہے تھے۔
مردوں کی انا اور کلاس کی جنگ میں ہار صرف ایک عورت کا مقدر بنتے جا رہی تھی۔
وہ دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دیتی تو ایک کو ہارنا پڑتا، وہ بھی ساری زندگی کے لیے۔
اب بساط پلٹ جائے یا لپیٹ لی جائے، شکست اس کے حصے میں آئی تھی۔
یہ تو طے تھا، وہ یہاں سے اٹھے گی تو اب ایک مکمل ہاری ہوئی عورت ہوگی۔
محبت کی مانے گی تو اپنے باپ کو ہار دے گی، رشتوں کو کھو دے گی۔
رشتوں کا مان رکھے گی تو محبت کا جوا ہار جائے گی۔
اور وہ وہاں بیٹھے بیٹھے لڑے بغیر، جنگ کیے بغیر اپنی ہار، اپنی شکست تسلیم کر چکی تھی۔
وہ دونوں شاید ابھی بھی نفرت بھرے مکالمے ایک دوسرے کے ساتھ بول رہے تھے اور اس کھیل میں وہ ردا کے وجود کو یکسر فراموش کر چکے تھے، جس وجود کے لیے وہ دونوں لڑ رہے تھے، وہی ان کے لیے بے معنی ہو چکا تھا۔ اپنا وجود کھو چکا تھا۔
وہ ان کے ہلتے لبوں سے نکلنے والے الفاظ سمجھے سنے بغیر کسی متحرک جسم کی طرح اٹھی اور پتھر جیسے بھاری قدموں سے قدم قدم چلتی باہر کی طرف جانے لگی۔
بہت دیر بعد آزر کو اس کے چلے جانے کا احساس ہوا تھا۔ وہ جبران کو نفرت سے دیکھتا اسے قطعی انکار کرتا تیزی سے باہر کی طرف نکلا تو وہ کہیں بھی نہیں تھی۔
آزر نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ردا دور دور تک کہیں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے مڑ کر ہوٹل میں واپس آیا۔
جبران ایک نفرت بھری نظر ڈال کر منہ پھیر کر ہوٹل کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔
آزر ردا کو پاگلوں کی طرح ہوٹل کے اندر باہر پارکنگ میں سب جگہ دیکھ آیا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔
"وہ شاید آفس دوبارہ چلی گئی ہو۔ یا ان دونوں نے کچھ اور پلان کر رکھا ہوگا۔" یہ سوچ کر ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر اندھا دھند وہاں سے گاڑی بھگاتا لے گیا۔

"کیا کہا تھا سونیا نے تم سے؟" وہ بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں بھر کر حساسیت سے بولی اگر اسے ذرا بھی شک ہوتا کہ کشف سونیا کی طرف جائے گی تو وہ اسے سختی سے جانے سے منع کر دیتی۔

"پتا نہیں وہ بہت عجیب سی ہیں۔ روڈ سی، میں ان سے کبھی بھی ملنا نہیں چاہتی۔ ان کے سامنے نہیں جانا چاہتی، ان کی آنکھوں میں میرے لیے بہت عجیب سے تاثرات ہوتے ہیں اور پتا ہے آنی!" وہ جیسے اپنے جذبات پر بند باندھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

زینب سے تو کچھ بولا ہی نہیں گیا، بس یوں ہی اس کے نرم گداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سہلا کر رہ گئی۔

"اور آج مجھے ان کی اتنی منفی فیلنگز کا مطلب سمجھ میں آ گیا، شاید وہ بابا کو پسند نہیں کرتیں اور اسی حوالے سے وہ مجھے بھی ناپسند کرتی ہیں۔" کشف جیسے بڑا حوصلہ کر کے دل کی بات ماں سے کر رہی تھی۔

"ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا، کوئی بھی اس دنیا میں ایسا نہیں جو میری بیٹی کو ناپسند کرے۔ میری پریوں جیسی بیٹی اس دنیا کی سب سے معصوم، پیاری اور دل کش لڑکی ہے۔" زینب نے کبھی بھی اتنے واشگاف الفاظ میں اس کی ایسی تعریف نہیں کی تھی یا شاید وہ اس کی دل جوئی کرنا چاہ رہی تھی، سونیا کے رویے کی تلافی کرنا چاہ رہی تھی۔

"میرے بابا بھی مجھے ایسے ہی پسند کریں گے آنی! جیسے آپ مجھے چاہتی ہیں۔" اس کے لہجے میں حسرت بھری تڑپ تھی۔

لمحہ بھر کو زینب کچھ بول ہی نہیں سکی۔

وہ اس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے جھوٹی آس بھی نہیں دلا سکتی تھی۔ اس کا باپ اگر کبھی اسے ملے تو اس چاہت، محبت کا اظہار نہ کر سکے جس کی تڑپ کشف کے دل میں ہے تو پھر جو ٹھیس اس کے جذبات کو پہنچے گی، اس کی تلافی تو زینب کی کوئی بھی تسلی، کوئی محبت بھرا جملہ نہیں کر سکے گا۔

"ہاں بیٹا! دنیا کے سارے ماں باپ اپنی اولاد کو سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور انہیں اپنی اولاد سب سے زیادہ حسین اور پیاری لگتی ہے۔" وہ بے اختیار اس کا ماتھا چوم کر بظاہر اسے تسلی دیتی ہوئی بولی۔

"آنی! میں ساری دنیا کے ماں باپ کی نہیں، اپنے بابا کی بات کر رہی ہوں۔ کیا وہ بھی مجھے اتنی محبت کرتے ہیں جتنا آپ کرتی ہیں۔" اس کی سوئی اسی نقطے پر اٹکی ہوئی تھی۔

"برس ہا برس بیت گئے میری بیٹی! انسان تو دنوں میں بدلتے ہیں، یہاں تو اب سالوں کا فاصلہ ہے درمیان میں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی زینب کی آواز رندھ گئی۔

"مجھے تو اب خود بھی معلوم نہیں اس میں کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہو گی۔ وہ مجھے، تمہیں پہچانے گا بھی یا نہیں۔" وہ عجیب کھوئے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی جیسے وہ سامنا ہی کھڑا ہوا اور انہیں اجنبی نظروں سے دیکھ رہا ہو۔

"باپ ایسے تو نہیں ہوتے آنی۔" وہ زخمی سے لہجے میں بولی۔

"تمہیں سونیا نے کیا کہا۔" وہ اس کا دھیان بٹانے کو پوچھنے لگی۔

"صاف انکار کر گئیں کہ وہ بابا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں اور جتنے سالوں سے آپ کا ان سے رابطہ ختم ہوا ہے، ان کا بھی بیچ میں کبھی اپنے بھائی سے رابطہ نہیں ہوا اور یہ کہ......" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"اور یہ کہ......" زینب کچھ بے چینی سے پوچھنے لگی کہ شاید سونیا کو کچھ تو ایسا معلوم ہو کہ اس کی آس کا ٹمٹماتا دیا بجھ نہ پائے۔

"میں آئندہ ان سے اپنے باپ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھوں ورنہ وہ مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیں گی۔" وہ ماں کی شکل دیکھتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''اور جیسے وہ پہلے مجھ سے بڑی اچھی طرح سے بات کرتی ہیں، کبھی ٹھیک سے تو انہوں نے میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا تو بات کیا کریں گی۔ دولت نے کچھ زیادہ ہی ان میں غرور پیدا کر دیا ہے۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہیں، میں تو خود ان سے بات نہیں کرنا چاہتی‘ ان سے ملنا نہیں چاہتی۔'' وہ غصے میں بھری ہوئی بولتی چلی گئی۔

''اس طرح کسی کے خلاف پیٹھ پیچھے بات کرنا غیبت کہلاتا ہے۔'' زینب نے اٹھتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔

''ہو غیبت، چغلی‘ بدخوئی کچھ بھی مگر اس سے حقیقت تو نہیں بدل جاسکتی ناں۔ مرمر کے محل میں رہنے والی بدمزاج اکڑو ملکہ ہونہہ۔'' وہ طیش میں اونچی آواز میں ہاتھ لہرا کر بولی تو زینب کو ہنسی آ گئی۔

''تمہاری پھوپھی ہے وہ ماں کے برابر۔'' زینب جتانے والے انداز میں اسے ٹوک کر بولی۔

''مائی فٹ‘ میں بھی ان کی بیٹیوں کی طرح ہوں ان کے بھائی کی بیٹی، انہیں بھی مجھ سے بات کرتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے۔'' وہ بھی ادھار رکھنے والوں میں سے نہیں تھی۔

''اچھا چھوڑو اٹھ کر عصر کی نماز پڑھ لو، وقت تنگ ہو رہا ہے پھر ٹیوشن والے ے آجائیں گے اور پلیز نماز پڑھ کر مجھے ایک کپ چائے کا تو بنا دینا سخت تھکن ہو رہی ہے۔'' وہ اندر جاتے ہوئے اسے کہہ گئی۔

''خیر وہ جس بھی طرح مجھ سے بات کریں، مجھے بابا کا پتا نہ دیں مجھے پروا نہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح ان کا ایڈریس ڈھونڈ لوں گی، ملنا تو مجھے ہے ان سے‘ چاہے مجھے کوئی بھی طریقہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ میں ان کے پاس جاؤں گی۔'' اور کمرے کی دہلیز پر زینب کے قدم ٹھٹک کر رک سے گئے۔ وہ چند لمحے وہیں ساکت کھڑی رہی۔

☆☆☆

''سوری۔'' اس نے نظریں جھکا کر بغیر دیکھے سامنے تن کر کھڑی اس بیٹی کو دیکھا۔ جس کے پیدا ہونے پر کئی دن اسے مارے خوشی کے نیند نہیں آئی تھی۔

وہ اسے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دیکھتا تھا۔

پھر بھی بے یقین سا ہو جاتا، چہرہ اس کے سینے پر رکھ کر اس کی دھڑکیں سنتا، اس کی آنکھیں کھلنے کے انتظار میں وہ گھنٹوں اس کے چہرے کو نظریں جما کر دیکھتا رہتا۔

جس بھی شاپنگ مال میں اپنے لیے خریداری کرنے جاتا‘ اسے اپنے بجائے اس کے سائز کے کپڑے لبھاتے اور وہ اکثر اپنی شاپنگ بھول جاتا اور صرف ایمان کے کپڑے ڈھیروں میں اٹھا کر لے آتا۔ زریں اس کی دیوانگی پر ان دنوں کتنا چڑا کرتی تھی۔ مگر ایما کے معاملے میں وہ کسی کی بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔

اپنی بساط سے بڑھ کر مہنگے اسکول میں اس کا ایڈمیشن کرایا، ہر وہ کھلونا، ہر وہ چیز جس پر وہ اپنی انگلی رکھ دیتی، میرو کے لیے اسے خریدنا فرض ہو جاتا اور وہ یہ فرض اپنی جان پر کھیل کر بھی نبھاتا تھا۔

کل کی رات سے پہلے تک ایمان ہی اس کی توجہ کا سب سے بڑا نکتہ تھی جس کی خوشی کے لیے وہ کچھ بھی کبھی بھی کسی بھی قیمت پر کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔

کل رات......

ایک تاریک کالی آسمان سے خالی رات جو اس نے حوالات کے سیل میں گزاری۔ اس رات میں اور پہلے گزری راتوں میں اس کی سوچ ایک ہی تھی ''ایمان''۔

وہ آج تک جو کچھ کرتا آیا صرف اس کی خوشی کے لیے اور کل رات سے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس کی وجہ بھی ایمان تھی۔ وہ رات بھر اس تنگ گھٹے سیلن زدہ سیل میں خود کو بار بار یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ اگر یہاں ہے تو صرف اس بیٹی کی وجہ سے جو اس کے لیے واقعی ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔

مگر اس کا دل، ضدی اور بے ایمان دل یہ بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں اس گھٹن زدہ سیل میں ایمان کی وجہ سے قید ہے۔ زریں نے شرمندہ نظروں سے اسے دیکھا، ان کے وکیل نے پیپرز میں دو جگہ اس سے دستخط کروائے، اس نے بغیر دیکھے، بغیر پڑھے، سمجھے جہاں سائن کی ضرورت تھی بے چوں چرا کر دیے۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اسے اب کچھ نہیں سوچنا۔ قاعدے کی کارروائی میں مزید بیس منٹ لگے اس دوران وہ اپنی نظریں اپنے جوتوں پر جمائے بیٹھا رہا تھا۔ اس کی طرف کون کون دیکھ رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے۔ اسے کسی بھی بات کی پروا نہیں تھی۔

اسے لگ رہا تھا، جیسے اس کی سماعت بری طرح سے متاثر ہوگئی ہے، آوازیں بھنبھناہٹ کی شکل میں اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرا ضرور رہی تھیں مگر ان کا مطلب مفہوم اسے قطعاً سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور اس کے دل میں سمجھنے کی خواہش بھی نہیں تھی اور خواہش تو جیسے دل میں مر چکی تھی۔ اس کے دل میں کسی بھی چیز کی خواہش نہیں بچی تھی۔ شاید زندہ رہنے کی بھی نہیں۔

وہ کل سے رونا چاہ رہا تھا مگر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آنسو نہیں نکل سکے تھے۔ کل رات چونکہ حوالات کے اس سیل میں فراغت بہت تھی تو اسے بہت کچھ پچھلا بھولا بسرا۔۔۔ ماضی بار بار انگلی پکڑ کر اسے اپنی طرف بلاتا رہا تھا۔

وہ آنکھیں چرا کر کچھ اور سوچنا شروع کرتا تو وہ ماضی کسی کمینے، ڈھیٹ، قرض خواہ کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے پھر سے ناچنے لگتا۔ وہ اس بلاوجہ کی جدوجہد سے اکتا گیا۔

وہ سونا چاہتا تھا، گہری بے خبر نیند۔

جس میں نہ کوئی خواب ہو، نہ کوئی جستجو اور نہ سو کر اٹھنے کی خواہش۔ بس نیند ہو جسے اوڑھ کر وہ سو جائے۔

بالکل ویسے جیسے وہ بچپن میں اماں کے بازو پر سر رکھے گہری مدہوشی کی نیند سو جایا کرتا تھا۔

''اماں'' اور اس کے سارے گریز اس کی ساری کوششیں دم توڑ گئیں، ایک ماں کے خیال نے ہی اس گھٹن زدہ کوٹھڑی کو یک دم محبت کی خوشبو سے اور ماں کی گرمی سے بھر دیا اور وہ ماضی کی لہروں پر ہچکو لے لیتا ماں کے بازو کو تکیہ بنائے جانے کب بے آواز آنسوؤں سے روتا نیند کے دریا میں اتر گیا تھا۔ بہت سالوں بعد وہ ایسی پرسکون میٹھی نیند سو سکا تھا۔ جس میں کچھ بھی کھونے کا ڈر نہیں تھا۔

''چلو ناں میرو اٹھ جاؤ۔'' زریں نے نرمی سے اس کا بازو پکڑتے ہوئے آہستہ سے اس پر جھک کر سرگوشی کی تھی۔ اس نے اپنی نظروں سے اس سال خوردہ عورت کو دیکھا جو کبھی کسی زمانے میں واقعی موم کی گڑیا تھی اور اب......

''اٹھو ناں۔'' وہ پھر سے مصر ہوئی۔

''لگتا ہے ڈیڈ کو یہ جگہ کچھ زیادہ ہی پسند آگئی ہے تو مام انہیں یہیں رہنے دیتے ہیں نا۔'' ایمان انجوائے کرتے ہوئے جیسے ٹھٹھا لگا کر بولی۔ زریں نے اسے ناگوار نظروں سے گھورا اور میرو تو اسے دیکھ بھی نہیں سکا۔

اس سارے عرصے میں اس نے واقعی ایمان کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے نہ اس پر غصہ تھا، نہ ناگواری، نہ نفرت، نہ انتقام۔ یوں جیسے یہ بڑی عام سی بات ہو کہ اس کی بیٹی پولیس کو شکایت لگا کر اس کو جیل پہلے بھی بھجواتی رہی ہو۔ وہ سر جھکا کر زری کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔

باہر آزاد فضا، نیلا صاف شفاف کھلا آسمان روشن ان سڑکوں پر لوگوں کی بھاگ دوڑ ٹریفک، زندگی، سب کچھ...... مگر اب ان سب کچھ کے معنی میرو کے لیے ایک ہی رات میں بدل چکے تھے۔

وہ دکھی نہیں تھا، وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی ایما ڈرائیو کر رہی تھی اور وہ بڑی فرصت سے

باہر بھاگتے دوڑتے نظاروں کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ یہ زرین کو لگا تھا ورنہ وہ تو کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا بس دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ پہلی بار گھر سے باہر کی دنیا دیکھتا ہو۔

☆☆☆

''کیا، گھر آ گئی ہے۔'' آزر کو جیسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا تھا سونیا سے فون پر سن کر۔

وہ اسے پاگلوں کی طرح ہوٹل میں اس کے آفس سڑکوں پر کہاں کہاں نہیں ڈھونڈ آیا تھا اور اب ہار کر اس نے گھر سونیا کو کال کی تھی اور اس نے بتایا کہ ردا گھر آ چکی ہے۔

اس کا طیش کے مارے جسم کانپنے لگا مگر مزید کچھ کہے بغیر اس نے فون کاٹ دیا۔ وہ غصے میں گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے کمرے کی طرف بڑھا مگر سونیا اس کی راہ میں آ گئی۔

''ہٹو آگے سے مجھے بات کرنے دو، اس نے جو حرکت آج کی ہے، جس ایٹی ٹیوڈ کا مظاہرہ کیا ہے میں اسے معاف نہیں کروں گا۔'' وہ کبھی ایسے طیش میں نہیں آیا تھا۔

''بہت ڈسٹرب ہے وہ آزر! اس وقت پلیز اس سے بات نہیں کریں۔ کچھ نہ کہیں اسے، میں منت کرتی ہوں آپ کی۔'' وہ روہانسی ہو کر اس کا بازو کھینچ کر بولی۔ آزر کو اور بھی غصہ آ گیا۔

''کیا چاہتی ہو تم، ہماری عزت خاک میں مل جائے تو بات کروں میں اس سے۔'' وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔

''کیوں تماشا بنا رہے ہیں، اماں جان کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو ہم دونوں کی شامت آ جائے گی۔ میری تربیت پہ سوال اٹھے گا اور آپ کی برداشت کا اور جو انہیں پتا چل گیا کہ ردا کسی کو پسند کرتی ہے۔'' وہ رک رک کر اسے سمجھانے، ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جانتے ہیں نا اماں جان کو عشق محبت پیار اور یہ آنکھ مٹکے جیسی چیزوں سے کتنی شدید نفرت ہے۔ وہ ہمیں تو جو ذلیل کریں گی، ردا کو ساری زندگی معاف نہیں کریں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے وہ یہ رشتہ بھی ختم کریں۔ آپ ان کی ضد سے واقف تو ہیں آزر۔''

وہ کھول کھول کر آزر کو اس کی ماں کی فطرت کے سارے زاویے بیان کر رہی تھی اور وہ بے دم سا ہوتا جا رہا تھا۔

پہلا آنکھ مٹکا، اسے یاد ہے اس نے کالج میں جاتے ہی فرسٹ ایئر میں لگایا تھا اور اماں جان کو پتا چل گیا تھا پھر اس کے ساتھ جو ہوا تھا، وہ آج تک نہیں بھولا تھا اور نہ اماں نے اسے بھولنے دیا تھا۔ وہ دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا۔

''مگر اس نے جس طرح مجھے آج پاگل کیا ہے، بغیر بتائے یہ وہاں سے اٹھ کر گئی ہے یہ اسے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔'' آزر کو پھر سے سوچ کر غصہ آنے لگا پھر سے بھڑک اٹھا۔

''شکر کریں وہ گھر آ گئی ہے اگر اس جذباتی پن میں وہ کہیں اور خدانخواستہ چلی جاتی تو سوچیں کیا ہوتا پھر۔''

وہ اسے آئینے کا ایک دوسرا رخ دکھا کر بولی تو وہ بالکل ہی چپ ہو کر رہ گیا۔

یہی بات تو سارا وقت اسے ہولاتی رہی تھی کہ اگر وہ کہیں چلی گئی، اس لڑکے کے ساتھ تو وہ دنیا کو کیا منہ دکھائے گا۔

''کچھ بتایا اس نے تمہیں۔'' وہ کچھ دیر بعد محتاط انداز میں بولا۔ سونیا گہرا سانس لے کر نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ آزر بے چین سا ہو گیا۔

''اس کے دل میں کیا ہے، یہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔'' وہ بے چینی سے بول کر اٹھنے لگا۔

”اگر اس کے دل میں خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی آزر! تو وہ کبھی گھر واپس نہیں آتی۔“ سونیا کے لہجے میں سکون تھا۔

آزر نے اسے چونک کے دیکھا۔

”تمہیں کچھ بتایا ہے اس نے۔“ وہ پھر سے بے چین ہوگیا۔

”نہیں۔ اماں جان کے پاس سیدھی گئی تھی، گھر آتے ہی میں، اماں کی چائے لے کر گئی تو اٹھ کر جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئی کہ وہ آرام کرنا چاہتی ہے۔ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے، اس کے جانے کے بعد اماں جان مجھ سے شادی کی تیاریوں کی باتیں کرنے لگیں تو میرا خیال ہے، ردا نے ضرور ان سے کوئی مثبت بات کی ہوگی کیونکہ اماں جان بہت مطمئن تھیں۔“ سونیا بول کر خاموش ہوگئی۔ آزر بھی کچھ سوچنے لگا۔

☆☆☆

سفر نے اسے تھکا سا دیا تھا۔

کہیں بھی جانے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا مگر کسی کی خلوص بھری دعوت تھکن کے باوجود اسے چلنے پر اکساتی رہی۔

سفر اتنا طویل نہیں تھا جتنا وہ راستے میں بھٹکا تھا۔ کئی جگہ پر گاڑی روک کر اسے رستے کی سمت درست کرنا پڑی۔ اس میں بہت وقت لگ گیا۔

مارے بندھے تیار ہو کر وہ گاڑی میں بیٹھا تو خیال آیا پہلی بار کسی کے گھر دعوت پر جا رہا ہے اور وہ بھی خالی ہاتھ۔

شاپنگ میں نہ اس کو دلچسپی تھی، نہ اسے کچھ خاص تجربہ تھا۔ پھر اگر کچھ لے کر جانا تھا تو اسے یہ بھی خیال تھا کہ اس گھر میں شاید صرف خواتین ہی ہیں اور خواتین کے لیے کیا خریدا جائے وہ بھی ان کے مزاج کے مطابق۔

کافی دیر سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر اس نے راستے میں رک کر مٹھائی، پھل اور پھول لینے پر ہی اکتفا کیا۔

شہر میں ٹریفک کا دباؤ شام کے وقت جتنا زیادہ ہو سکتا تھا وہ تھا، اس کے علاوہ اندرون شہر کے رستے تو جیسے ہجوم سے اٹے ہوئے تھے۔ سر کے ساتھ سر ملا ہوا تھا، لوگ یوں جڑ کر ساتھ جاتے، گپیں مارتے، رستے گھیرتے جیسے اس راستے پر صرف ان ہی کا حق ہے۔

ہارن بجانا اسے سخت برا لگتا تھا مگر اس وقت اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”میرے خیال میں یہیں کہیں کوئی جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کرلو، اس سے زیادہ آگے نہیں جائے گی گاڑی۔“ اندھا دھند رش اور چیونٹی کی رفتار سے چلتی گاڑی کچھ اور بھی بے زار کر رہی تھی۔

”یہاں کا سب سے بڑا ایشو ہی پارکنگ ہے۔“ ڈرائیور چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس سے بھی زیادہ بے زاری سے بولا۔

ایک ذرا سی کھلی جگہ دیکھ کر اس نے گاڑی رکوا کر سامان اتروایا اور پیدل ہی زینب کے گھر کی طرف چل پڑا۔

اردگرد روشنیاں، آوازیں، زندگی کی چہل پہل کچھ ایسے منہ زور انداز میں تھی کہ صرف پون کلومیٹر کا راستہ جیسے میلوں لمبا ہوگیا۔

مگر اسے پیدل چلتے ہوئے وہ غصہ اور اکتاہٹ محسوس نہ ہوئی جو گاڑی میں اسے بے زار کر رہی تھی بلکہ جیسے اس کی طبیعت ایک دم سے تروتازہ ہوگئی۔ اردگرد کی رونق نے دوپہر جو قبرستان میں اس خواب کی پرچھائیں کا پیچھا کرتے گزری تھی، اس کی پژمردگی دور کردی۔

ڈرائیور اسے سامان کے ساتھ گھر کے پاس چھوڑ کر گاڑی کی طرف واپس چلا گیا۔
دروازہ کشف نے کھولا تھا اور اس کے چہرے پر کچھ زیادہ خوش گواری کے تاثرات نہیں تھے اسے دیکھ کر۔
وہ عام سے پرانے فرنیچر سے مزین دالان تھا، کمرے میں اسے چھوڑ کر وہ خود باہر نکل گئی۔
''آنی نماز پڑھ رہی ہیں، ابھی کچھ دیر میں آتی ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا۔'' لٹھ مار انداز میں کہہ کر وہ غڑاپ سے پھر جانے لگی۔
''پلیز۔ ایک گلاس سادہ پانی مل جائے گا۔'' اتنا طویل رستہ رش میں جگہ بناتے وہ واقعی شدید پیاس محسوس کر رہا تھا۔ عادت کے برخلاف کہہ گیا، کشف کچھ بھی کہے بغیر باہر چلی گئی۔
دوسرے لمحے وہ پلیٹ میں پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھ کر بغیر کوئی کلام کیے باہر نکل گئی۔
موحد کو اس کی بدتہذیبی پر غصہ تو بہت آیا مگر اس وقت وہ مہمان تھا اور کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔
سو صبر کے گھونٹ کے ساتھ پانی کے گھونٹ بھرنے لگا۔

☆☆☆

''یہ..... یہ..... دیکھو، یہ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنایا ہے۔ یہ تمہاری پسند کی ہے، مسالے والی بریانی، یہ پالک پنیر، گوشت اور یہ.....'' زریں خوشامدی انداز میں میز پر پڑے ڈونگوں میں سے ایک ایک کا ڈھکن اتار کر اس کو دکھاتے ہوئے جوش سے کہہ رہی تھی۔
میرو کے چہرے کے تاثرات سپاٹ تھے۔
ایما مزے سے میز کے دوسرے کنارے پر بیٹھی سلاد ٹونگتی کباب کو کانٹے کے ساتھ کاٹتی، بیچ بیچ میں بریانی کا چمچ لیتی کچھ شوخ نظروں سے باپ کی طرف بھی دیکھتی تھی۔ جس نے اس تمام عرصے میں اسے ایک بار بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔
''مام! آج میرا ڈنر باہر ہے، میرے لیے کھانا مت بنایئے گا۔'' اس نے زریں کو متوجہ کیا جو مسلسل اپنی ساری توجہ صرف اپنے شوہر پر مبذول کیے ہوئے تھی۔ ایمان زریں کی طرف سے اب کسی سخت جملے کی منتظر تھی۔
''یہ چٹنی بھی ناں میرو میں نے تمہارے لیے بنائی ہے خاص طور پر۔'' وہ ایما کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے اسی خوشامدی انداز میں بولی۔
''یہ کیا ورلڈ کپ جیت کر آئے ہیں یا آسکر، جو آپ اس طرح ان کے سامنے بچھی جا رہی ہیں۔'' ایما کی برداشت بس یہیں تک تھی۔
زریں نے ناگوار نظروں سے اسے دیکھا۔
''تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟'' وہ کوفت سے اسے سرسری نظر سے دیکھ کر بولی تھی، منصور نے اتنا بھی ایمان کی طرف نہیں دیکھا۔
''اگر آپ نے سب کچھ خاص طور پر ان کے لیے بنایا ہے تو میں پھر فالتو میں یہاں بیٹھی ہوں کسی بھوکی کتیا کی طرح، جس کے آگے آپ ان کی پسند کا بچا کھچا ڈال رہی ہیں۔'' اسے شدید توہین کا احساس ہوا تھا جس طرح زریں ساری توجہ صرف میرو کو دے رہی تھی۔
''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' زریں نے یوں سرسری لہجے میں کہا جیسے اسے ایما کے غصے کی بھی پروا نہیں۔
''آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ صرف مجھے زچ کرنے کے لیے سب کچھ ان ہی کی پسند کا بناتی ہیں۔ جیسے میں اس فیملی کا حصہ ہی نہیں ہوں۔'' وہ میز پر مکا مار کر بولی تو میز پر پڑے سارے کانچ کے برتن ایک ساتھ بج اٹھے تھے۔

زرین کے چہرے پر شدید ناگواری تھی۔
"اگر تمہیں ایسا لگتا ہے کہ تم اس گھر میں فیملی کا حصہ نہیں ہو تو میں اس معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں کیونکہ یہ تو تمہاری اپنی سوچ ہے اور کسی کی سوچ کو تو نہیں بدلا جا سکتا ناں۔" ایما کو یوں لگا جیسے زرین نے دونوں جوتے اتار کر اس کے منہ پر مارے ہوں۔
"انف از انف۔" وہ زور سے چلائی۔
"زرین! میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں پلیز۔" وہ نیپکن سے منہ صاف کرتا ایما کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اندر بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔
زرین نے اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا کر اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔
ایما نے غصے میں ہاتھ میں پکڑا شیشے کا گلاس دیوار پر دے مارا اور تن فن کرتی وہاں سے چلی گئی۔
زرین کے چہرے پر شدید غصہ تھا، سارے کمرے میں کانچ بکھرے تھے وہ گہرا سانس لے کر بے بسی سے کھانا کھانے لگی۔

☆☆☆

موحد نے بہت سارے مہینوں کے بعد اتنا لذیذ گھر کا کھانا کھایا تھا۔ پہلے وہ جھجکا مگر پھر کھانے کے ذائقے نے اسے ساری فارملیٹی پس پشت ڈالنے پر مجبور کر دیا۔
"مجھے لگتا ہے، آپ کو کھانا پسند نہیں آیا۔" زینب اس کو ہاتھ کھینچتے دیکھ کر کچھ تاسف سے بولی۔
"ارے نہیں۔ پلیز، مجھے شرمندہ نہیں کریں۔ میں نے واقعی اپنی بھوک سے بہت زیادہ کھا لیا ہے۔ رئیلی اتنے زمانوں کے بعد اتنا لذیذ کھانا...... میں واقعی بہت کھا گیا ہوں۔" وہ ہنس کر بولا۔
"آنی! یہ غلط نہیں کہہ رہے حالانکہ کھانا نکالتے ہوئے میں سوچ رہی تھی، کل کا دن اور پرسوں دوپہر تک جو کھانا بچے گا ہمارے لیے بآسانی چل جائے گا مگر افسوس۔ یہ دیکھیں بامشکل کل ناشتے کے لیے کا بچا ہے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ڈاکٹرز اتنا کھاتے ہیں۔" کشف جب بولنے پر آتی ہے تو پھر آگا پیچھا نہیں دیکھتی۔ زینب غلط نہیں کہتی تھی۔
"کشف۔" وہ اسے غصے سے گھورنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔
"اوہ سوری، مجھے واقعی کھاتے ہوئے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ میں بہت کھا گیا ہوں۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔
"کشف۔" زینب کا بس نہیں چل رہا تھا۔
"موحد! یہ مذاق کر رہی ہے اس کی عادت ہے اس طرح مذاق کرنا۔" وہ شرمندگی میں یہی بول سکی۔
"ارے میں کیوں مذاق کروں گی۔" وہ تیز لہجے میں بولی اور اٹھ کر کچن میں جا کر آواز لگاتے ہوئے بولی۔
"آنی! یہاں آ کر دیکھ لیں بے شک، ساری دیگچیاں خالی ہیں۔
ایک تو آپ نے پورے مہینے کا بجٹ خراب کر دیا، اتنی شاہی دعوت کر کے۔ اس سے تو اچھا تھا آپ ان کی فیس ادا کر دیتیں۔" وہ بولتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی، زینب تو جیسے پتھر کی ہو گئی۔
موحد کو ایک بار پھر پہلے دن کی طرح اپنی پوزیشن بہت آکورڈ لگ رہی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا بولے کیا کہے۔
"میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سنجیدہ لہجے میں بولا۔
زینب سر جھکا کر خاموش بیٹھی رہی، وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ وہ اٹھتے اٹھتے جیسے پھر سے بیٹھ گیا۔

زینب سر جھکائے بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

☆☆☆

''ردا۔'' وہ زور سے اس کے کان میں چیخا تھا۔ اس نے فون لمحہ بھر کے لیے کان سے ہٹا لیا۔

چند لمحے اور دل کو مضبوط کرنے کے لیے مل گئے۔

''یہ کھیل ہے تم امیر زادیوں کے نزدیک جب چاہا جس سے چاہا کھیل لیا۔ جی بھر گیا تو ٹھوکر مار دی۔'' وہ اونچا اونچا بول رہا تھا۔

''تم جانتے ہو، میں ایسی نہیں ہوں۔'' وہ بامشکل ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کے آنسو خاموشی سے بہنے لگے تھے۔

''تم ایسی ہی ہو بلکہ تم نے جانتے بوجھتے صرف میرا مذاق اڑانے کے لیے میری کم مائیگی کی توہین کرنے کے لیے یہ کھیل کھیلا اور آج اپنے باپ کے سامنے مجھے یوں ذلیل کروایا۔'' تیز تیز بولتے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''پلیز جبران! مجھے غلط نہیں سمجھو۔'' وہ رندھی آواز میں بامشکل بولی۔

''میں تمہیں صحیح ہی تو سمجھا ہوں۔ پہلے دن سے تم جانتی تھیں نا جو تمہاری اور میری کلاس میں فرق تھا جو تم تھیں جو میں تھا اور اپنے گھر کے...... گھر والوں کے مزاج کو بھی جانتی تھیں کہ وہ دولت کے غرور میں کیسے اندھے ہیں۔ انہیں نہ انسانوں کی پہچان ہے نہ انسانیت کی پھر بھی تم نے مجھ سے جھوٹی محبت جتائی اور مجھے...... مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' وہ بری طرح سے ٹوٹا تھا۔

ٹوٹ تو وہ بھی گئی تھی مگر شام سے کوشش کر کے خود کو جوڑ رہی تھی کہ اگر وہ ٹوٹ گئی تو اس کے ساتھ جڑے اس کے ماں باپ کا بھرم، ان کا بھروسا سب کچھ چکنا چور ہو جائے گا۔

''پلیز اس طرح مت کرو، ورنہ......'' وہ بے بسی سے یہی کہہ سکی۔

''سنو ردا! پلیز میری بات مان لو۔ تم رہ سکتی ہو میرے بغیر۔ نہیں ناں...... میں بھی نہیں رہ سکتا۔ تم سے دور، تم سے الگ۔'' وہ بے بسی میں عجیب بے ربط جملے بولے جا رہا تھا۔

''نہیں رہ سکتی جبران! مگر مجھے، تمہیں رہنا پڑے گا۔'' وہ دل پر پتھر رکھ کر اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''جھوٹ، بکواس...... تم صرف مجھے بہلانے کو یہ ڈائیلاگ بول رہی ہو۔ میں جانتا ہوں ورنہ تو تمہیں پہلے دن سے معلوم تھا کہ تم نے کسی دن اپنا راستہ بدل لینا ہے۔ صرف اتنے دن تم میرے جذبات کا مذاق اڑاتی رہیں، مزے لیتی رہیں۔'' وہ پھر سے بھڑک اٹھا۔

''پلیز، خدا کے لیے اس طرح کی باتیں نہیں کرو۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''اچھا نہیں کرتا او کے۔ تم سچی، تمہاری محبت سچی۔ میں...... میرے الفاظ، انداز، گمان سب جھوٹے۔'' وہ پھر اسی بے ربطی سے بولنے لگا۔

''اب تم خود کو سچا ثابت کرو۔ کرو گی ناں۔'' وہ اب جانے کیا کہنے جا رہا تھا، ردا چونک گئی۔

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ ڈر بھی گئی تھی۔

''کل صبح گیارہ بجے میں تمہارا یونیورسٹی کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے باہر انتظار کروں گا۔ اگر تم نہیں آئیں بارہ بجے تک تو میں یہی سمجھوں گا کہ ایک امیر زادی نے میرے دل کو کھلونا سمجھا تھا اور بس۔'' اس کا جواب سنے بغیر وہ فون بند کر چکا تھا۔

''کیوں کر رہے ہو مجھے کمزور۔'' وہ بے بسی سے رو پڑی۔ ''میں جانتی ہوں، میں کس طرح اس پل صراط

سے گزر کر آئی ہوں اور تم پھر سے مجھے ان ہی راہوں کی طرف بلا رہے ہو جہاں ایک بار میں نے قدم ڈال دیے تو پھر میری واپسی وہاں سے نہیں ہو سکے گی۔"
وہ تکیوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

☆☆☆

"بہت اکیلی، بہت تنہا ہے میری بیٹی، خوشی، غم، حیرت کسی بھی جذبے کا اظہار اسے ڈھنگ سے نہیں کرنا آتا۔ پھر بے انت لوگوں کے اس شہر میں اس نے میرے رشتوں کے سوا اور کسی کو اپنے قریب دیکھا ہے نہ کسی کو مخلص پایا۔ اسے لوگوں سے برتاؤ کرنا بھی نہیں آتا۔"
زینب تھکے تھکے لہجے میں دور اندھیرے آسمان پر چمکتے روشن ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ موحد کو چھوڑنے باہر تک آئی تھی، وہاں سے اندرونی گلیوں کے رستے وہ کسی پرانی سال خوردہ ویران عمارت کے کھنڈر کی سیڑھیوں میں تھک کر بیٹھ گئی تھی۔
آہستہ آہستہ بولتی جیسے وہ موحد کے وجود کو فراموش کر کے خود سے باتیں کر رہی تھی۔
"میں سمجھ سکتا ہوں آپ کی بیٹی کی فیلنگز بھی اور آپ کی پریشانی بھی۔" وہ یہی کہہ سکتا تھا سو آہستگی سے بولا۔
"اس کی فیلنگز کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا شاید میں بھی نہیں۔ اتنے سال اسے اپنی محبت کی گرم چھاؤں میں بٹھاتے میں بھول ہی گئی کہ اسے کسی اور کی محبت کی بھی طلب ہو سکتی ہے میری محبت کے علاوہ۔"
وہ پھر خود کلامی کی حالت میں تھی۔
موحد کا فون بجنے لگا تو زینب بے اختیار چونک اٹھی۔
"سوری۔ میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا، یہ اس طرف مڑ کر آپ کی گاڑی ہوگی۔" وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔
"ارے نہیں۔ بلکہ مجھے تو سچ میں بہت خوشی ملی ہے آپ سے مل کر اگر میں آپ سے نہیں ملتا تو شاید زمانہ کا سب سے محروم شخص ہوتا۔ آپ کی محبت میں، میں نے ماں جیسی مٹھاس دیکھی ہے اور پلیز، آپ بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوں، میں نے کچھ بھی نہیں سوچا، کچھ بھی مائنڈ نہیں کیا۔"
وہ نرمی سے اسے دیکھ کر مروت سے کہہ رہا تھا۔
زینب شرمندہ سی اس کے گال کو نرمی سے چھو کر رہ گئی۔
"بیٹا! آپ کی تربیت کسی بہت ہی نیک محبت کرنے والی ماں نے کی ہے، اللہ کرے میں آپ کی والدہ سے ضرور ملوں اور انہیں ایسے پیارے، سعادت مند بیٹے کی ماں ہونے پر مبارک باد ضرور دوں۔" وہ اپنی شرمندگی اب ان ہی لفظوں سے کم کر سکتی تھی۔
"میں آپ کا بھی بیٹا ہوں اور پلیز آپ مجھے آپ نہ کہا کریں بلکہ مجھے اجازت دیں، میں آپ کو کشف کی طرح آنی کہوں۔ کیا مجھے اس کی اجازت دیں گی آپ آنی۔" وہ اس طرح بے ساختہ بولا کہ زینب نے اس کو دیکھ کر رونا شروع کر دیا، وہ اسے نرمی سے تھپکنے لگا۔

☆☆☆

اور وہ یوں اپنے بے اختیار رونے پر خود کو رات بھر ملامت کرتی رہی۔ وہ کوئی ٹین ایج تو نہیں تھی جو اس اجنبی، اگر تھوڑا آشنا بھی تھا تو بھی اسے یوں اس کے سامنے نہیں رونا چاہیے تھا۔
عمر بھر جن آنسوؤں پر اس کا کنٹرول رہا، وہ کس لمحے اس کے ہاتھ سے پھسل گیا یہ کمزور لمحے، انسان کے

لیے سب سے خوف ناک ثابت ہوتے ہیں۔ کاش وہ اس کے ساتھ نہ جاتی بلکہ کاش وہ اسے دعوت پر گھر ہی نہیں بلاتی۔ اتنے سارے کاش تھے جو رات بھر اس کے بستر پر کانٹوں کی طرح چبھتے رہے۔

جانے کیوں اس گھڑی سے وہ موحد کی موجودگی میں کتنا اپنا پن، کتنا تحفظ محسوس کرتی رہی تھی، جس احساس کو وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی، آج اس بے نام احساس نے اس کے آنسوؤں کو بے قابو کر دیا۔

وہ خود سے روٹھ گئی، ناراض ہو گئی خود اپنے آپ سے...... اور ناراض تو وہ کشف سے بھی بہت زیادہ تھی جس نے اس سے بات نہیں کی۔ کچن سمیٹا...... عشاء کی نماز پڑھی تسبیح لے کر کروٹ بدلی اور سوتی بن گئی۔

وہ بس کچھ شرمندہ شرمندہ سی...... یا شاید نہیں یہ بھی اس کا وہم ہو گا وہ اس سے کچھ بولی نہیں تھی۔

زینب نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔

وہ صبح جلدی اٹھ گئی۔ یونیورسٹی کے لیے تیار ہو رہی تھی، جب زینب نے عجلت میں بغیر ناشتہ کیے باہر کی طرف جاتے ہوئے رک کر کچھ سوچا۔

بیگ سے ایک چھوٹا سا کارڈ نکال کر کشف کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''تم موحد سے جا کر ایکسکیوز نہیں کرو گی آج تو میں تم سے بھی بات نہیں کروں گی اور مجھے قسم کھانے کے لیے مجبور نہیں کرنا کہ میں اپنے وعدوں پر قائم رہنے کو اپنی زندگی سے بڑھ کر سمجھتی ہوں۔''

وہ کھردرے لہجے میں کہہ کر کشف کی طرف دیکھے بغیر جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے نکل بھی گئی۔

کشف جو رات بھر کچھ شرم سار سی رہی تھی کہ اسے موحد کا نہیں تو آنی کے احساسات کا خیال کرتے ہوئے بہر حال ایسی بدتمیزی کا اتنے برے میزبان کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اور اب زینب کی سخت بات پر...... اتنی سخت سزا پر اس کو غصہ آنے لگا کہ اسے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ معلوم نہیں اس موحد نے کیا جادو کیا ہے آنی پر، وہ اس کے آگے یوں بچھ بچھ جاتی ہیں، جیسے دنیا میں اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی بھی نہیں، کشف بھی نہیں۔

''میری جاتی ہے جوتی اس سے ایکسکیوز کرنے۔'' وہ غصے میں برش پٹخ کر بالوں کو کیچر میں جکڑتی، سینڈل پیروں میں کستی، دوپٹہ شانے پر ڈالے، آخری نظر خود کو آئینے میں دیکھتی رک سی گئی۔

کچھ سوچ کر اس نے کارڈ اٹھایا، یوں ہی پڑھتی رہی۔ دوسرے لمحے اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

''واؤ! یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

کسی سوچ نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی، اس نے کارڈ اپنے پرس میں رکھا اور پرس بیگ میں رکھ کر فون اٹھاتی تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''ردا! یہ تم سچ کہہ رہی ہو ناں۔'' سونیا کے چہرے پر شادیٔ مرگ کی کیفیت تھی۔

''اب کیا اس معاملے میں بھی کچھ غلط کہوں گی۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لہجے کو تلخ بنانے سے نہیں روک سکی تھی۔

''تو تم تیار کس لیے ہو رہی ہو۔'' اسے روزانہ کی طرح تک سک سے تیار ہوتے دیکھ کر سونیا نے چونک کر پوچھا۔

''مما! کیا گھر بیٹھے میں، ریزائن کر دوں گی۔ یہ مہینہ ختم ہونے میں چند ہی دن ہیں اب۔ میں اتنے دن تو

آفس جا ہی سکتی ہوں یا ابھی سے مایوں بیٹھ جاؤں۔'' وہ روکھے پن سے بولی۔
سونیا نے آگے بڑھ کر بے ساختہ اسے پیار کیا۔

''میری بیٹی! میری جان! میرا دل کہتا ہے تم بہت خوش، بہت شاد ماں زندگی گزارو گی سلیمان کے ساتھ۔ وہ بہت اچھا، بہت سمجھ دار پڑھا لکھا محبت کرنے والا۔''

''مما! مجھے دیر ہو رہی ہے، آپ پاپا کو بتا دیجیے گا۔ میں واپسی پرانی گاڑی ورکشاپ سے لے لوں گی۔'' وہ ماں کے لگاوٹ بھرے انداز پر بے زاری چھپا کر تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

''تو اب تم کیسے جاؤ گی آفس، تمہارے پاپا ڈراپ کر دیں گے ناں تمہیں۔'' وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے فکر مندی سے بولی۔

''میں نے کریم منگوالی ہے، اس پر جا رہی ہوں۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئی، سونیا نے زیر لب کچھ پڑھ کر اسے پیچھے سے پھونکا تھا۔

لینڈ لائن بج رہا تھا۔

''یہ اس وقت کس کا فون آ گیا۔'' وہ کوفت میں آگے بڑھ کر ریسیور اٹھاتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ہیلو!'' وہ عجلت بھرے انداز میں بولی، آزر اٹھ چکے تھے۔ سونیا کو کچن میں جا کر ناشتا دبنانا تھا۔

دوسری طرف لمحہ بھر خاموش رہی۔

''ہیلو کون ہے بھئی، بات نہیں کرنی تو فون کس لیے کیا تھا۔'' وہ کہہ کر جھلا کر فون بند کرنے لگی۔

''سونیا! میں ہوں میرو۔'' گمبھیر بھاری آواز نے سونیا پر جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی انڈیل دی ہو، وہ ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

''کہاں...... کہاں جا رہے ہیں ہم جبران!'' ردا اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بولی۔

جبران کے چہرے پر بڑی خوف ناک سنجیدگی تھی۔

''پلیز بتاؤ ناں، کہاں جا رہے ہیں ہم؟'' وہ کچھ مضطرب سی ہو کر بولی۔

''کیا تمہیں ڈر ہے کوئی کہ میں تمہیں کڈنیپ کر کے لے جاؤں گا۔'' وہ گہرا سانس لے کر سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''خیر'' یہ تو تم نہیں کر سکتے، اتنا مجھے معلوم ہے۔ وہ پُر اعتماد لہجے میں سر ہلا کر بولی۔

''اتنا اعتماد ہے مجھ پر، یا خود پر۔'' وہ جتانے والے انداز میں گردن موڑ کر پوچھ رہا تھا۔

''سچ کہوں تو خود پر۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تو جبران نے بے ساختہ لب بھینچ لیے۔

گاڑی اب کچھ انجان رستوں پر جا رہی تھی۔

''کہاں جا رہے ہیں ہم جبران؟'' وہ کچھ گھبرا گئی۔

''ڈونٹ وری، خود پر اعتماد رکھو۔'' اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ ردا خوف زدہ ہو گئی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

حمیرا نوشین



صبح صبح آئے بڑی آپا کے فون نے ہم سب بہن بھائیوں کو متحرک کر دیا تھا۔ منجھلی آپا نے مجھے فون کر کے مطلع کیا کہ دو دن بعد بڑی آپا کا نزول ہو رہا ہے سو تیاری پکڑو۔ ایک ہی شہر میں آباد سب بہن بھائیوں میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی، جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سب اپنے کام چھوڑ چھاڑ آپا کے آنے کی خوشی میں نہال

ہو گئے۔

ہر سال، ہم گھر کی الماریوں، پیٹیوں، ٹرنکوں کو آپا کی آمد پر ہی صاف کرتے۔ ہر گھر سے مختلف اشیا اور کپڑوں کے کئی تھیلے تیار ہو جاتے۔

آپا کبھی اکیلی آتیں تو کبھی ایک دو بچوں کو ساتھ لے آتیں۔ آٹھ نو گھنٹے کی مسافت پر ان کا شہر تھا اور جس علاقے میں وہ رہتی تھیں، وہ خاصا پسماندہ تھا۔ آس پاس غریب طبقہ رہتا تھا، قدرے دیہاتی ماحول تھا ان کا۔ ابا کے کسی رشتہ دار نے یہ رشتہ کروایا تھا اور انہوں نے بھی بلا سوچے سمجھے اتنی دور دیہات میں رشتہ دار خاتون کی بات پر یقین کر کے کہ شریف خاندانی لوگ ہیں، بیٹی بیاہ دی۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپا کے سسرال والے شریف اور نیک نام تھے مگر آپا کے شوہر کنجوس بہت تھے۔ اس کنجوسی کو آپا نے تو سادگی کا نام دے رکھا تھا مگر ہمیں تو وہ ہمیشہ مہا کنجوس ہی لگے۔

اچھا خاصا کماتے تھے مگر ہم نے اپنی آپا اور ان کے بچوں کو ہمیشہ عام سے لباس میں ہی دیکھا۔ کئی بار ہم نے ہنس کر طنز کیا مگر یہ طنز ہمیں بہت مہنگا پڑ جاتا، کفایت شعاری کے فوائد اور فضول خرچی کے ایسے دل دہلا دینے والے بیان سنتے کہ ہم کانوں کو ہاتھ لگا لیتے کہ ہماری توبہ۔ جو ہم ان کو آئندہ کچھ کہیں۔

وہ جب بھی میکے آتیں، ہنستی ہوئی آتیں اور روتی ہوئی جاتیں۔ یہی قلق کہ مجھے اتنی دور کیوں بیاہا، مجھ سے کیا دشمنی جو مجھے اتنی دور پھینکا۔ ابا مرحوم زندہ ہوتے تو وہی اس سوال کا جواب دے سکتے تھے۔ اماں تو چپ سادھ لیتیں۔ ہاں ان کا رونا اور پریشانی دیکھتے ہوئے اماں نے ہم سب بہن بھائیوں کو ایک ہی شہر میں بیاہا۔

کوئی موقع ہوتا ہم بہن بھائی اکٹھے ہو جاتے اور ایسے موقع پر آپا کی کمی کو بہت محسوس کرتے۔ آپا فون پر چھکوں پھکوں روتیں، ہم تسلی دیتے۔

”تم لوگ کتنے مزے کرتے ہو، آئے دن کسی نہ کسی بہن بھائی کے بچے کی سالگرہ میں اکٹھے ہو جاتے ہو یا اماں تم سب کو اپنے گھر بلا لیتی ہیں۔ خوب دعوتیں اڑاتے ہو تم لوگ۔ میں کبھی ماں کے ہاتھ کے ذائقے کو ترستی ہوں تو کبھی چھوٹی کے ہاتھ کے پائے کھانے کو کتنا دل للچاتا ہے، یہ میرا ہی دل جانتا ہے۔“ وہ رندھی آواز میں کہتیں تو ہم ان کے دکھ پر افسردہ ہو جاتے۔

بات تو ٹھیک تھی۔ ہم سب مل کر بہت انجوائے کرتے۔ بھابھی دلیم بناتیں تو نندوں کے گھر ڈونگے بھجوانا کبھی نہ بھولتیں، میں نے نہاری بنائی تو بڑے بھیا کے ہاں بھجوا دی۔ چھوٹے بھائی کو میرے ہاتھ کی فش فرائی بہت ہی پسند تھی، تو اکثر ہی بنا کر میاں کے ہاتھ روانہ کر دیتی۔

اماں کو منجھلی آپا کے ہاتھ کا پلاؤ پسند تھا تو وہ چھٹی والے دن پلاؤ بنا کر اماں کے گھر لے آتیں۔ غرض ایک ہی شہر میں رہنے کے باعث ہم ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے اور غم میں ساجھے۔ ایسے میں بڑی آپا کا دکھ سوا ہو جاتا اور ہم ان کے آنے پر ساری کسر پوری کر دیتے۔ اماں کے گھر روز جمع ہو جاتے۔ پکوان بنتے، آپا اور ہم سب کا دل کھلا کھلا رہتا۔

جو بھی بہن بھائی آپا کی دعوت کرتا تو باقی بھی سب وہیں اکٹھے ہو جاتے۔ ہنستے کھلکھلاتے ہفتہ دس دن پر لگا کر اڑ جاتے اور جب آپا کی روانگی کے ٹکٹ آ جاتے تو سب افسردہ ہو جاتے۔ ان کے شہر صرف ایک ہی ریل گاڑی جاتی تھی۔ اس کے ٹکٹ کے حصول کے لیے الگ تگ و دو کرنا پڑتی۔ صبح و شام اسٹیشن کے چکر لگائے جاتے۔ گاڑی ایک مسافر ڈھیر۔ ٹکٹس کی بکنگ ہفتہ پہلے لوگ کرا لیتے تو دوسروں کے لیے پریشانی میں اضافہ ہو جاتا۔

آپا کی پریشانی دیدنی ہوتی، آنے کی بھی خوشی اور جانے کی بھی جلدی۔

”گھر سارا تلپٹ پڑا ہوگا، ابھی بچیاں اتنی

بڑی کہاں ہوئی ہیں کہ گھر سنبھالیں، اسکول کالج سے آ کر تھک جاتی ہوں گی۔ یہ تو تم لوگوں کی محبت مجھے کھینچ لاتی ہے ورنہ اپنے سکول جاتے بچوں کو چھوڑ کر کون آتا ہے؟"

"ہمارے ساتھ ساتھ سامان کی محبت بھی کھینچ لاتی ہے۔" میری دھیرے سے کی گئی سرگوشی پر منجھلی نے میرا ہاتھ اس زور سے دبایا کہ میں سی کر کے رہ گئی۔

"کیوں ہمیں بے نقط سنوانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ ابھی شروع ہو جائیں گی۔" چھوٹی نے بھی آنکھیں نکالیں۔

وہ فون پر بچیوں کو جلدی آنے کی تسلی دیتیں۔ حالانکہ ہم جانتے تھے کہ ان کے بچوں کو کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ دولہا بھائی دال سبزی بنانے میں تو ماہر تھے۔ روز دکان سے آ کر ہانڈی چڑھا دیتے ہوں گے۔ مگر آپا کی پریشانی چہرے سے ہویدا ہی رہتی۔

بڑی بہن ہونے کے ناتے ان کا نہ صرف ہم پر رعب تھا بلکہ ہماری مجال نہ تھی کہ ہم ان کے آگے چوں چرا کر سکیں۔ ہماری کیا اماں کی بھی مجال نہ تھی کہ انہیں کسی بات پر روک ٹوک سکیں۔ وہ سب کی فکر میں ہلکان رہتیں، ایک ایک بہن بھائی کو مشورے دیتیں۔

ہم بہنوں کے سسرال میں آ کر یوں ہمارے سسرالیوں میں گھل مل جاتیں کہ جاتے وقت ہماری ساسیں بھی ان کو تحفتاً بہت کچھ دے دلا کر رخصت کرتیں۔ کتنے ہی دن ان کا تذکرہ ہمارے سسرالیوں کی زبان پر رہتا۔ کئی بار تو غصہ بھی بہت آتا کہ وہ آ کر ہماری اہمیت کم کر دیتی تھیں۔

صبح سویرے اٹھ کر نماز قرآن پڑھتیں۔ ساس سسر کو ناشتہ تک بنا کر دے دیتیں، ان کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں ان کے پرانے قصے سن کر سر دھنتیں اور پھر ساس کے سامنے ہمارے خوب لتے بھی لیتیں کہ ان کو اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے، بہوؤں سے ٹھیک طرح کام کیوں نہیں لیتیں؟

ہم بہنیں تپ جاتیں مگر خاموش رہتیں۔ بعد میں سب مل کر خوب بھڑاس نکالتیں کہ دیکھو آپا ویسے تو اپنے آپ کو بہت عقل مند گردانتی ہیں اور سسرال میں بہنوں کی خامیوں کی نشان دہی کر کے جاتی ہیں تا کہ وہ ہم پر دن رات طنز کے تیر چلایا کریں۔

☆☆☆

آپا کو اسٹیشن چھوڑنے کے لیے قافلہ تیار ہو چکا تھا۔ بڑے بھیا کی گاڑی میں آپا ان کی فیملی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ہم سب بھی اپنی اپنی سواریوں میں سوار تھے۔ گاڑیوں کی ڈگیاں سامان کے تھیلوں اور بوروں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک رکشے پر الگ سامان لدا ہوا تھا۔

"آپا یہ سب آپ اکیلی کیسے لے کر جائیں گی؟" بڑے بھیا کا یہ کہنا غضب ہو گیا۔

"سر پر اٹھا کر لے کر جاؤں گی۔" انہوں نے گھورا۔ بھیا کھسیانے سے ہو گئے۔

"عقل سٹھیا گئی ہے تمہاری۔ ٹرین میں جائے گا یہ سامان، میں نے کیا ہاتھوں میں اٹھا کر لے جانا ہے۔"

"زوار بھیا تو اس لیے کہہ رہے تھے کہ آپ اکیلی ٹرین میں کیسے اتنے سامان کا خیال کریں گی پھر اتارنے میں بھی مسئلہ ہوگا۔" منجھلی نے بھیا کا کھسیانا چہرہ دیکھ کر آپا کو وضاحت دی۔

"سب ہو جاتا ہے تم بس کسی طرح اس کو ڈبے کے اندر پہنچ دینا، باقی کام میں خود سنبھال لوں گی۔ بہت سے مسافر بڑے رحم دل ہوتے ہیں، سارا سامان سیٹ کر دیتے ہیں اور اتارنے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں، تمہارے دولہا بھائی اسٹیشن پر لینے آ جائیں گے۔"

آپا لاپروائی سے کہتی سارا سامان اپنی نگرانی میں متعلقہ ڈبے کے سامنے اکٹھا کروانے لگیں۔ گاڑی آنے سے کوئی گھنٹہ پہلے آپا اسٹیشن پر

پہنچنے کا واویلا کرتیں۔ سب کے سمجھانے کا بھی ان پر خاک اثر نہ ہوتا۔
"گاڑی میری رشتہ دار نہیں ہے جو میرے انتظار میں سوکھے گی۔" ان کی پریشانی دیکھتے ہوئے ہم وقت سے کہیں پہلے اسٹیشن پر موجود ہوتے۔
بچے اسٹیشن پر خوب مٹرگشت کرتے۔ ہم بھی بڑے شوق سے اسٹیشن کی رونق دیکھنے میں مگن ہوجاتے۔ سال میں ایک بار ہمارے لیے اسٹیشن کی یہ سیر کسی ایڈونچر سے کم نہ ہوتی۔ جب تک گاڑی نہ آتی ہم پکوڑوں بوتلوں اور الم غلم چیزوں سے اپنے پیٹ بھرتے رہتے، ساتھ ساتھ آپا کی دہائیاں بھی سنتے۔
"اس ہنی کو تو پلیٹ فارم سے دور ہی رکھو، اچانک ہی گاڑی آجاتی ہے، کوئی مسئلہ ہوگیا تو پھپھو کا نام بدنام ہوگا کہ اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا۔"
"اللہ خیر رکھے آپا! اب ایسا بھی کوئی اندھیر نہیں مچا، گاڑی آنے سے پہلے گھنٹی بجتی ہے، اعلان ہوتا ہے، پلیٹ فارم پر گاڑی کی دھمک گونجتی ہے۔" بھیا نے آپا کی بات کو ہنس کر اڑایا۔
"اچھا میرے بھائی! جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ شتر بے مہار چھوڑ دو ان بچوں کو۔ کوئی بغل میں دبوچ کر لے گیا تو مجھے کوستے رہنا ساری عمر۔" آپا کی بات پر ہم سب کی کھی کھی شروع ہوگئی۔ ان کی بے جا پریشانی اور اس قسم کی گفتگو سے ہم ایسے ہی حظ اٹھایا کرتے تھے۔
"سویرا تم نے وہ والا سوٹ رکھ دیا تھا جس کے دامن پر کڑھائی تھی۔ تم کہہ رہی تھیں ناں کہ یہ آج آخری بار ہی پہنوں گی، دل بھر گیا ہے اس سے۔"
"ہاں آپا رکھ دیا ہے، دوپٹا بھی اس کا بروشیے کا ہے جو بھی پہنے گی خوب اٹھے گا اس پر۔" میں نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی۔
"لینے والی بات تو خوب یاد رکھتی ہیں ہاں لانے والی بات پر حافظہ کمزور ہوجاتا ہے۔" میری کی گئی سرگوشی پر چھوٹی نے پھر میرے بازو پر چٹکی کاٹی میں ہنس کر بازو سہلانے لگی۔
"دیکھنا ذرا، کل اسٹیشن سے گھر پہنچتے ہی آرام کا بھی ٹائم نہیں مل پائے گا۔ بڑی مشکل سے ناشتا اور نیند پوری کروں گی، سب پہنچ جائیں گی میرے میکے سے آیا سامان دیکھنے کے لیے۔ ایک ایک چیز ایسی خوش دلی سے دیکھیں گی کہ دل خوش ہو جائے گا میرا۔ پورا سال انتظار کرتی ہیں میرے یہاں سے واپس آنے کا۔ میری ذرا سی مشقت سال بھر کی راحت کا سبب بن جاتی ہے۔"
ان کے ذرا سی مشقت کہنے پر ہم سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، سب کی کمر دہری ہو جاتی تھی سامان پیک کرنے اور لوڈ کروانے کے دوران۔
بعض اوقات جس جگہ ڈبے کے آنے کے امکان ہوتے اس سے دس گز دور ڈبہ رکتا، سامان اٹھا اٹھا کر بھائی دوڑیں لگاتے۔ رش کے اندر آپا کو کسی طرح چڑھایا جاتا۔ لوگوں کو دھکے کے مار کر آپا کا ساز و سامان چڑھاتے، بے چارے بھائی لوگوں کی تمسخر بھری نگاہیں اور فضول گوئی برداشت کرتے۔
ایک بھائی اپنی پسلیاں چٹخاتا اندر چڑھ کر سامان ایک جانب پکڑ کر رکھتا جاتا، اتنے میں گاڑی وسل دے دیتی، ہمارے دل دھک دھک کر رہے ہوتے۔ ہم خواتین بچے سنبھالے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ منظر ملاحظہ کر رہی ہوتیں۔
جونہی گاڑی رینگنا شروع ہوتی، بچوں کی چیخ و پکار شروع ہوجاتی۔
"بابا گاڑی میں رہ گئے، بابا باہر آؤ۔ ہائے چاچو، ہمارے بابا۔" وہ چلاتے ہی رہتے۔
گاڑی رفتار پکڑ لیتی اور کبھی چھوٹے بھیا تو کبھی بڑے بھیا چھلانگ لگا کر گاڑی سے کودتے، کتنی ہی مرتبہ دھڑام سے نیچے گرے، کہنیاں چھلیں۔ آپا پورے رستے ان کی طرف سے فکر مند ہو کر جاتیں اور

ہم آپا کی طرف سے فکر مند رہتے کہ پتا نہیں کیسے سفر میں سب سنبھالیں گی۔ اماں الگ گھر میں پریشان ہوتیں۔

"تم سب نے بھی تو یہ نیا ڈھنگ نکالا ہے صفائی ستھرائی کا۔ سارا کاٹھ کباڑ اکٹھا کر کے دے دیں گے اسے۔ پتا بھی ہے کتنی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اس کو۔ اسٹیشن پر میاں سے الگ صلواتیں سنے گی کہ سارا لنڈا بازار اکٹھا کر کے لے آئی۔"

اماں ہم پر برہم ہوتیں تو ہم مسکرا دیتے۔

"اماں آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ اچھی خاصی مہنگی چیزوں کو آپ کاٹھ کباڑ اور لنڈا کہہ رہی ہیں۔" منجھلی آپا برا مان گئیں۔

"ہم تو آپا کی محبت میں دیتے ہیں کہ کتنے شوق سے لے جاتی ہیں۔" میں نے بھی اماں کو جتایا۔

"اس شوق میں ایک بار وہ گاڑی سے اترتے ہوئے ہڈی تڑوا چکی ہے، پر پتا نہیں اس کا آنے جانے سے من کیوں نہیں بھرتا۔" اماں ان کی پریشانی کے خیال سے پریشان ہو گئیں۔

"نہیں پر اپنی کام والیوں اور محلے پڑوس میں غریب غرباء کو دے دلا کر فارغ کر دیا کرو۔ خبردار جو آئندہ تم نے اس کو اتنے لنڈے بازار کے ساتھ رخصت کیا۔ اس کنجوس کی تو اور عادت پختہ ہو جائے گی جو دو چار آنے بچوں پر خرچ کرتا ہے اس سے بھی ہاتھ کھینچ لے گا، ہر چیز یہاں سے جو چلی جاتی ہے۔"

"ارے چھوڑیں اماں۔ اگر ہم بہن کو نہیں دیں گے تو اور کس کو دیں گے۔ ہماری کام والیاں ہم سے کام کا معاوضہ لیتی ہیں اگر ان کو اتنا کچھ دے دیں تو سر پر چڑھ جائیں گی۔ سو نخرے دکھائیں گی۔ آئے دن چھٹیاں کیا کریں گی، نیکی کا زمانہ نہیں رہا اسی لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ ان کو زیادہ منہ نہ لگایا جائے۔ بس ان کے کام کا صحیح معاوضہ ان کو وقت پر تھما دیا جائے۔" بھابھیوں نے بھی میری تائید کی۔

"اماں! آپا ہماری اپنی ہیں، ان کو سامان دے کر ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ ہمارے لیے تو یہ آؤٹ آف فیشن چیزیں ہو جاتی ہیں مگر آپا کے ہاں تو یہ چیزیں خریدنا تو دور کی بات کسی نے دیکھی بھی نہیں ہوتیں۔ اچھا ہے ہماری بہن کا گھر بھی خوب سج جائے۔ ان کی بچیاں اچھا پہناوا پہنیں۔ آپا کے تن پر ہمارے دیدہ زیب کپڑے سجیں گے تو ہماری ہی عزت ہوگی۔"

چھوٹی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تو اماں بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔

جب تک بڑی آپا کا وہاں پہنچ کر فون نہیں آ گیا اماں نے ہم سب کو ہولائے رکھا۔

☆☆☆

سب کے گھروں میں اچھی خاصی گنجائش نکل آئی تھی۔ ہم سب نے مل کر مارکیٹ کے چکر لگائے۔ نئے پردے، برتن، بیڈ شیٹس خریدیں۔

موسم کے حساب سے کپڑوں کے لیے شوہروں کا ڈھیروں روپیہ برباد کیا اور اپنے دل کو تسکین پہنچائی۔

"ویسے حمنہ سوچو اگر آپا ہر سال سے یہ چیزیں نہ لے کر جائیں تو ہمارے گھروں میں کتنا فالتو سامان اکٹھا ہو جائے۔"

"ہائے ایسے فاسد خیال کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دو۔ اللہ ہماری آپا کو لمبی زندگی اور ہمت دے کہ یہاں سے ہمارا فالتو سامان اسی ذوق و شوق سے لے جایا کریں۔" ہم سب نے مسکراتے ہوئے آمین کہا۔

☆☆☆

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ آپا نے بڑی بیٹی کا رشتہ طے کر دیا تھا، پہلی بچی کی شادی تھی سب کو لازمی آنے کی تاکید کی۔ ہم سب بھی جانے کے لیے پرجوش ہو گئے۔

بچے بھی بہت پُرجوش تھے، آپا نے اپنے علاقے کا نقشہ بھی ایسا کھینچ رکھا تھا کہ سب کو ان کا علاقہ دیکھنے کا اشتیاق ہو رہا تھا۔ ٹیوب ویل پر نہانے

کا تو عثمان کو جنون تھا۔ رسیلے پھلوں کے باغات دیکھنے کو دل ہمک رہا تھا سو سب نے ہی تیاری پکڑلی۔ اماں کا بھی جانے کا دل تو بہت تھا مگر جوڑوں کے درد سے مجبور گھر میں ہی رکنا پڑا۔ ٹکٹیں کروائیں اور پورے ڈبے میں ہم سب براجمان ہو گئے۔ برتھ پر لیٹ کر انجوائے کیا تو کبھی اسٹیشن پر اتر کر بچوں نے سیلفیاں لیں۔ ریل گاڑی میں کیا گیا ناشتہ بھی مزا دے گیا۔

"لو بھئی آپا کا شہر آنے والا ہے۔ سب اپنے اپنے سامان کی طرف دھیان دو۔ گاڑی زیادہ دیر نہیں رکے گی یہاں، سامان لے کر دروازے کی طرف رکھنا شروع کرو۔" میں نے آپا کی ہدایت کے مطابق سب کو احکامات جاری کیے، سب نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گیٹ کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔

گاڑی رکتے ہی الٹے سیدھے بیگ نیچے پھینکے۔ سب نے چھلانگیں لگائیں اور قافلہ بڑے سے پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ پورا اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ چند سواریاں اتری اور چڑھی تھیں۔ چکراتے سر کے ساتھ ہم نے جو اطراف میں نظر دوڑائی تو ایک اور قافلے کو اپنی سمت آتے دیکھا۔

آپا بچوں اور شوہر سمیت ہمیں لینے آئی تھیں۔ پانچ چھ رکشوں اور موٹر سائیکلوں پر یہ قافلہ آپا کے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

☆☆☆

چودہ مرلے پر پھیلا آپا کا گھر سادگی و نفاست کا نمونہ تھا۔ یہ بڑا صحن ایک طرف پر بنے سات آٹھ کمرے، کچن، سادہ سا باتھ روم۔ ایک طرف بنے مرغیوں کے ڈربے۔ دوپہر کو تندور گرم گرم روٹیوں سے بھر جاتا۔ ہینڈ پمپ سے استفادہ کیا جاتا۔ یوں لگا ہم کسی دیہاتی ماحول میں آ گئے ہوں۔

"آپا کو بھی پتا نہیں بچت کرنے کا اتنا خیال کیوں ہے، نہ تو گھر میں ڈھنگ کے چار برتن ہیں اور نہ کسی قسم کی آرائش۔ حالانکہ میکے سے اتنا کچھ لے کر آتی ہیں مگر ہماری دی گئی ایک بھی چیز گھر میں نظر نہیں آ رہی۔"

مجھے آپا کے اس سادہ سے گھر کو دیکھ کر بے طرح غصہ آ رہا تھا

"حد ہے کفایت شعاری کی بھی۔ پتا نہیں ہماری دی گئی چیزیں کہاں کی ہیں۔ چاہے بیچ کر بیٹی کا جہیز تیار کر لیا ہو۔ حالانکہ پتا بھی ہے کہ میکے والے دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے مگر عادت سے مجبور ہیں۔"

بڑی بھابھی کو تو آپا کے خلاف کچھ بولنے کا موقع چاہیے تھا۔

آپا کے گھر سارا دن سادہ سی دیہاتی عورتوں کا تانتا بندھا رہتا، یہ بڑے دیگچے میں سے کسی کو سالن کا ڈونگہ بھر کر دیا جا رہا ہے تو کسی کو اناج کے دانے تھیلے بھر بھر کر۔

شادی کی رسمیں شروع ہوئیں تو سب عورتوں نے آپا کا کام ایسے سنبھال لیا گویا ان کے گھر کا فنکشن ہو۔ کیا صفائی ستھرائی۔ کھانا پکانا۔ مہمانوں کو سنبھالنا سب کچھ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہمیں بٹھا کر کھلاتیں اور خوش ہوتیں۔ کب ہمارے کپڑے استری ہوتے، دھلتے، ہماری بکھری چیزیں کون سمیٹتا، ہمیں پتا ہی نہیں چلتا۔ ہم تو بس آپا کے گھر انجوائے کرنے آئے تھے۔ بچوں کا بھی خوب دل لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

شادی ہوتے ہی ہم نے آپا سے جانے کی اجازت چاہی۔

"لو ایسے کیسے چلی جاؤ گی۔ جن کی دعوتیں آئی ہیں وہ تمہیں ایسے تھوڑی جانے دیں گی؟"

"کیا مطلب؟" ہم حیران ہوئے۔

"رات کو نعیماں ماچھن کے گھر تمہاری دعوت ہے۔ صبح ناشتے کا میں نے صغریٰ درزن کو منع کر دیا تھا تو کل دوپہر کا کھانا تو ادھر لازمی ہی کھانا پڑے گا۔ پینو فقیرنی نے تو تمہارے آنے سے پہلے

ہی تمہاری دعوت کا کہہ رکھا ہے مجھے۔ اسے بھی انکار ممکن نہیں۔"

"لو اب ہم ان ماچھن، درزنوں کے گھروں کے کھانے کھائیں گی۔" ہمارے منہ بن گئے۔

"ایسے نہیں کہتے۔ اللہ کے بنائے گئے انسان ہیں۔ ذات پات، برادری سب دنیاوی اونچ نیچ ہیں۔ اصل تو بندے کی محبت، پیار، عزت اور مان ہے۔ انہوں نے تمہیں کس عزت اور مان سے بلایا ہے۔ انکار کر کے نہ ان کو ناراض کرو نہ رب کو۔ چلو تیاری پکڑو شام کو دعوت میں جانے کی۔"

ہم بے دلی سے کپڑے پہن کر شام کو آپا کے ساتھ چھیماں ماچھن کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کے گھر کے کھانے کے خیال سے ہی ہمیں متلی ہونے لگی۔

ہم جھجکتے ہوئے جب ماچھن کے گھر میں داخل ہوئے تو ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ یہ بڑا سا گھر۔ اینٹوں کا صحن۔ ہماری ماربل کی ٹائلیں بھی اس چمکتے فرش کے آگے ماند دکھائی دیں۔

"اس صفیہ کام چور کو تو میں جا کر دیکھنا کیسے سیدھا کرتی ہوں۔ گندا مندا پوچھا لگا کر ٹائلز کا بیڑا غرق کر دیا۔" مجھے اس گھر کی صفائی پر رشک اور اپنی صفائی والی پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔

پھر کے سیٹ میں جب اس نے ہمارے آگے کھانا چنا تو ہم سب نے ہی ایک دوسرے سے نگاہیں چرا لیں۔ یہ وہی سیٹ تھا جو مجھلی آپا نے پچھلی بار آپا کو دیا تھا۔

سادہ و لذیذ پر کھانا ہم نے شرمندہ ہوتے ہوئے سیر ہو کر کھایا۔

صغریٰ درزن کے گھر میں اس کے کمروں میں چارپائیوں پر بچھی لیپلک اور مختلف رنگوں کے کپڑوں کی بنی بیڈ شیٹس دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔

اس کی بچیوں کے تن پر ہمارے کپڑے جدید تراش خراش اور کڑھائی سے بہت ہی دیدہ زیب لگ رہے تھے۔ کتنے ہی ہمارے نیٹ کے دوپٹوں کے ڈیزائن بنا کر کمرے کے پردوں پر خوبصورتی بکھیر رہے تھے۔ اس پسماندہ سے علاقے کی عورتوں میں کتنا سلیقہ و ہنر تھا۔

"باجی جی! رب سوہنا آپ کو بہت دے۔ آپ لوگ ہم غریبوں کا بھرم رکھ لیتے ہو۔ میری دونوں بیٹیوں کے جہیز کے کپڑے اتنے خوب صورت تیار ہوئے کہ ان کے سسرال والے حیران رہ گئے کہ کون سی مہنگی دکان سے یہ کپڑے خریدے ہیں۔" صغریٰ اپنی قابلیت کو پس پشت ڈال کر ہماری احسان مند تھی۔

جس جس گھر میں ہم گئے سب ہی گھروں میں ہماری عرصے سے دی گئی اشیا کے شاہکار نظر آئے۔

"تو کیا آپا نے اپنے گھر میں اپنے لیے بھی کچھ نہیں رکھا، یہ سب مشقت اور تردد ان لوگوں کے لیے کرتی تھیں۔" یہ جان کر ہمیں شرمندگی نے آن گھیرا۔

اور جب ہم آپا کے گھر سے رخصت ہو کر اسٹیشن پر آرہے تھے تو ایک قافلہ ہمیں بھی اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ہر گھر سے ہمارے لیے کئی تھیلے نکلے تھے۔ پلیٹ فارم پر بوروں کا ڈھیر لگ گیا۔

گاڑی اسٹیشن پر کب رکی اور کب سامان چشم زدن میں چڑھ گیا، ہمیں خبر نہ ہوئی۔ ہمارے ذہن تو بس ایک ہی بات میں اٹکے تھے کہ آپا کو جو فالتو سامان ہم احسان جتا کر دیا کرتے تھے، اس سامان سے وہ ان لوگوں کو ہمارا نام لے کر فائدہ پہنچاتی تھیں۔

ان لوگوں کے لیے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر سب کی باتیں سن کر بھی وہ کتنی پرسکون رہتی تھیں۔

سامان ہمارا تھا مگر نیک نیتی ان کی تھی۔ ہمارا دیا گیا سامان تو لوگوں نے تحائف کی صورت میں ہمیں دنیا میں ہی لوٹا دیا تھا مگر آپا کے حصے میں یقیناً نیکیوں کے خزانوں کا انبار لگ چکا تھا۔ سارے راستے ہم بھیگی پلکوں سے آپا کی قد آور شخصیت کو سلام کرتے اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرتے رہے۔

☆

ایک خوش گوار صبح کا اختتام ناخوش گوار سا ہوا تھا۔

چھٹی کا دن تھا اور ممی نے ڈیڈی کی پسند کا زبردست ناشتہ تیار کیا تھا۔ ڈیڈی نے انتہائی رغبت سے ناشتہ کیا، ممی کے ہاتھ کے بنے قیمہ بھرے پراٹھوں کی دل کھول کر تعریف بھی کی۔ ممی نے مسکرا کر تعریف وصول کی۔ ڈیڈی سے ایک مزید پراٹھا کھانے پر اصرار بھی کیا، ان کے انکار پر اپنے

راشدہ رفعت

ممی ڈیڈی کے بھانجے

ہاتھوں سے چائے بنا کر پیش کی۔ مسئلہ تب پیدا ہوا جب چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی ڈیڈی نے لنچ کا مینیو ترتیب دینا چاہا تھا۔

"آج دوپہر کو واصف اور سبکتگین آئیں گے۔ آپ نرگسی کوفتے اور فیرنی بنا لیجیے گا۔ ساتھ کسی بھی طرح کے چاول ہو جائیں تو کیا کہنے۔ کیوں بھئی روشانے مٹن بریانی ٹھیک رہے گی یا چکن پلاؤ۔" ڈیڈی نے اس سے بھی رائے چاہی۔

وہ تو رائے تب دیتی جب ممی کی پیشانی پر پڑنے والے بلوں کو نوٹ نہ کر چکی ہوتی۔

"واصف تو میری طرح پلاؤ کا شوقین ہے لیکن میرا خیال ہے سبکتگین بریانی شوق سے کھاتا ہے۔" ڈیڈی نے خیال ظاہر کیا تھا اور ممی کی برداشت کا پیمانہ آخرکار لبریز ہو ہی گیا تھا۔

"میری بات سنیں پروفیسر صاحب! یہ گھر ہے کوئی ڈھابہ یا ریسٹورنٹ نہیں، نہ ہی میں کوئی باورچن ہوں۔ واصف بھائی اور سبکتگین نے تو یہاں کا رستہ ہی دیکھ لیا ہے۔ ہر اتوار کو بن بلائے مہمان بن کر نازل ہو جاتے ہیں۔ سارا دن ان کی مہمان داری کی نذر ہو جاتا ہے۔ میرے اپنے بھی سو کام ہوتے ہیں جو مجھے چھٹی والے دن نمٹانا ہوتے ہیں۔ آج آپ کی فرمائشی لسٹ پر عمل درآمد کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔" ممی نے قطعیت بھرا انکار کیا تھا۔

"بے مروتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے بیگم صاحبہ۔ جن کو آپ بن بلایا مہمان قرار دے رہی ہیں۔ وہ آپ کا سگا بھانجا اور بہنوئی ہیں۔ اگر وہ دونوں غریب ہفتے میں ایک بار گھر کا پکا کھانا کھانے آ ہی جاتے ہیں تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔" ڈیڈی نے ممی کو شرم دلانا چاہی۔

"بس رہنے دیں پروفیسر صاحب! واصف بھائی تو ہر دوسرے، تیسرے دن یہیں کھانا تناول کرتے ہیں اور جاتے ہوئے سبکتگین کے لیے بھی ٹفن بھر کر سالن لے جاتے ہیں۔ آپ کے دوست اتنے بے چارے اور مظلوم ہیں نہیں جتنا آپ انہیں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔"

"سن رہی ہو روشانے! اپنی ممی کے خیالات۔ کیسی سنگ دل اور کٹھور عورت ہے۔ مرحومہ بہن کی نشانیوں سے رتی برابر بھی انسیت نہیں۔"

ڈیڈی نے ہمیشہ کی طرح انجی خالہ کا نام لے کر ممی کو جذباتی بلیک میل کرنا چاہا تھا۔ لیکن ڈیڈی کے یہ حربے اب پرانے ہو چکے تھے اور ممی پر قطعی اثر



انداز نہ ہوتے، انہوں نے انتہائی لاپروائی سے ڈیڈی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''آج میرا صبوحی کے ساتھ شاپنگ پر جانے کا ارادہ ہے۔ آلو گوشت پکا کر چلی جاؤں گی۔ روٹیاں تندور سے منگوا لیجیے گا۔''

اس بار بھڑ کنے کی باری ڈیڈی کی تھی۔

''یہ صبوحی کو اپنے گھر میں چین نہیں اور اس نے آپ کو شاپنگ کی لت ڈالی ہے۔ اس کا میاں تو چلو بزنس مین ہے۔ یہ للے تللے افورڈ کر سکتا ہے لیکن آپ کا شوہر ریٹائرڈ پروفیسر ہے بیگم صاحبہ! خریداری ضرورت کے تحت کیا کریں۔ اسے مشغلہ مت بنائیں۔ آج ذرا آنے دیں صبوحی کو۔ اس کی طبیعت تو میں خود صاف کروں گا۔'' ڈیڈی خفگی بھرے لہجے میں مخاطب تھے۔

''سن رہی ہو روشانے اپنی ڈیڈی کی باتیں۔ مجھے طعنہ دے رہے تھے کہ اپنی مرحومہ بہن کی نشانیوں سے مجھے کوئی انسیت نہیں اور اپنی اکلوتی چھوٹی بہن سے خود کیسا سلوک روا رکھتے ہیں۔ احساس تک نہیں۔ بھائی تو بہنوں پر جان چھڑکتے ہیں اور یہ اس غریب کو ہر بار جلی کٹی سنا کر بھیجتے ہیں۔ وہ بے چاری ہماری محبت میں دوڑی چلی آتی ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے پروفیسر صاحب! صبوحی کا خود شاپنگ کا کوئی پروگرام نہیں تھا لیکن اسے پتہ چلا کہ کپڑوں کے مشہور برانڈ سیزن کے اختتام پر سیل لگا رہے ہیں تو اس نے فوراً مجھے فون کر کے بتایا۔ اسے رعایتی قیمت پر خریداری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے حساب کتاب سے چلنا پڑتا ہے اور دوسرے اخراجات پر تو میں پھر بھی بند باندھ لیتی ہوں۔ کچن کے اخراجات کی وجہ سے سارا بجٹ ٹیلپٹ ہو جاتا ہے۔'' ممی بھی جتائے بغیر نہ رہ پائی تھیں۔

''دیکھ رہی ہو روشانے اپنی ماں کو۔ میری خوش خوراکی پر طنز کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ میں ہر بار برداشت کا مظاہرہ کرتا ہوں لیکن بس اب اور نہیں۔'' ڈیڈی ناراض ہو کر ٹیبل سے اٹھ گئے تھے۔

''رکیں تو ڈیڈی! ممی کا یہ مطلب تھوڑی تھا۔'' روشانے نے باپ کو روکنا چاہا۔

''مت روکو روشانے انہیں۔ یہ ہی مطلب تھا میرا۔'' ممی نے تو واقعی بے مروتی کی حد کر دی تھی۔

وہ بے بسی سے ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔ ممی اطمینان سے چائے کی چسکیاں لیتی رہیں۔

☆☆☆

''انکل اور آنٹی کی چھوٹی موٹی جھڑپیں تو روز کا معمول ہیں۔ تم اتنی ٹینشن کیوں لیتی ہو۔''

سویرا نے اپنی عزیز از جان دوست کو سمجھانا چاہا۔ بہت دنوں بعد ایسا فرصت بھرا اتوار میسر آیا تھا۔ نہ کوئی اسائنمنٹ مکمل کرنا تھی نہ ہی کسی اہم ٹیسٹ کی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔

سویرا یہ سوچ کر روشانے کے گھر آئی تھی کہ دونوں مل کر آج کی چھٹی سے بھرپور لطف اٹھائیں گے۔

ڈائجسٹ میں اپنا پسندیدہ سلسلے وار ناول پڑھیں گے۔ فیشن میگزین میں سے کپڑوں کے نت نئے ڈیزائن دیکھیں گے اور پھر کوئی اچھی سی مووی بھی دیکھیں گے لیکن فرصت بھرا اتوار منانے کا سارا پروگرام روشانے کی شکل دیکھ کر چوپٹ ہو گیا تھا۔ وہ ممی، ڈیڈی کی تازہ ترین جھڑپ کے بعد حد درجہ ڈیپریسڈ تھی۔ جھڑپ کا پس منظر جاننے کے بعد سویرا بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

''اچھا چلو۔ یوں کرتے ہیں کہ انکل کا من پسند لنچ ہم دونوں مل کر تیار کر لیتے ہیں۔ آنٹی تو شاپنگ کر کے دیر سے لوٹیں گی نا۔'' سویرا نے تجویز دی تھی۔

''ڈیڈی کو تو سبکتگین بھائی آ کر لے گئے ہیں۔

جاتے ہوئے ڈیڈی ممی سے کہہ رہے تھے کہ تمہارے بہنوئی کو فون کر کے بتا دیا ہے کہ میری بیگم کو تمہیں ایک وقت کا کھانا کھلانا بھی کتنا کھلتا ہے۔ اسی لیے واصف انکل نے یہاں آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سبکتگین بھائی کو بھیج کر ڈیڈی کو اپنے ہاں بلوا لیا۔"

روشانے نے سویرا کو مزید تفصیل بتائی تھی۔

"افوہ یار! تمہیں انکل کی عادت کا پتا تو ہے۔ ایویں یہ بات کر دی آنٹی کو پریشرائز کرنے کے لیے۔ انہوں نے واصف انکل کو ہرگز ایسا ویسا کچھ نہیں کہا ہوگا۔" سویرا نے سہیلی کو تسلی دی۔

"تو ممی پریشر میں کب آئیں۔ انہوں نے الٹا ڈیڈی سے کہا کہ میں نے بھی صبوحی کو یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ کہہ دیا کہ تمہارے بھائی تمہیں جلی کٹی سنانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ خود آنے کے بجائے موبی کو مجھے لینے بھیج دو۔ بس پھر سبکتگین بھائی اور موبی آگے پیچھے آئے اور ممی، ڈیڈی ان کے ساتھ چلے گئے۔" روشانے نے روہانسے لہجے میں بتایا تھا۔

"چلے گئے تو اچھا کیا۔ تم منہ لٹکا کر کیوں بیٹھی ہو۔ چلو میرے ساتھ بھائی کی فرمائش پر امی ساگ بنانے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہیں۔ ان سے کہیں گے یہ پروگرام بعد کے لیے اٹھا رکھیں۔ آج اتنے دنوں بعد ہمیں ایسی فرصت اور فراغت ملی ہے۔ اپنے لیے کچھ اچھا سا بنوائیں گے اور سنڈے انجوائے کریں گے۔" سویرا اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی تھی اور وہاں جا کر واقعی دھیان بٹ گیا تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ اگر اس کی زندگی میں سویرا نہ ہوتی تو اس کا کیا بنتا۔ وہ ممی، ڈیڈی کی اکلوتی اولاد تھی۔ دونوں ہی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ ادھر اس کے منہ سے کوئی فرمائش نکلی، ادھر پوری ہوئی۔ ممی، ڈیڈی کی محبت کی وہ بلاشرکت غیرے مالک تھی۔ بہن کی کمی سویرا نے پوری کر رکھی تھی۔ دونوں میں بظاہر کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ دونوں گھرانے فقط ہمسائے تھے لیکن برسوں پرانی ہمسائیگی رشتہ داری سے بڑھ کر تھی۔

روشانے اور سویرا کو تو ایک دوسرے کے بنا چین ہی نہ آتا تھا۔ دونوں ایک ہی دن اسکول داخل ہوئیں۔ اکٹھے کھیل کود کر بڑی ہوئیں۔ روشانے اکلوتی تھی تو سویرا بھی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ لیکن ایک دوسرے کا ساتھ پا کر دونوں کو ہی بہن کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی۔

روشانے کا مسئلہ اکلوتا پن نہیں تھا۔ مسئلہ ممی، ڈیڈی تھے۔

بے شک ممی، ڈیڈی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے لیکن دونوں کے مزاج، عادت اور نظریات میں بہت فرق تھا۔ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے نظریات کا احترام کرتے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی لیکن ہر معاملے میں دونوں کو اپنا موقف ہی درست لگتا اور ان کی کسی بھی جھڑپ اور جھگڑے کے دوران روشانے دوہری مصیبت میں گرفتار ہو جاتی۔ ممی کی خواہش ہوتی کہ روشانے ان کے موقف کی تائید کرے، ڈیڈی لاڈلی بیٹی کو اپنا ہم نوا بنانا چاہتے۔

روشانے ایک کی طرف داری کر کے دوسرے کو خفا نہ کر سکتی تھی اور نہ ہی کسی طرح ممی ڈیڈی کی خفگی ختم کروا سکتی تھی۔ یہ اور بات کہ ممی ڈیڈی اپنی خفگی

اور اپنے ... گوارا نہیں کرتے تھے۔ ممی
اکثر صبوحی پھوپھو کی طرف نکل جاتیں اور ڈیڈی واصف انکل کے ساتھ کوئی علمی، ادبی بحث چھیڑ کر اپنا موڈ بحال کر لیتے۔

کہنے کو تو صبوحی پھوپھو، ڈیڈی کی بہن اور واصف انکل ممی کے بہنوئی تھے لیکن ڈیڈی سے ملتی جلتی عادات والے واصف انکل ممی کی گڈ بکس میں کبھی شامل نہ ہوئے اور ممی کی چہیتی نند یعنی صبوحی پھوپھو اپنے بڑے بھیا کی بالکل چہیتی نہ تھیں۔

ڈیڈی تو برملا کہتے تھے کہ ممی کی عادتیں بگاڑنے میں زیادہ ہاتھ صبوحی پھوپھو کا ہے۔ صبوحی پھوپھو کے مالی حالات خیر سے بہت اچھے تھے۔ ارشد انکل کا بہت اچھا چلتا کاروبار تھا۔ ہنس مکھ اسمارٹ اور ماڈرن سی صبوحی پھوپھو ڈیڈی کی نظر میں حد درجہ آزاد خیال تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا محب عالم عرف موبی جو عمر میں روشانے سے فقط ڈیڑھ ماہ بڑا تھا۔

اسمارٹ سی صبوحی پھوپھو کے برعکس خاصا گیلو گپلو سا تھا۔

ڈیڈی کو بھانجے کی شخصیت، عادت اور حتیٰ کہ اس کی ڈریسنگ پر بھی بے تحاشا اعتراضات تھے انہیں تو اپنے عزیز از جان دوست واصف صاحب کا لخت جگر سبکتگین جی جان سے پیارا تھا۔ سنجیدہ، بردبار اور ذمہ دار سا سبکتگین جہاں ڈیڈی کو بہت عزیز تھا وہاں ممی کو اپنا بھانجا قدرے بور پرسنالٹی والا خشک مزاج سا بندہ لگتا۔

انہیں سگے بھانجے سے اس قدر انسیت اور محبت نہ تھی جتنی ہونا چاہیے تھی۔ ان کا پیارا تو موبی تھا جو ہر پل، ہر گھڑی ماں اور ممانی کا ڈرائیور بننے پر تیار رہتا۔ وہ نہ صرف ان دونوں کو شاپنگ کروانے ساتھ لے جاتا بلکہ دوران شاپنگ اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازتا۔

جہاں تک روشانے کا تعلق تھا۔ اسے بردبار سے سبکتگین بھائی بھی برے نہ لگتے۔ وہ ان کا بڑے بھائیوں کی طرح احترام کرتی۔ صبوحی پھوپھو کی طرح

بس تھوڑا سا موبی بھی اسے پھوپھو جتنا پیارا تھا۔ اپنے دونوں کزنز سے حد درجہ دوستانہ تعلق نہ ہونے کی وجہ بھی شاید ممی، ڈیڈی ہی تھے۔ وہ اگر واصف انکل اور سبکتگین بھائی کو زیادہ پروٹوکول دیتی تو ممی کچھ خفا سی لگنے لگتیں۔ پھوپھو اور موبی کے ساتھ وقت گزارتی تو ڈیڈی کو لگنے لگتا کہ کہیں ان کی روشانے پر بھی صحبت کا اثر نہ ہو جائے۔ بس اسی لیے روشانے اپنے دونوں کزنز سے لیے دیے انداز میں ہی ملتی تھی۔

اسے کیا خبر تھی کہ ممی ڈیڈی ایک دوسرے کے بھانجوں کے حوالوں سے کیا کیا سوچ بیٹھے ہیں۔

☆☆☆

یہ بھی ایک اتوار کی صبح کا ذکر ہے۔ آج ممی نے ڈیڈی کے لیے اسپیشل حلوہ پوری بنائی تھی۔ ساتھ آلو کی بھجیا اور چنوں کا سالن بھی تھا۔

ڈیڈی رغبت سے ناشتہ کر رہے تھے۔ ممی ان کی پلیٹ میں مزید حلوہ ڈال رہی تھیں۔ روشانے بھی گرما گرم حلوہ پوری سے ناشتہ کرنے کے بعد اب کچن سمیٹ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس خوش گوار صبح کا اختتام ناخوش گوار ہو سکتا ہے۔ کچن سمیٹ کر وہ لاؤنج کی ڈسٹنگ کرنے لگی لیکن کان ممی ڈیڈی کی گفتگو کی جانب ہی لگے تھے۔

"اب تو خیر سے موبی بھی ارشد بھائی کے ساتھ آفس جانے لگا ہے۔ ارشد بھائی خود حیران ہو رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ مجھے تو اندازہ نہ تھا کہ موبی کو کاروبار کی اتنی سمجھ بوجھ ہوگی۔"

"اچھی بات ہے بھئی۔ بے چارہ ارشد تو یہ سمجھتا ہوگا ناں کہ بیٹا جتنا موٹا ہے اس کی عقل بھی اتنی موٹی ہوگی اور وہ نالائق پڑھائی میں تو چل کر نہ دیا اچھا ہے باپ کا کاروبار ہی سنبھالے۔" ڈیڈی نے حلوہ پوری سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔ ممی تھوڑی جز بز تو ہوئیں مگر ڈیڈی کی بات سے فوری اختلاف نہ کیا۔

"صبوحی بتا رہی تھی کہ اب تو موبی نے جم بھی جوائن کر لیا ہے۔ ماشاء اللہ پیارا تو وہ پہلے سے ہی

ہے ذرا سا۔ ہارٹ ہو جائے گا تو اور بھی پریشانی ہی آئے گی۔" ممی کے لہجے میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"صحیح کہہ رہی ہیں آپ، شخصیت بنانے کے لیے جتن تو کرنے پڑتے ہیں۔ اب ہر کوئی سبکتگین کی طرح شان دار شخصیت کا مالک نہیں ہوتا نا۔ بچپن سے ہی کیسی سلجھی ہوئی عادتوں کا مالک ہے سبکتگین۔ واصف نے بیٹے کی تربیت خود کی ہے۔ ذرا سا حلوہ مزید ڈال دیجیے۔ پوریاں لاجواب تلی ہیں آپ نے۔"

ڈیڈی نے ایک ہی سانس میں سبکتگین اور پوریوں کی تعریف کی تھی۔ ممی نے اختلاف رائے کو خلاف مصلحت جان کر ڈیڈی کی پلیٹ میں مزید حلوہ ڈال دیا۔

"آج شام کو صبوحی اور راشد بھائی آنے کا ارادہ رکھتے ہیں میں تو کہتی ہوں کہ آپ واصف بھائی اور سبکتگین کو بھی مدعو کر لیجیے۔ ظاہر ہے وہ بھی ہماری فیملی کا حصہ ہیں۔ اس موقع پر ان کی شمولیت اور موجودگی بھی تو ضروری ہے نا۔"

ممی نے بہت سوچ کر لفظوں کا انتخاب کیا تھا۔ روشانے کے تو صرف کان کھڑے ہوئے تھے۔ ڈیڈ پورے کے پورے کھڑے ہو گئے۔

"کس موقع پر؟ کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟"

"آپ ناشتہ تو پورا کر لیجیے۔ ایک اور پوری لیں نا۔" ممی نے جیسے ڈیڈی کو بہلانا چاہا تھا۔

"میرا پیٹ بھر چکا ہے۔ میں ایک تو کیا آدھی پوری بھی مزید نہیں کھا سکتا۔ آپ بتائیے صبوحی اور راشد کس لیے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" ڈیڈی نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"اُفوہ بھئی! آپ سمجھ تو گئے ہیں پھر جانتے بوجھتے انجان مت بنیں۔ میں نے کچھ دنوں پہلے آپ سے سرسری سا تذکرہ کیا تو تھا صبوحی ہماری روشانے کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہے۔"

"آپ کے سرسری سے تذکرے پر میں نے بھتیجی ہے۔ وہ کوئی اور رشتہ جوڑنے کے متعلق سوچ بھی نہ۔" ڈیڈی باقاعدہ غرا کر بولے تھے۔

"کیوں کیا کمی ہے موبی میں؟ خدا کا شکر ہے گھر بیٹھے ہماری بیٹی کے لیے ایسا اچھا رشتہ بھیج دیا۔" ممی بھی بگڑ کر بولی تھیں۔

"موبی میں کوئی کمی نہیں بلکہ ہر چیز کی زیادتی ہی زیادتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں اپنی شہزادیوں جیسی بیٹی کے لیے وہ موٹا آلو ہی ملا ہے۔"

"بھانجا ہے آپ کا۔ کیسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں اس کے لیے۔ کچھ تو شرم کریں۔" ممی سخت خفا ہوئیں۔

"ٹھیک ہے میں شرم کر لوں گا اگر تم اپنی تجویز واپس لے لو۔ بھئی جب ہمارے پاس بہتر انتخاب موجود ہے تو ہم کسی ایسے ویسے رشتے پر غور بھی کیوں کریں۔ واصف نے سبکتگین کے لیے خواہش ظاہر کی ہے اور میں ــــ تم سے مشورے کے بعد اسے رضامندی دینے ہی والا تھا۔" ڈیڈی نے بھی آخر اپنی بلی تھیلے سے باہر نکالی۔

"آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا پروفیسر صاحب کہ میں اپنی نازوں پلی بیٹی سبکتگین سے بیاہ دوں گی۔" ممی آگ بگولا ہو گئیں۔

"کیوں کیا کمی ہے سبکتگین میں پڑھا لکھا، خوبرو، برسر روزگار بردبار......"

"بس کیجیے پروفیسر صاحب! میں نے جیسی زندگی خود گزاری ویسی زندگی روشانے پر کیوں مسلط کروں۔ سبکتگین اگر آج لیکچرار ہے تو، تو کل ایک خبطی اور جھکی پروفیسر ہی ہو گا نا۔ آپا مرحومہ نے اپنے شوہر کے دوست سے میری شادی کروا کر جو زیادتی میرے ساتھ کی، آپ چاہتے ہیں میں وہ ہی زیادتی اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے دوں۔ میرے جیتے جی ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔" ممی بھی خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئی تھیں۔

"لیجیے آج آپ نے اقرار کر لیا نا کہ میرے

خاطر آپ کی خاطر ایک مجبوری کا سودا اور ان چاہا بندھن تھا۔ پھر کیوں اتنے برس مجھ سے جھوٹا اظہار محبت کر کے میرا سچا اقرار محبت سنتی رہیں۔" غم اور غصے سے ڈیڈی کا برا حال تھا۔

"بات بلاوجہ مت بڑھائیں پروفیسر صاحب! میری طرف سے محبت کا اظہار کبھی جھوٹا نہ تھا۔ مشرقی عورت ہوں میں اور مشرقی عورت کی شادی جس بھی ایرے غیرے نتھو خیرے سے ہو جائے وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو ہی جاتی ہے۔" کس شان بے نیازی سے ممی نے محبت کی توجیہہ پیش کی تھی۔

"دیکھ رہی ہو روشانے اپنی ماں کو، اپنے مجازی خدا کو کن القابات سے نواز رہی ہیں۔ یعنی کہ میں ایرا غیرا ہو گیا۔"

"میں نے آپ کو ایرا غیرا کب کہا؟" ممی صاف مکر گئیں۔

"تو پھر نتھو خیرا کہنا چاہ رہی ہیں؟" ڈیڈی مزید بگڑے۔

"پلیز ڈیڈی! جھگڑا ختم کریں۔ بات بڑھانے سے کیا حاصل۔" روشانے کو ہی سیز فائر کروانے کے لیے درمیان میں آنا پڑا۔

"ٹھیک ہے میں بات نہیں بڑھاتا۔ بتا دو اپنی ماں کو کہ تمہیں موبی کا رشتہ ہرگز قبول نہیں۔ وہ گدھا تمہارے جوڑ کا ہے ہی نہیں۔"

"روشانے کو پریشرائز کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی اس کی ہے تو فیصلے کا اختیار بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ سبکتگین اور موبی میں سے جس کے پرپوزل کو یہ مناسب سمجھے اسے اوکے کر دے۔ پھر آپ کو اور مجھے اس کی رائے کا احترام کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے آج کی گفتگو میں یہ پہلی معقول بات ہے جو تم نے کی۔ مجھے تمہاری تجویز منظور ہے کیونکہ میں جانتا ہوں میری بیٹی بہت عقل مند اور سوجھ بوجھ والی ہے۔ میں اس سے کسی بے وقوفانہ فیصلے کی توقع کر ہی نہیں کر سکتا۔" ڈیڈی نے اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا تھا۔

میں اپنی بیٹی کو آپ سے زیادہ جانتی ہوں۔" ممی بھی اسے محبت سے دیکھتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

"ساری بات تمہارے سامنے ہی ہوئی ہے روشانے بیٹا۔ اب ہمیں جلد از جلد اپنی رائے سے آگاہ کر دو۔"

ممی نے اسے مخاطب کیا۔ ڈیڈی نے بھی تائیدی انداز میں ہنکارا بھرا۔ روشانے بے بسی سے ماں باپ کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جس وقت وہ سویرا کے گھر داخل ہوئی تو پہلا ٹاکرا عمر سے ہوا۔ وہ نائٹ ڈیوٹی کے بعد گھر لوٹا تھا تھکن اور نیند سے برا حال تھا لیکن روشانے کی پریشان شکل دیکھ کر نیند جیسے اڑن چھو ہو گئی۔

"کیا ہوا روشانے! خیریت تو ہے اتنی حواس باختہ اور پریشان کیوں لگ رہی ہو؟" اس نے تشویش کے عالم میں دریافت کیا۔

"اُفوہ! ایک تو بندہ عمر بھائی جتنا ذہین نہ ہو۔"

روشانے اس کے مشاہدے پر جز بز ہوئی۔

"بس عمر بھائی! طبیعت گری گری سی ہے۔ سر میں بھی درد ہے۔ اسی لیے آپ کو پریشان لگ رہی ہوں ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

روشانے نے اس کی تسلی کروانا چاہی۔ تسلی تو کیا ہوتی وہ الٹا مزید تشویش میں مبتلا ہوا۔

"کہیں پھر سویرا کے ساتھ مل کر کوئی کھٹی چیز تو نہیں کھالی۔ تمہیں پتہ بھی ہے تمہارا گلا کتنا حساس ہے۔ فوراً خراب ہو جاتا ہے اور گلے کے انفیکشن سے بخار بھی کتنا تیز چڑھتا ہے لیکن نہ تمہاری سمجھ میں آتا ہے نہ سویرا کو۔" وہ خفا ہوتے ہوئے بولا۔ روشانے نے اس لمحے کو کوسا جب عمر کے سامنے اپنی طبیعت خرابی کا ذکر کیا تھا۔

"میرا گلا بھی ٹھیک ہے عمر بھائی۔ نہ ہی مجھے بخار چڑھنے جا رہا ہے اور نہ ہی میں نے اور سویرا نے کوئی کھٹی چیز کھائی ہے، بس رات کو نیند ٹھیک سے نہیں آئی اس لیے طبیعت کچھ سست سی ہے اور اب یہ

مت پوچھ لیجیے گا کہ نیند کیوں نہیں آئی۔ دراصل دن میں بہت سوئی تھی اس لیے نیند نہیں آئی اوراب اگر آپ اجازت دیں تو میں سویرا سے مل لوں۔"

وہ ذرا جھنجلا کر بولی تھی۔ عمر کو اس کے خفگی بھرے انداز پر ہنسی تو بہت آئی مگر مزید کچھ بولے بنا گردن ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

سائرہ خالہ شاید کچن میں مصروف تھیں۔ وہ سیدھی سویرا کے کمرے میں چلی گئی۔ سویرا ہفتہ صفائی منانے کے موڈ میں تھی۔ کمرے کی الماری کا سارا سامان بیڈ پر پھیلائے اب سر ہاتھوں میں دیے بیٹھی تھی۔

"سچ کہتے ہیں دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔" روشانے کو دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ "میں نے یہ سارا سامان نکال تو لیا ہے اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ دوبارہ کیسے سیٹ کروں۔"

"تمہیں بھی آج ہی سیٹنگ کا دورہ پڑنا تھا۔" روشانے روہانسی ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا روشانے! انکل آنٹی کی پھر سے لڑائی ہو گئی۔" سویرا اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر خود بھی پریشان ہوئی۔

"چھوٹا سا مسئلہ نہیں ہے سویرا۔ پہلے یہ پھیلاوا سمیٹتے ہیں پھر تسلی سے بات کریں گے۔"

روشانے نے لمبی سی ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے سہیلی کو مخاطب کیا۔ پھر برق رفتاری سے اس کے ساتھ کمرے کو سمیٹنا شروع کیا۔ سویرا کو بھی متوقع مسئلے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا سو بنا بات کیے جلدی جلدی کمرے کی حالت درست کی۔ پھر دونوں سہیلیاں بیڈ پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

"زیادہ شدید جھگڑا ہوا ہے۔" سویرا اس کی پریشان شکل دیکھ کر یہی اندازہ لگا پائی تھی۔

"باقاعدہ جھگڑا تو ہوا ہی نہیں ہے ابھی تو صرف شروعات ہے۔" روشانے کو رونا آنے لگا۔

"پہلے کچھ بتاؤ تو سہی۔ آنسو بعد میں بہا لینا۔" سویرا کچھ خفا ہو کر بولی۔

روشانے نے مختصراً اسے سارا قصہ کہہ سنایا تھا۔ بات سننے کے بعد سویرا کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"میں اتنی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہوں اور تمہیں ہنسی آرہی ہے۔"

روشانے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"میں تو واقعی پریشان ہوگئی تھی روشانے! یہ سوچ کر کہ جانے انکل آنٹی اس بار کس بات پر جھگڑ پڑے ہیں۔ لیکن اس بار تو بہت تعمیری قسم کا جھگڑا ہوا ہے۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ سوچ سمجھ کر انکل، آنٹی کو جواب دے کر اس جھگڑے کا خوش گوار سا اختتام کردو۔" سویرا نے مسکرا کر سہیلی کو مخاطب کیا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں سبکتگین بھائی یا موبی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلوں اور ممی ڈیڈی کو آگاہ کردوں۔" روشانے نے اسے گھورا۔

"ظاہر ہے تمہیں یہ ہی کرنا ہے انکل آنٹی نے بھی تمہیں یہ ہی کہا ہے ناکہ وہ دونوں تمہاری رائے کا احترام کریں گے۔"

"پہلی بات تو یہ ہے سویرا صاحبہ! کہ میں نے کبھی سبکتگین بھائی کو اس نظر سے دیکھا ہے نہ ہی موبی کے متعلق کچھ ایسا ویسا سوچا ہے۔ ممی ڈیڈی نے اچانک اس قسم کی بات کر کے میرے حواسوں پر بم ہی گرادیا ہے اور بالفرض میں دونوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرلیتی ہوں تو کیا ممی ڈیڈی کو بتانا آسان ہوگا۔ دونوں کو مجھ پر پورا مان اور بھروسا ہے اور میں نہ ممی کا مان توڑ سکتی ہوں نہ ڈیڈی کا بھروسہ۔ کسی ایک کے حق میں ووٹ دے کر میں دوسرے کو ہرٹ نہیں کرسکتی۔"

اس نے سویرا کو صورت حال کی سنگینی کا احساس دلوانا چاہا مگر سویرا پر مطلق اثر نہ ہوا۔

"یہ تمہاری پوری زندگی کا معاملہ ہے روشانے! تم انکل آنٹی کا سوچ کر پریشان مت ہو۔ دونوں پروپوزلز پر غور کرو۔ اور جب دل و دماغ ایک فیصلے پر متفق ہوجائیں تو انکل آنٹی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردو۔ اگر تمہارے فیصلے سے کوئی ایک فریق ہرٹ ہوگا بھی تو تمہاری خوشی دیکھ کر ان کا وقتی افسوس ختم ہوجائے گا کیونکہ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ انکل اور آنٹی تمہیں بے تحاشا اور بے حساب چاہتے ہیں۔" سویرا نے بھرپور سنجیدگی سے سہیلی کو سمجھایا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......" روشانے اب بھی متذبذب اور الجھی ہوئی تھی۔

"کوئی اگر مگر نہیں، آؤ سبکتگین بھائی اور موبی کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں۔ کتنے دنوں بعد اتنے مزے کی ایکٹویٹی ہاتھ لگی ہے ہمارے، بلکہ میں یوں کرتی ہوں کاغذ پین لاتی ہوں، دونوں کی خوبیاں اور خامیاں آمنے سامنے لکھیں گے فیصلے میں آسانی رہے گی۔"

سویرا تو پل بھر میں خوش ہوگئی تھی۔ روشانے البتہ ابھی تک تھس سے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کا اضطراب کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ ڈیڈی کی اسٹڈی میں ان کے لیے چائے لے کر گئی تھی۔ ڈیڈی بہت انہماک سے ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ بیٹی کو دیکھ کر مسکرائے۔ کتاب بند کر کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"بہت نادر اور نایاب کتاب ہے۔ یہ کب سے اس کی تلاش میں تھا اللہ خوش رکھے سبکتگین کو۔ ایسی کتابیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہ ہی میرے لیے لاتا ہے۔" ڈیڈی نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے سبکتگین کی تعریف کی تھی۔ آج کل وہ موقع ملتے ہی اس کے سامنے سبکتگین کے قصیدے پڑھنا شروع ہوجاتے تھے۔

"بہت بھلا مانس اور قابل لڑکا ہے پھر اتنی سی عمر میں کتنا میچور اور سمجھ دار ہے۔ اور ایک وہ ہے ہمارا بھانجا محبِ عالم! کتنا لاابالی اور لاپرواہ ہے۔ زمانے بھر کا نکما، اس سے کسی شاعر کا نام پوچھ لو میں شرط لگا کر کہتا ہوں علامہ اقبال کے سوا کسی اور شاعر کا نام تک نہیں بتا سکے گا اور شاعری کے نام پر لب پہ آتی

ہے دعا اور تھوڑا بہت قومی ترانہ سنا دے تو غنیمت ہے، ہاں اس سے ہالی وڈ کی فلموں کے بارے میں پوچھ لو۔ نئی سے نئی فلم کا نام بھی بتا دے گا اور اداکاروں کی تفصیل بھی یا پھر اس سے اسپورٹس کار اور ہیوی بائیکس کے متعلق پوچھ لو، اس چھچھورے کے پاس گفتگو کا کوئی اور موضوع ہی نہیں۔“

ڈیڈی نے استہزائیہ انداز میں بھانجے کا ذکر خیر کیا تھا۔

”ڈیڈی میرا فائنل سمسٹر تو ہونے دیتے۔ آپ نے اور ممی نے مجھے کس الجھن میں ڈال دیا۔“ ڈیڈی کی گفتگو کا مقصد سمجھتے ہوئے وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔

”میرا بچہ یاد کرو میں نے یہ بات کب چھیڑی۔ وہ تو تمہاری ماں ہی صبوحی اور راشد کو بلانے کے لیے اتاولی ہو رہی تھی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو صبوحی کو موبی کی شادی کی جلدی ہی کیا ہے۔ ابھی تو وہ ڈھنگ سے کمانے بھی نہیں لگا۔ ٹھیک ہے اس نے باپ کا بزنس ہی سنبھالنا ہے لیکن اس کے لیے بھی کچھ سوجھ بوجھ اور سمجھ داری چاہیے کہ نہیں۔

اور سبکتگین کو دیکھو ماشاء اللہ برسر روزگار بھی ہے اور سمجھ دار بھی۔ پھر ان کے گھر کو بھی کوئی گھر سنبھالنے والی چاہیے۔ واصف بے چارے نے تمہاری خالہ مرحومہ سے ایسی محبت نبھائی کہ ان کے انتقال کے بعد دوسری شادی کا سوچا تک نہیں۔

اب اس کی خواہش ہے کہ ایسی بہو گھر آئے کہ اس کا بڑھاپا تو سکون سے گزرے اور مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسا ہے یہ جتنی فرماں بردار اور خدمت گزار بیٹی ہے اتنی ہی اچھی بہو بھی ثابت ہوگی۔“ ڈیڈی اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”پلیز ڈیڈی...... میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

اس نے روہانسی ہو کر ڈیڈی کی بات کے آگے بند باندھنا چاہا۔ ڈیڈی بھی ذرا سنبھلے تھے۔

”ہاں، ہاں بیٹا تم پر کوئی زور زبردستی نہیں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“ سب کچھ کہہ دینے کے بعد فراخ دلی سے فیصلے کی گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔ روشانے بس ڈیڈی کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”صبوحی تمہاری سگی پھوپھو ہے اور تمہیں کس قدر چاہتی ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“

ممی شامی کباب تلتے ہوئے روشانے سے مخاطب تھیں۔ واصف انکل ڈیڈی کے پاس آئے ہوئے تھے اور ڈیڈی کی فرمائش پر ممی پلاؤ اور کباب بنا رہی تھیں۔ روشانے ان کی مدد کے خیال سے کچن میں تھی جب ممی نے اسے مخاطب کیا۔ سلاد کے لیے پیاز کاٹتے روشانے کے ہاتھ ذرا تھمے تھے۔ ماں کی بات پر کوئی اظہار خیال کیے بنا وہ پھر سے پیاز کاٹنے لگی۔

”تم سگی پھوپھی کے ہاں بیاہ کر جاؤ گی تو کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں ہوگی، ورنہ شادی کے بعد لڑکیوں کو خرانٹ قسم کی ساسوں سے واسطہ پڑتا ہے تو انہیں پتا لگ جاتا ہے۔ اکثر مائیں بیٹوں کا رشتہ مانگتے وقت جتنی میٹھی میٹھی باتیں بگھارتی ہیں، شادی کے بعد وہ ہی میٹھی چھری بن جاتی ہیں۔ بس یہ ہی سوچ کر میں تمہاری صبوحی پھوپھو کے ہاں تمہارا رشتہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی محبت کرنے والی اور جان چھڑکنے والی ساس تمہیں اور کہاں ملے گی۔“

”اور اگر ڈیڈی واصف انکل کو ہاں کرتے ہیں ممی تو وہاں تو ساس کا کوئی ٹنٹا ہی نہ ہوگا۔ ہمارے ڈائجسٹ کی بہت سی کہانیوں میں یہ ہی ہوتا ہے محبت کرنے والی خالہ یا پھوپھی بھی شادی کے بعد سخت گیر ساس کا روپ دھار لیتی ہے۔“ اس نے تو ویسے ہی بات برائے بات کی تھی لیکن ممی کے چہرے پر خفگی پھیل گئی۔

”مجھے معلوم ہے تمہارے ڈیڈی تمہیں آج کل کس قسم کی پٹیاں پڑھا رہے ہیں اور مجھے بہت

افسوس ہے اگر تم صبوحی کے متعلق اس قسم کی بات سوچ رہی ہو۔ وہ تمہاری اکلوتی پھوپھو اور تم اس کی اکلوتی بھتیجی۔ صبوحی بے چاری کی تو کوئی بیٹی بھی نہیں۔ وہ تمہیں اپنی بیٹی کہتی ہی نہیں سمجھتی بھی ہے۔ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ وہ شادی کے بعد خرانٹ ساس ثابت ہوگی۔

جو ساری عمر میرے لیے نند سے بڑھ کر بہن اور دوست ثابت ہوئی۔ وہ تمہیں ساس بن کر کیوں دکھائے گی۔ خود سوچو، میں بھاوج ہو کر اپنی نند کی حمایت کر رہی ہوں تو وہ کتنی اچھی نند ہوگی۔ تمہارے ڈائجسٹوں میں تو نند، بھاوجوں کے جھگڑوں کے بھی بہت قصے ہوتے ہوں گے۔" ممی نے اسے سمجھانا چاہا۔ ان کی بات میں وزن بھی تھا روشانے آگے سے کچھ نہ بول سکی۔

"اور مان لیا واصف بھائی کے گھر ساس کا کوئی ٹنٹا ہی نہیں ہوگا لیکن میری جان یہ رشتے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد لڑکی کو قدم قدم پر ان سسرالی رشتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

میری مثال لے لو۔ میں نے شادی ہو کر سسرال میں قدم رکھا تو اگلے ہی روز میرا ولیمہ تھا تو تمہاری صبوحی پھوپھو کی رخصتی، تمہارے دادا ہماری شادیوں کے محض تین ماہ بعد اللہ کو پیارے ہو گئے اور تمہاری دادی سے تو میرا محض غائبانہ تعارف ہے۔ وہ میری شادی سے بہت برس پہلے وفات پا گئی تھیں۔

دنیا کی نظروں میں بہت آئیڈیل گھرانے میں بیاہی گئی تھی نہ کوئی ساس، نہ کوئی نند، آزاد اور خود مختار زندگی یہ مجھ سے پوچھو کہ مجھے یہ خود مختار زندگی گزارنے میں کن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"تمہاری پیدائش کا مرحلہ، پھر تمہاری پرورش کے بعد کے مسائل، تمہارے ڈیڈی کالج ہوتے، مجھے واش روم بھی جانا ہوتا تو تمہارے سونے کا انتظار کرتی وہ تو سائرہ باجی کا ساتھ تھا وہ میرے لیے پڑوسن سے بڑھ کر بہن ثابت ہوئیں۔ اکثر تمہیں ان کے گھر چھوڑ کر میں اپنے گھر کے کام جلدی جلدی نمٹاتی۔

تمہارے ڈیڈی تب بھی اتنے ہی خوش خوراک تھے۔ انہیں میرے اکیلے پن کا کچھ لحاظ اور خیال نہ تھا۔ ان کے فرمائشی پروگرام کبھی ختم نہ ہوتے میں نے بالکل اکیلے ہوتے ہوئے تمہیں جس طرح پالا، پوسا، یہ مجھے ہی معلوم ہے۔ تمہارے بعد اللہ نے مجھے ایک بار پھر خوش خبری سے نوازا لیکن میں اپنی ناتجربہ کاری اور کم عقلی کے باعث اس کی حفاظت ہی نہ کر پائی۔ اگر گھر میں کوئی بڑا، بوڑھا سمجھ دار شخص موجود ہوتا تو ساتویں مہینے مجھے وزن نہ اٹھانے دیتا۔ کپڑوں کی دھلی بالٹی اٹھا کر میں سیڑھیاں چڑھنے کی حماقت کر بیٹھی۔ تمہارا بھائی دنیا میں آنے سے پہلے ہی ہم سے روٹھ کر واپس اللہ کے پاس چلا گیا اور پھر ایسی پیچیدگی ہوئی کہ میں دوبارہ کبھی ماں بھی نہ بن پائی۔

یہ تمہارے ڈیڈی کی اعلاظرفی ہے کہ انہوں نے کبھی مجھے اس بارے میں کوئی طعنہ نہ دیا بلکہ ہمیشہ میری دل جوئی کی۔ تمہیں بھی بیٹوں سے بڑھ کر چاہا لیکن میں آج بھی یہ سوچتی ہوں کہ کاش میری شادی کے بعد تمہاری دادی حیات ہوتیں تو ان کا تجربہ اور رہنمائی مجھے ہر قدم پر میسر ہوتی۔ وہ بھلے ہی مجھے ڈانٹتیں ڈپٹتیں، ہمارے لڑائی جھگڑے بھی ہو جاتے لیکن میرے بچوں کے لیے تو شفیق دادی ثابت ہوتیں۔

میں نے رشتوں کے لحاظ سے بہت محروم زندگی گزاری ہے روشانے! تمہارے نانا نانی تو میری شادی سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھیا نے آپا کی شادی کے بعد خود کینیڈا کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ مجھے بھی آپا کے پاس جا کر رہنا پڑا۔

تمہارے ڈیڈی واصف بھائی کے دوست تھے۔ ہماری شادی بھی واصف بھائی اور آپا نے کروائی۔ بھیا تو صرف پیسے بھیج کر بری الذمہ ہو گئے۔ میکے کے نام پر آپا کے لیے میں اور میرے

ذمہ داری ہی کو نہیں۔ عمر ہی تم ہے وقت گزرنے کے ساتھ خود بخود سمجھ داری آجائے گا۔"

"موبی کی عمر کم ہے۔ میری بھی عمر نہیں نکلی جارہی پھر آپ کو اور صبوحی پھوپھو کو ہمارا رشتہ طے کرنے کی کیا جلدی پڑ رہی تھی۔" اس نے خفگی بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"صرف تمہارے ڈیڈی کی وجہ سے چندا! مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ سبکتگین سے تمہارا رشتہ نہ پکا کردیں اور دیکھ لو۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوگیا نا۔ جیسے ہی میں نے موبی کا نام لیا وہ فوراً سبکتگین کو مد مقابل لے آئے۔"

"بہر حال ممی! میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میرے دل و دماغ جس رشتے پر متفق ہو کر آمادگی ظاہر کریں گے۔ میں اسی کے لیے ہاں کروں گی۔" اس نے سویرا کا رٹایا ہوا ڈائیلاگ دوہرا دیا۔

"ہاں میری جان کیوں نہیں۔ فیصلہ تو تمہارا ہی ہوگا اور میں جانتی ہوں میری بیٹی کے دل و دماغ کس رشتے پر راضی ہوں گے۔" ممی شانت ہو کر مسکرائی تھیں۔

روشا نے انہیں بھی بس دیکھ کر ہی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ گئی تو سویرا سے ملنے تھی لیکن سائرہ خالہ کو سبزی کے ڈھیر سے نبرد آزما دیکھ کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"آپ کے پٹھوں میں پہلے ہی اتنا کھنچاؤ رہتا ہے خالہ اور آپ اکیلی اتنی ڈھیر ساری سبزی بنانے بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ کلی سویرا کہاں ہے۔" وہ ان کے ساتھ میتھی کے ڈنٹھل اور پتے چھانٹنے لگی ساتھ ہی سویرا کے متعلق بھی دریافت کیا۔

"سویرا ابھی گھر کی صفائی ستھرائی سے فارغ ہوئی تھی۔ ٹیپو کے ساتھ مارکیٹ تک گئی ہے۔ کہہ کر گئی تھی کہ سبزی خود آکر بنائے گی لیکن میں فارغ بیٹھے بیٹھے کیا کرتی۔ عمر دو تین دن سے کہہ رہا تھا آلو میتھی پکالیں۔ سویرا اور ٹیپو ناک منہ چڑھاتے ہیں

ہے اپنا ہیں پھر اچانک ہارٹ اٹیک کے سبب اپا بھی مجھ سے بچھڑ گئیں۔

رشتوں کے نام پر تہی دامنی سدا میرا مقدر ٹھہری۔ اللہ نے اولاد بھی ایک ہی دی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں روشا نے کہ میں کس قدر ڈیپریشن کا شکار تھی۔ یہ تمہاری صبوحی پھوپھو تھیں جنہوں نے میری دل جوئی کرنے اور مجھے پھر سے زندگی کی طرف راغب کرنے میں اپنی سی ہر ممکن کوشش کی۔ ورنہ جب ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ میں دوبارہ ماں نہیں بن سکتی تو مجھ میں جینے کی امنگ ہی ختم ہوگئی تھی۔ میری غلطی پر مجھے کسی نے مورد الزام نہیں ٹھہرایا لیکن میں خود کو معاف کرنے پر تیار نہ تھی۔ ہر ماں کی طرح مجھے بھی بیٹے کی فطری خواہش تھی تب صبوحی نے مجھے یقین دلایا کہ موبی اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی بیٹا ہے۔

موبی کے بعد صبوحی کے تین بیٹے مزید ہوئے مگر سچ پوچھو تو موبی جتنا کوئی پیارا نہیں۔ میں اسے واقعی اپنے بیٹوں کی طرح چاہتی ہوں۔ اور وہ بھی میرا اتنا فرماں بردار کہ کیا ہی کوئی سگا بیٹا ہوگا۔ دن ہو یا رات میری ایک پکار پر دوڑا چلا آتا ہے۔ اگر تم موبی کے لیے ہاں کردیتی ہو تو میری ساری فکریں ختم ہوجائیں گی۔ مجھے بیٹوں جیسا داماد مل جائے گا۔"

سارے شامی کباب تلے جا چکے تھے لیکن ممی کی بات اب بھی جاری تھی۔

"میں نہیں چاہتی روشا نے کہ رشتوں کے حوالے سے جیسی ترستی زندگی میں نے گزاری ویسی زندگی تمہارا مقدر ہو۔ سبکتگین سے شادی کی صورت میں تمہیں شوہر اور سسر کے سوا کوئی تیسرا رشتہ نہیں ملے گا اور صبوحی کے گھر تمہیں پیار کرنے والی ساس شفقت لٹانے والا سسر، تین نٹ کھٹ سے دیور غرض اس گھر میں زندگی کا ہر رنگ ملے گا۔ رشتوں کی چاشنی کے ساتھ ساتھ مالی آسودگی بھی حاصل ہوگی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ موبی بھی مزید میچور ہوجائے گا۔ مانا ابھی وہ کچھ لاابالی سا ہے لیکن ابھی اس کے سر پر کوئی

کل کا آلو قیمہ بچا ہوا ہے بس یہ ہی سوچا کہ چلو آج عمر کی فرمائش پوری کردوں۔" نرم خو سی سائرہ خالہ نے مسکراتے ہوئے تفصیلی جواب دیا۔

"یہ عمر بھائی بھی خوب ہیں خالہ۔ سبز پتوں والی سبزیوں کے سوا تیسری کوئی فرمائش نہیں کرتے۔ ساگ، پالک، میتھی، ایسی سبزیوں کے بنانے میں بھی اتنا ٹائم لگ جاتا ہے اور میں بتاؤں خالہ کہ ایسے لاڈ صرف آپ جیسی مائیں اٹھاتی ہیں۔ ذرا عمر بھائی کی شادی ہولینے دیں۔ اپنی بیگم سے آلو، بیگن اور آلو مٹر جیسی سبزیوں کی ہی فرمائش کریں گے۔" اس نے پیشن گوئی کی تھی۔ سائرہ خالہ مسکرادیں۔

"میرا عمر بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ وہ بھی سبزیاں بہت شوق سے کھاتے تھے۔ ساگ اور آلو میتھی تو ان کی بھی مرغوب غذا تھی۔"

سائرہ خالہ نے مرحوم شوہر کو یاد کیا۔ جاوید انکل کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا لیکن اب بھی سائرہ خالہ کی گفتگو ان کے ذکر اور حوالوں کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھی۔

روشانے نے انہیں محبت سے دیکھا، شفیق چہرے اور نرم خو مسکراہٹ والی اس عورت نے بیوگی کا طویل عرصہ کتنے صبر اور پروقار طریقے سے کاٹا تھا۔ زرعی زمینوں کی محدود آمدنی اور جاوید انکل کی پنشن سے ہی انہوں نے اپنے بچوں کو پالا پوسا تھا۔

انہیں اپنی خودداری اور عزت نفس بہت عزیز تھی۔ مشکل وقت میں بھی سگے رشتے داروں تک کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا اور اللہ نے ان کے صبر کا کتنا خوبصورت اجر دیا۔ فرماں بردار اور قابل اولاد ان کے فخر کا سامان تھی۔

عمر قابل ڈاکٹر بن چکا تھا۔ سویرا ایم اے انگلش کے لاسٹ سمسٹر میں تھی۔ سب سے چھوٹا ٹیپو ایف ایس سی کر رہا تھا اور امید تھی وہ بھی عمر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میڈیکل کا پروفیشن ہی اپنائے گا۔

"اس مہینے کی بارہ تاریخ کو تمہارے انکل کی گیارہویں برسی ہے۔ گیارہ برس گزر گئے اور لگتا ہے کل کی بات ہے۔" سائرہ خالہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اب آپ جلدی سے عمر بھائی کی شادی کردیں خالہ! گھر میں رونق ہوجائے گی۔" روشانے نے فوراً ان کا دھیان بٹانا چاہا تھا۔

"ہاں بیٹا بس اب تو......"

"امی! میرے موبائل کا چارجر نہیں مل رہا۔" اندر کمرے سے عمر نے باآواز بلند پکارا تھا۔ روشانے نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ اسے کیا خبر تھی عمر اس وقت گھر پر ہے۔ وہ کس بے تکلفی سے خالہ سے گفتگو فرمارہی تھی۔

"بیٹا سویرا آتی ہے تو ڈھونڈ کردے گی۔" خالہ نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے ہانک لگادی تھی۔

"اتنی دیر ہوگئی جانے یہ دونوں بہن بھائی بازار میں کر کیا رہے ہیں۔ ٹیپو کی دوست کی سالگرہ ہے، صرف ایک گفٹ خریدنا تھا۔ اور سوا گھنٹہ ہوگیا دونوں کو گئے۔" سائرہ خالہ کچھ خفگی بھرے انداز میں بڑبڑائی تھیں۔ روشانے نے ان کے ساتھ مل کر ساری سبزی بنالی تب سویرا اور ٹیپو کی آمد ہوئی۔

"روشانے آپی میں نے بائیولوجی کی کچھ ڈایاگرامز بنوانی ہیں آپ سے، بنادیں گی نا؟" ٹیپو نے اسے دیکھ کر چھوٹتے ہی پوچھا۔

"پوچھ تو ایسے رہے ہو جیسے پہلے کبھی نہیں بنائی۔" روشانے نے ہنس کر اسے چھیڑا۔ وہ بھی ہنس پڑا تھا۔

سائرہ خالہ سبزی لے کر کچن میں چلی گئیں تو سویرا اسے لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

"ہاں بتاؤ معاملہ کہاں تک پہنچا؟" سویرا نے مسکرا کر پوچھا۔

"چھوڑو یار! سوچ سوچ کر میرا دماغ پک گیا ہے۔ دھیان بٹانے کے لیے تمہاری طرف آئی ہوں اور تم نے پھر وہ ہی ذکر چھیڑ دیا۔" روشانے بے زار ہوئی تھی۔

"انکل، آنٹی کو جواب تو دینا ہے نا ڈیئر سوچنا تو پڑے گا۔" سویرا نے کہا۔

وہ ہی تو مجھ سے نہیں کہا کہ کیا کروں۔ ڈیڈی سے بات کروں تو وہ سبکتگین بھائی کی تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں۔ ممی، موبی سے شادی کے فائدے گنوانے لگ جاتی ہیں۔ دونوں کی ہی باتیں درست لگتی ہیں۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہوجاتا ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"دماغ تو ماؤف ہوتا ہے۔ دل کیا کہتا ہے۔" سویرا معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کمر بستہ ہوگئی تھی۔ کس مصیبت میں گرفتار تھی اس کی سہیلی، مسئلے کا کچھ نہ کچھ حل تو نکالنا ہی تھا نا۔

"میرا تو دل بھی کچھ نہیں کہتا۔ سبکتگین بھائی بھی برے نہیں لگتے لیکن مجھے وہ ہمیشہ بڑے بھائیوں جیسے لگے ہیں اور موبی تو ہمیشہ ہی چھوٹے بھائیوں جیسا لگتا تھا۔ عمر میں مجھ سے چند ماہ بڑا ہی لیکن اس میں بچپنا بہت ہے۔ ویسے عادتوں کا اچھا ہے۔ فرینڈلی اور ہنس مکھ سا۔ دونوں کا موازنہ کرنے کے باوجود دل بالکل خاموش ہے۔ کسی ایک کے حق میں بھی فیصلہ نہیں ہو پارہا۔" اس نے بے بسی سے حقیقت بتائی تھی۔

"اچھا چھوڑو۔ اپنے دل و دماغ پر مٹی پاؤ۔ سیانے کہتے ہیں شادی اس سے کرو جو آپ سے محبت کرتا ہو نہ کہ اس سے جس کو آپ چاہتے ہو۔ تم بس یہ اندازہ لگاؤ کہ سبکتگین بھائی اور موبی میں سے کون تمہیں چاہتا ہے بس اس کے حق میں فیصلہ کرلو۔"

"سبکتگین بھائی اور موبی میں سے مجھے کون چاہتا ہے، یہ مجھے کیسے پتہ چلے گا؟" اس نے ہونق پن سے دریافت کیا۔

"ان کی آنکھوں سے ڈفر، ہمارے ڈائجسٹوں میں کیا لکھا ہوتا ہے، محبت آنکھوں سے چھلکتی ہے آپ جس سے محبت کرتے ہیں، اسے دیکھتے ہی آپ کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اب تم نے سبکتگین بھائی اور موبی کی آنکھوں میں وہ وہی چمک ڈھونڈنی ہے۔ اس موازنے میں جو جیتا وہ سلطانا۔ میرا مطلب ہے وہ ہی تمہارا سرتاج بننے کا اہل ہوگا۔"

سویرا نے کیا پتے کی بات بتائی تھی۔ روشانے اس کی عقل مندی کی قائل ہو کر اسے توصیفی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

اس کا دل کررہا تھا سویرا کی گردن مروڑ دے۔ کس احمقانہ کام پر لگا دیا تھا اس نے۔ سبکتگین بھائی، واصف انکل کو چھوڑنے آئے تھے۔ معمول کے مطابق روشانے نے بھی ان سے سلام دعا کی۔ وہ حسب سابق اس کی پڑھائی وغیرہ کے متعلق بات کرنے لگے۔ وہ ہوں ہاں میں ان کے سوالوں کے جواب دینے کے ساتھ ان کی آنکھوں میں وہی چمک ڈھونڈنے لگی جو سویرا کے مطابق اسے دیکھ کر نمودار ہوتی تھی۔ آنکھوں کے آگے چشمہ تھا۔ چمک کیا خاک نظر آتی۔ وہ مایوس ہو کر ان کے اور واصف انکل کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ رات کو ممی کے پاس کسی کام سے موبی نے بھی چکر لگایا تھا۔ روشانے اسے بھی آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی تھی۔

"نئے لینس لگائے ہیں۔ کلر سوٹ کررہا ہے نا مجھ پر؟" موبی نے اس کی نگاہوں کے ارتکاز کا کچھ اور ہی مطلب نکالتے ہوئے خوشی کے عالم میں دریافت کیا۔

"ہاں بہت سوٹ کررہے ہیں۔" اس نے گہری سانس کھینچتے موبی کی تائید کرڈالی۔ بے چارے کا دل توڑنے سے کیا حاصل تھا۔ لیکن سویرا کا سر توڑنے کا ارادہ مزید پکا ہوگیا۔

مہم کی ناکامی کے بارے میں جان کر سویرا دانت نکوسنے لگی تھی۔

"اچھا تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میرے پاس اور بھی بہت سے آئیڈیے ہیں۔" روشانے کی خون خوار گھوری کی تاب نہ لاتے ہوئے سویرا نے فوراً دانت اندر کیے۔

"اب مجھے تمہارا کوئی آئیڈیا نہیں چاہیے۔ میں آل ریڈی ایک فیصلے پر پہنچ چکی ہوں۔" روشانے نے بھرپور سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

سویرا ابھی سنجیدہ ہوئی۔
''کون سبکتگین بھائی نا؟'' اس نے اندازہ لگایا
روشانے نے نفی میں گردن ہلادی۔
''تو تم نے موبی کے حق میں فیصلہ کرلیا؟''
سویرا نے قدرے بے یقینی سے پوچھا۔ روشانے نے اس بار بھی نفی میں گردن ہلائی تھی۔ ''پھر منہ سے کچھ پھوٹو تو سہی کیا سوچے بیٹھی ہو۔''
''میری زندگی کا کوئی گوشہ تم سے چھپا ہوا نہیں ہے سویرا۔ مجھے ممی، ڈیڈی کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے جن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا یہ بھی تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔
ممی ڈیڈی دونوں مجھے بے تحاشا چاہتے ہیں لیکن دونوں ہی یہ توقع کرتے ہیں کہ میں ان کی بات کی تائید کروں گی اور ان کی پسند کو ہی اپناؤں گی۔
بچپن میں ممی میرے کھیلنے کے لیے ڈول ہاؤس لاتیں تو ڈیڈی باربی ڈول لے آتے۔
ڈیڈی کہتے مجھے گڑیا زیادہ اچھی لگتی ہے ممی مصر ہوتیں کہ مجھے گڑیا سے زیادہ گڑیا کے گھر میں دلچسپی ہے۔ اتنی کم عمری میں بھی ممی ڈیڈی کا جھگڑا نمٹانے کی غرض سے یہ اعلان کرتی کہ مجھے گڑیا اور گڑیا کے گھر سے زیادہ اسٹوری بکس اور کلرز پنسل جیسی چیزیں زیادہ اچھی لگتی ہیں پھر ممی ڈیڈی دونوں ہی میرے لیے میری پسند کی چیز لادیتے۔
کھانے کی میز پر آج کیا پکایا جائے ٹائپ کا سوال ہوتا تو ممی کہتیں روشانے کو بریانی پسند ہے میں آج وہ پکاؤں گی۔ ڈیڈی مجھ سے پوچھتے کیوں روشانے بیٹا تمہیں بریانی سے زیادہ اچھا پلاؤ لگتا ہے نا۔ ممی، ڈیڈی کی بحث طول پکڑ جاتی آخر مجھے اعلان کرنا پڑتا کہ مجھے پلاؤ اور بریانی دونوں سے زیادہ اچھے فرائڈ رائس لگتے ہیں۔
میٹرک کے بعد سبجیکٹس چننے کے معاملے پر بھی تمہیں یاد ہے نا ممی، ڈیڈی کے درمیان کیسی جنگ عظیم ہوئی۔ ممی مجھے میڈیکل میں بھیجنا چاہ رہی تھیں۔ ڈیڈی کہتے تھے میٹرک میں میتھس اور فزکس میں میرے نمبرز زیادہ اچھے آئے ہیں، اس لیے مجھے پری انجینئرنگ کرنی چاہیے۔ آخر ممی ڈیڈی کے جھگڑے سے تنگ آکر میں نے انہیں اپنا فیصلہ سنایا کہ میں سویرا کی طرح انگلش لٹریچر رکھوں گی اور ایک بار تمہیں یاد ہے نا......
''مجھے ایک ایک بات یاد ہے روشانے، تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن یہ معاملہ سبجیکٹس چننے سے کچھ آگے کا ہے۔ اب بات لائف پارٹنر کے انتخاب کی ہے۔ دونوں پرپوزلز بہترین ہیں، صرف ممی ڈیڈی کے اختلاف کے ڈر سے تم یہ پرپوزل ٹھکرا رہی ہو تو کہیں یہ کفران نعمت کے زمرے میں تو نہیں آئے گا۔ موبی اور سبکتگین بھائی دونوں ہی بہترین چوائس ہیں۔ کیا گارنٹی ہے کہ ان رشتوں کو ٹھکرانے کے بعد تمہیں کوئی اچھا بندہ مل جائے گا۔ اجنبی انجان لوگوں میں شادی کرنے میں سو قباحتیں ہوسکتی ہیں روشانے! تم نے ڈائجسٹ میں تجھ سے ناتا جوڑا ہے والا سلسلہ نہیں پڑھا۔ لڑکیاں بے چاری کیسے ہولناک اور خطرناک قسم کے سسرالیوں کی تفصیلات بتاتی ہیں۔'' سویرا نے اسے خلوص دل سے سمجھانا چاہا تھا۔
''میں نے ہر پہلو پر غور کیا ہے سویرا لیکن پھر اپنا مستقبل اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ نے جو میرے نصیب میں لکھا ہوگا مجھے وہ ہی ملے گا۔ مجھے ممی ڈیڈی کی چپقلش گوارا نہیں اور اگر میں سبکتگین بھائی کے لیے ہاں کروں گی تو ممی میرا فیصلہ قبول تو کرلیں گی لیکن انہیں میری زندگی ہمیشہ قابل رحم لگے گی! اگر شادی کے بعد معمولی سی بھی اونچ نیچ ہوئی تو وہ طعنے مار مار کر ڈیڈی کا براحشر کردیں گی۔
موبی کے لیے اقرار کی صورت میں مجھے یہ گوارا نہ ہوگا کہ ڈیڈی میرے شوہر کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھیں یا اس کے لیے تحقیر بھرے کلمات ادا کریں۔ تمہیں پتا ہے ابھی پرسوں کی بات ہے بے چارہ موبی شارٹس پہن کر ممی سے ملنے چلا آیا۔ ڈیڈی نے اس کے منہ پر کہہ دیا صاحبزادے ہمارے ہاں

شریفانہ لباس پہن کر آیا کرو۔ وہ تو مونی ڈیڈی کی باتوں کا برا نہیں مانتا کھلکھلا کر ہنس پڑا لیکن بعد میں ممی ڈیڈی پر خوب خفا ہوئیں۔ مونی سے شادی کی صورت میں یہ اپنی سوڈ ہمارے گھر میں بار بار نشر ہوا کرے گی۔ ڈیڈی اسے کبھی دامادوں والا پروٹوکول نہیں دیں گے۔ وہ اسے ہمیشہ ممی کے چہیتے کی نظر سے دیکھیں گے جیسے ممی سبکتگین بھائی کو ڈیڈی کے لاڈلے کی حیثیت سے دیکھتی ہیں۔

میری شادی کے بعد بھی ممی ڈیڈی یوں ہی چونچیں لڑاتے رہیں یہ مجھے قطعاً منظور نہیں۔'' روشانے قطعیت بھرے انداز میں مخاطب ہوئی۔

''پھر تم نے کیا سوچا ممی ڈیڈی کو کس طرح انکار کرو گی؟'' سویرا نے اس کے نقطہ نظر سے قائل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سوچنا میرا نہیں تمہارا کام ہے۔ میرے پاس اتنا دماغ کہاں۔'' روشانے اس بار مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ سویرا اسے گھور کر رہ گئی۔

☆☆☆

عمر ڈیڈی کا بلڈ پریشر چیک کرنے گھر آیا تھا۔ ڈیڈی کا بلڈ پریشر عموماً ہائی رہتا تھا۔ عمران کے بنا کہے ہفتہ دس دن میں خود ہی ان کا بلڈ پریشر چیک کرنے آجاتا تھا۔ وہ بلڈ پریشر چیک کر کے واپس گھر جانے لگا تو روشانے پر نگاہ پڑی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے، تھوڑی گھٹنوں پر ٹکائے جانے کسی سوچ میں مگن تھی۔

''کیا ہوا روشانے؟ کن سوچوں میں گم ہو؟'' عمر اسے مخاطب کیے بنا نہ رہ پایا، وہ بھی جیسے یک دم چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا عمر بھائی؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''تم مجھے آج کل بہت ست دکھائی دیتی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' وہ متفکر ہو کر پوچھ رہا تھا۔

''طبیعت کو کیا ہونا ہے۔ ٹھیک ہوں عمر بھائی!'' وہ پھیکی سی ہنسی لبوں پر لاتے ہوئے بولی۔ اب عمر بھائی کو کیا بتاتی کہ رات کو ممی، ڈیڈی کا زبردست قسم کا جھگڑا ہوا ہے۔ ممی کو لگ رہا تھا کہ ڈیڈی روشانے کی رائے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، بالکل یہ ہی خیال ڈیڈی کا ممی کے بارے میں تھا اور روشانے کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے کہ ممی، ڈیڈی، دونوں کو ہی ایک بار میں صاف انکار بھی کر دے اور وہ دونوں زیادہ ہرٹ بھی نہ ہوں۔

مصیبت یہ تھی کہ اس بار سویرا کا دماغ بھی چل کر نہ دے رہا تھا۔ اس کی تجویزوں کی پٹاری سے کوئی تجویز یا آئیڈیا برآمد نہ ہوا تھا۔

روشانے ذرا جز بز ہوئی۔ عمر بھائی ہر وقت اپنی ڈاکٹری کی دکان کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔

''میں وہ کیپسولز باقاعدگی سے لے رہی ہوں عمر بھائی!'' اس نے سفید جھوٹ بول کر انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

''لگتا تو نہیں ہے۔'' عمر نے نفی میں گردن ہلائی۔

''توبہ ہے عمر بھائی! میری بات کا یقین ہی نہیں۔ اللہ کسی ڈاکٹر کو آپ کا پڑوسی نہ بنائے۔'' وہ کچھ جھلا کر بولی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے اپنی بدتہذیبی کا احساس بھی ہو گیا۔

''میں ایک دو دن میں ڈیڈی کے ساتھ آپ کے ہاسپٹل آجاؤں گی۔ جتنا مرضی خون نکالنا ہو، میرا مطلب ہے بلڈ سیمپل لے کر جتنے مرضی ٹیسٹ کرنے ہوں کر لیجیے گا پھر جس بھی چیز کی کمی بیشی ہو میڈیسن لکھ دیجیے گا میں باقاعدگی سے دوا کھالوں گی۔''

اس بار تمیز سے انہیں مخاطب کر کے ان کی تسلی کروانے کی کوشش کی عمر ایک لمحے کو مسکرایا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے جانے کے بعد روشانے نے سر جھٹکا پتا نہیں عمر بھائی کو اس کی صحت کی اتنی پروا کیوں رہتی

ہے۔ پھر اچانک ہی کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔ اس کی صحت کی پروا تو ممی ڈیڈی کو بھی خوب رہتی ہے۔ اسے اگر کبھی چار چھینکیں آجاتیں ممی اسے یخنی پلاکر دم لیتیں اور ڈیڈی جوشاندہ لینے کی تاکید کرتے۔

طبیعت خرابی کے لحاظ سے اس کا ٹریک ریکارڈ کچھ اتنا ہی شاندار تھا۔ بدلتا موسم بھی اس پر سب سے پہلے اثر انداز ہوتا اور کھانے پینے میں ذرا سی لاپروائی اور بے احتیاطی، اس کی طبیعت خرابی کا فوری سبب بن جاتی۔ اس کا گلا بھی بہت حساس تھا۔ اسکول کالج میں دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی وہ کوئی کھٹی چیز کھالیتی تو اس کا گلا فوراً خراب ہوجاتا۔

ان کے فیملی ڈاکٹر نے ممی ڈیڈی کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ اسے کھٹائی سے سخت پرہیز کروایا جائے۔ ممی ڈیڈی دونوں ہی ڈاکٹر کی نصیحت پر پورا پورا عمل کرتے لیکن تمام تر احتیاط کے باوجود جب بھی اسے بخار چڑھتا تو اترنے کا نام نہ لیتا۔ ممی ڈیڈی اس کی بیماری پر اس سے زیادہ پریشان ہوجاتے۔

"ٹھیک ہے روشانے بی بی، اب تمہیں ایک بار بیمار ہونا ہی پڑے گا ورنہ بات نہیں بننے والی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

سویرا اس کے آئیڈیے سے کچھ ایسی متفق نہ تھی۔

"کچھ اور حل سوچ لیتے ہیں روشانے! اپنی جان پر کیوں ظلم کرتی ہو۔ جب تمہاری طبیعت خراب ہوتی ہے تو جلد ٹھیک ہونے میں ہی نہیں آتی۔" پرخلوص سہیلی کو اس کا بیمار پڑنا گوارا نہ تھا لیکن روشانے کو اب اس کے متفق ہونے سے بھی کوئی غرض نہ تھی اسے پتا تھا کہ سویرا کو اس کا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔ چار دن تک اس نے ممی، ڈیڈی سے چھپ کر خوب اچار کھایا۔ یونیورسٹی سے واپسی پر گول گپے کھائے سو کھائے۔ کھٹائی والا پانی بھی پیا۔ آئس کریم، قلفی، برف کا گولہ۔

غرض اس موسم میں اسے جن چیزوں کا سختی سے پرہیز تھا اس نے وہ ساری چیزیں رج کر اور ڈٹ کر کھائی تھیں لیکن اس بار جانے کیا ہوگیا تھا۔ گلے میں معمولی خراش کے سوا کوئی انفیکشن ہوکر ہی نہ دے رہا تھا اور جس دن اس نے مایوس ہوکر اپنی کوششیں ترک کردیں بلکہ گلے کی خراش کے لیے نمک ملے نیم گرم پانی کے غرارے کرنے کا ارادہ کیا اسی شام کو اسے بخار چڑھ گیا۔ غراروں کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس نے خوشی خوشی بستر سنبھال لیا۔

رات بخار خوب تیز ہوگیا۔

عمر ہاسپٹل میں تھا ڈیڈی نے اس سے فون پر ہی نسخہ لکھوایا لیکن ممی کی تسلی نہ ہوئی انہوں نے ڈیڈی کے ساتھ اسے اپنے فیملی فزیشن کے پاس بھیج کر دم لیا۔ انجیکشن اور دوا کے بعد اسے کسی قدر افاقہ ہوا تو ممی ڈیڈی کی پریشانی قدرے کم ہوئی۔ پلان کے مطابق سویرا بھی سہیلی کے پاس موجود تھی۔

"آپ دونوں سکون سے سوجائیں۔ میں ہوں نا روشانے کے پاس۔" اس نے ممی، ڈیڈی کو مخاطب کیا۔ اتفاق سے آج سائرہ پھپو کے ساتھ بہن کی ساس کے انتقال پر ساہیوال گئی تھیں۔ عمر کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ سویرا کو روشانے کے پاس ہی رکنا تھا۔ خالہ کی ساس بہت اچھے وقت پر گزری تھیں۔ اب ان کا پلان کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے سویرا بیٹی۔ آپ سکون سے جاکر سوئیں۔ ویسے بھی آپ نیند کی گولی لے کر سوتی ہیں۔ سرہانے کوئی ڈھول بھی بجائے تو آپ کی آنکھ نہیں کھلتی۔ روشانے کے پاس سوکر کیا کریں گی۔" ڈیڈی نے ممی کو مخاطب کیا۔ وہ روشانے کے سرہانے سے ہلنے کو تیار نہ تھیں۔

"میں تو گولی کھاکر سوتی ہوں تب گہری نیند آتی ہے۔ آپ کے تو بغیر گولی کھائے ہی کمرے میں خراٹے گونجتے رہتے ہیں۔"

ممی چڑ کر بولی تھیں۔ ڈیڈی بھی کوئی جوابی وار کرنے والے تھے لیکن پھر روشانے کی طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے چپ ہوگئے۔ سویرا، روشانے کے

پاس تھی اس لیے دونوں قدرے بے فکر ہو کر سونے چلے گئے۔

رات کے آخری پہر روشانے کو پھر تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ جسم پر کپکپی طاری تھی لیکن دماغ پوری طرح چوکس تھا۔ ممی نے فجر کی نماز پڑھ کر بیٹی کے کمرے میں جھانکا تو سویرا اس کے سرہانے بیٹھی ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھ رہی تھی۔

''ہائے میرے اللہ اتنا تیز بخار، سویرا بیٹا تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا۔'' ممی نے اس کی کلائی چھو کر بخار کی شدت کا اندازہ لگایا تو سخت متوحش ہو گئیں۔

''میں بس آپ کو جگانے ہی والی تھی آنٹی! رات بھر روشانے بہت بے چین رہی ہے۔ پتا نہیں کیا کچھ بڑبڑاتی بھی رہی ہے۔ مجھے تو خدشہ ہے کہیں بخار نے دماغ پر اثر تو نہیں کر دیا۔'' سویرا پریشانی سے بولی تھی۔ اتنے میں ڈیڈی بھی آ نکلے تھے۔ ماں، باپ کو اکٹھا دیکھ کر روشانے کی بڑبڑاہٹیں پھر شروع ہو گئی تھیں۔

''میں ممی کی بات نہیں مانوں گی تو وہ ہرٹ ہو جائیں گی ڈیڈی؟'' اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر ڈیڈی کو دیکھ کر انہیں ہولے سے مخاطب کیا تھا۔ ڈیڈی تڑپ کر آگے آئے تھے۔

''روشانے بیٹا! آپ دماغ پر زور نہ دو۔ ریلیکس کرو۔''

''ممی آپ مجھ سے خفا مت ہوں۔ میں ڈیڈی کی اچھی بیٹی بنوں گی۔''

''اس بار نقاہت بھرے انداز میں ماں کو مخاطب کیا۔ باتوں میں ربط کی کمی تھی صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پوری طرح حواسوں میں نہیں۔

''روشانے میری جان الٹی سیدھی سوچوں سے دماغ کو مت تھکاؤ۔ پہلے ہی اتنا تیز بخار ہو رہا ہے۔'' ممی اس کی حالت دیکھ کر بے چین ہو رہی تھیں۔

''مجھے تو یہ ہی لگتا ہے آنٹی کہ بخار دماغ کو چڑھ رہا ہے۔ ساری رات یہ ایسی ہی باتیں کرتی رہی ہے۔ کبھی کہتی ہے مجھے ممی کا فیصلہ قبول ہے، کبھی بڑبڑاتی کہ میں ڈیڈی کی بات مانوں گی۔ کیا آپ دونوں نے اس سے کوئی بات منوائی تھی انکل، آنٹی؟'' سویرا نے بھولپن سے دونوں کو مخاطب کیا۔

ممی، ڈیڈی دونوں نے نگاہیں چرالیں۔

ڈیڈی عمر کو کال کر کے پوچھنے لگے کہ وہ ڈیوٹی آف کر کے کب تک لوٹے گا۔ ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھنے کی ذمہ داری ممی نے سنبھال لی تھی۔

بخار قدرے کم ہوا تو ڈیڈی نے اسے دوا پلائی۔ اگلے دو دن تک اس کی طبیعت میں بہتری آ گئی تھی لیکن نیند کے عالم میں ابھی تک ویسی ہی بڑبڑاتیں جاری تھیں۔

''عمر بھائی کہہ رہے تھے کہ صرف گلے کے انفیکشن کی وجہ سے روشانے کو بخار نہیں چڑھ رہا۔ اس کی کنڈیشن بتا رہی ہے کہ یہ بہت زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار ہے لیکن عمر بھائی کہہ رہے تھے انکل آنٹی کو کچھ نہ بتانا۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔''

سویرا نے اکیلے میں ممی کو اعتماد میں لیا۔ صبح ڈیڈی کو اکیلے پا کر یہ ہی بات ان سے بھی کر چکی تھی۔ دل میں البتہ دعا یہ ہی کر رہی تھی کہ وہ دونوں عمر بھائی سے اس بات کی تصدیق نہ کریں لیکن شکر ہوا کہ یہ نوبت پیش نہ آئی۔ وہ دونوں ہی بہت چپ چپ سے تھے۔ روشانے کی حالت نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

عمر روز روشانے کے چیک اپ کے لیے آتا تھا۔ بعد میں سویرا ممی ڈیڈی کے سامنے روشانے کے ذہنی دباؤ کا لازمی ذکر کرتی۔

''بھائی! مجھ سے پوچھتے ہیں کہ روشانے کو کیا ذہنی پریشانی ہے۔ میں انہیں کیا بتاؤں کہ اس معاملے میں تو روشانے نے کبھی مجھے بھی اعتماد میں نہیں لیا، ہاں یہ مجھے پتا ہے کہ وہ بہت دنوں سے الجھی، الجھی اور پریشان تھی۔ پڑھائی میں اس کا دھیان بالکل نہ لگ رہا تھا۔ اکثر سر درد کی شکایت

کرتی۔ میں وجہ پوچھتی تو کہتی رات نیند ٹھیک سے نہیں آئی۔ اب یہ نیند کیوں نہیں آتی تھی یہ بات اس نے مجھے بھی نہ بتائی۔ شاید آپ دونوں کو اس بارے میں کچھ علم ہو۔"

سویرا اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے ممی، ڈیڈی سے دریافت کرتی۔ ان کے چہروں کے تاثرات بتا دیتے کہ تیر ٹھیک نشانوں پر لگ رہے ہیں۔ پھر وہ ہی ہوا جو روشانے کی خواہش تھی۔

☆☆☆

"میں نے صبوحی سے معذرت کر لی ہے پروفیسر صاحب! میرے لیے میری بچی کی صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں اور ویسے بھی کوئی باضابطہ بات تھوڑی ہوئی تھی۔ یہ تو میری اور صبوحی کی خواہش تھی۔ اندازہ اسے بھی تھا کہ آپ مشکل ہی سے مانیں گے۔ اس نے میری معذرت خوش دلی سے قبول کر لی، وہ روشانے کو بہت چاہتی ہے۔ خود اس کی حالت دیکھ کر گئی ہے۔ وہ تو مجھ پر خفا ہو رہی تھی کہ آپ نے اور بھائی نے اسے اتنی ذہنی ٹینشن دی ہی کیوں۔

موبی بے چارہ بھی آپ سے خوب ڈرتا ہے۔ میری اور صبوحی کی محبت میں وہ اس رشتے پر راضی تو ہو گیا تھا۔ لیکن جب اسے پتا چلا ہے کہ اس کے ہٹلر ٹائپ ماموں اس کے سسر بننے نہیں جا رہے تو خوشی سے چھلانگیں لگا رہا ہے۔ ہم سے غلطی ہو گئی تھی، بچوں کی دلی آمادگی کو پس پشت ڈالتے ہوئے یہ رشتہ جوڑنے چلے تھے۔"

ممی بہت آزردگی مگر اعلاظرفی سے اپنی غلطی کا اقرار کر رہی تھیں۔

"لاحول ولا قوۃ، یعنی کہ آپ نے صبوحی کو انکار کر دیا۔ نہ رشتے کی بات شروع کرنے سے پہلے مجھے اعتماد میں لیا نہ بات ختم کرتے وقت۔ مجھے پہلے پتا ہوتا تو میں واصف سے معذرت تو نہ کرتا۔ جب ہم دونوں ہی سبکتگین کے رشتے پر متفق ہو جاتے تو روشانے کی پریشانی تو خود بخود ختم ہو جاتی نا؟"

ڈیڈی نے ممی کو خفگی سے دیکھا۔

"اوہ! یعنی کہ آپ بھی واصف بھائی کو انکار کر چکے ہیں۔" ممی خوشی سے چہکیں۔ ڈیڈی بس انہیں خشمگیں نگاہوں سے گھورتے رہے۔

"اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے پروفیسر صاحب! بہت اچھا ہوا جو آپ نے واصف بھائی کو انکار کر دیا کیونکہ اس وقت روشانے کی ذہنی حالت کے پیش نظر میں آپ سے سبکتگین کے رشتے پر اختلاف نہ کرتی اور اپنی رضامندی دے دیتی لیکن اس رشتے کے حوالے سے میرے ذہن میں جو تحفظات ہیں، وہ کبھی ختم نہ ہوتے اور روشانے میرے ذہنی تحفظات سے بخوبی آگاہ ہے۔

شادی کے بعد ہر مثالی گھرانے میں بھی تھوڑے بہت اختلافات اور معمولی سی اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے اور بیٹی میکے آ کر ماں سے ہی دکھ سکھ کہتی ہے لیکن سبکتگین سے شادی کی صورت میں روشانے کبھی مجھ سے اپنے دکھ سکھ نہ کہتی صرف اس ڈر سے کہ کہیں میں اس کے ڈیڈی کو طعنے نہ مارنا شروع کر دوں۔

میری بیٹی بہت حساس ہے پروفیسر صاحب! وہ ہم دونوں سے بہت محبت کرتی ہے اور ہمارے جھگڑوں سے ہر بار ہی بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ہم دونوں اس سے محبت کے دعوے دار تو ہیں لیکن ہماری وجہ سے ہی وہ اس ذہنی اذیت میں مبتلا ہوئی۔ اچھا ہوا جو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ہم نے اپنی غلطی سدھار لی ہے۔

دنیا سبکتگین اور موبی پر ختم نہیں ہوتی اور ویسے بھی جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ جو میری بیٹی کے نصیب میں ہے اسے وہ ہی ملے گا۔" ممی متانت بھرے انداز میں مخاطب تھیں۔

"سال، چھ مہینے میں آپ ایک بار عقل کی بات کر لیتی ہیں بیگم صاحبہ اور شاید آج وہ ہی دن ہے۔"

ڈیڈی نے مسکرا کر انہیں چھیڑا۔ ممی نے انہیں

گھورنا چاہا مگر پھر خود بھی مسکرا دی تھیں۔

☆☆☆

''تم نے میرے حوالے سے انکل سے یہ کیوں کہا کہ روشانے کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ وہ بہت تشویش میں مبتلا تھے اور مجھ سے کوئی میڈیسن لکھوانا چاہ رہے تھے۔'' عمر نے سویرا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

''انکل نے یہ بات آپ سے کل یا پرسوں کی ہوگی عمر بھائی۔ اب وہ دوبارہ آپ سے یہ بات نہیں کریں گے۔ الحمدللہ روشانے اب بالکل ٹھیک ہے۔ ہر قسم کی ٹینشن سے آزاد۔'' سویرا نے مسکرا کر بھائی کو جواب دیا مگر اس کی گھورتی نگاہوں سے خائف ہو کر تھوڑا سا گڑبڑائی۔

سوری عمر بھائی! میں نے آپ کے حوالے سے جھوٹ بولا۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔'' وہ منمنا کر بولی۔

''پہیلیاں مت بجھواؤ سویرا۔ پوری بات بتاؤ۔'' عمر خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔

بھائی کے تیور دیکھ کر سویرا گھبرا گئی تھی۔ پھر بہت جھجکتے ہوئے اسے الف سے یے تک ساری بات بتانی پڑی تھی۔ عمر لب بھینچے ساری بات سنتا رہا تھا۔ بات سن کر اس نے سویرا کو جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ جان چھوٹی سو لاکھوں پائے کے مصداق وہاں سے فوراً فو چکر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''میرے لعل تو نے یہ بات مجھ سے پہلے کیوں نہ کی؟'' سائرہ نے خوشی کے مارے بیٹے کا ماتھا چوم لیا تھا۔ عمر ذرا خجل سا ہو کر مسکرا دیا تھا۔

''میں تو جب بھی روشانے کو دیکھتی تھی، دل سے یہ ہی دعا نکلتی تھی کہ اللہ مجھے ایسے ہی مزاج کی بہو دے۔''

''ایسے مزاج کی کیوں، وہ ہی کیوں نہیں امی! آپ نے کبھی یہ دعا کیوں نہ کی۔'' عمر نے مسکرا کر پوچھا۔

''میں ان ماؤں میں سے نہیں عمر جو اولاد پر اپنی مرضی تھوپتی ہیں۔ میری اولاد لاکھ فرماں بردار سہی لیکن میں اولاد کی فرماں برداری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ میرا خیال تھا تم اپنے پروفیشن سے ہی شریک حیات کا انتخاب کرو گے۔ اتنی ڈھیر ساری تو تمہاری سہیلیاں ہیں جن کے فون بھی آتے رہتے ہیں۔'' سائرہ سادگی سے بولی تھیں۔ عمران کی سادگی پر ہنس پڑا تھا۔

''وہ میری سہیلیاں نہیں امی! صرف کولیگز ہیں اور خیر سے سب کی سب منگنی شدہ اور شادی شدہ ہیں۔''

''تو بیٹا جی! میں نے جب بھی تم سے پوچھا کہ لڑکی تم پسند کرو گے یا میں ڈھونڈنا شروع کروں تو تم ہر بار یہ بات ٹال کیوں دیتے تھے۔ دل کی بات ماں کو پہلے کیوں نہ بتائی۔'' سائرہ کا شکوہ بجا تھا۔

''میں روشانے کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا امی! آپ کو بتاتا تو آپ سویرا کو بتائے بغیر نہ رہ پاتیں اور سویرا کے پیٹ میں یہ بات کب ٹھہرتی۔ وہ اپنی سہیلی کو اس راز میں شریک کر لیتی اور پھر میری خواہش تھی کہ میں پہلے سویرا کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں پھر اپنے بارے میں سوچوں۔''

''حد ہو گئی عمر! تم سوچتے رہ جاتے چاہے اس بچی کے ماں باپ اپنے بھانجوں سے اس کا رشتہ ہی طے کر دیتے۔ جہاں تک سویرا کا تعلق ہے اللہ نے چاہا تو مناسب وقت آنے پر اس کا بھی رشتہ طے پا جائے گا۔

میں ان ماؤں میں سے نہیں جو بیٹیوں کے پیچھے بیٹے کی شادی لٹکائیں۔ میں آج ہی روشانے کے ہاں جاتی ہوں۔ سویرا نے بتایا ہے کہ روشانے کے ممی ڈیڈی کے بھانجوں کو انکار ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کا کوئی رشتہ اور آئے، میں رشتہ لے جاتی ہوں۔''

سائرہ قطعیت سے بولی تھیں۔ عمر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سائرہ بیگم کی بات سن کر ممی، ڈیڈی پر تو گویا شادی مرگ طاری ہو گئی تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے دونوں سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

''روشانے میری گود میں کھیلی ہے بھائی صاحب! مجھے بیٹیوں کی طرح ہی عزیز ہے وہ بھی مجھے خالہ کہتی ہی نہیں سمجھتی بھی ہے۔ میں بیوہ عورت ہوں۔ میری کل پونجی میری اولاد ہے۔ آج کل کی تیز طرار لڑکیوں سے تو میں ویسے ہی خائف رہتی تھی ہمیشہ اللہ سے دعا کی کہ میرے عمر کے نصیب میں روشانے جیسی بچی کا ساتھ ہو کیونکہ خدیجہ بہن ہمیشہ کہتی تھیں کہ روشانے کا رشتہ انہوں نے اپنی نند کے ہاں کرنا ہے بس اسی لیے کبھی بات کرنے کا میرا منہ نہ بن پڑا۔ اب سویرا سے پتا چلا کہ آپ لوگوں کا اپنے بھانجے سے روشانے کا رشتہ کرنے کا ارادہ بدل گیا تو میں بھاگی چلی آئی اس سے پہلے کوئی اور روشانے کا ہاتھ مانگنے میں اپنے عمر کے لیے آپ کے آگے جھولی پھیلا رہی ہوں۔ مجھے مایوس نہ لوٹائیے گا۔''

سائرہ بہت لجاجت بھرے انداز میں مخاطب تھیں۔ ممی، ڈیڈی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں پیغام کا تبادلہ ہوا پھر ڈیڈی نے مسکرا کر سائرہ بیگم کو مخاطب کیا۔

''جس طرح روشانے آپ کی گود میں کھیلی ہے سائرہ بہن! اس طرح عمر بھی تو ہمارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ اس جیسا ذہین، فطین، قابل اور سب سے بڑھ کر سیلف میڈ بچہ اور کون ہوگا۔ آپ کے تینوں بچے ہمیشہ سے ہی ہمیں بہت پیارے رہے ہیں اور یہ بات آپ بھی جانتی ہیں۔ ہماری خوش بختی کہ آپ نے عمر کے لیے روشانے کا ہاتھ مانگا۔ ہم دونوں کو ہی یہ رشتہ منظور ہے۔ بس ایک بار روشانے سے اور پوچھ لیں پھر آپ کو باضابطہ ہاں کر دیں گے۔''

ڈیڈی کے فوری اقرار پر سائرہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا تھا۔ خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ممی نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا لیا۔ ممی ڈیڈی مطمئن تھے اور بے تحاشا خوش بھی۔

☆☆☆

عمر کا رشتہ روشانے کے لیے اتنا غیر متوقع تھا جیسے کسی نے اس کے حواسوں پر بم گرا دیا ہو۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی بڑے مسئلے پر ماں باپ کو اتنا متفق اور مطمئن پایا تھا۔ وہ اتفاق رائے سے اس کے لیے کوئی کھمبا بھی منتخب کرتے تو وہ ہنسی خوشی ہاں کر دیتی۔ ہاں تو اس نے اب بھی کر دی تھی لیکن حیرانی کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ اوپر سے سویرا نے چھیڑ چھیڑ کر اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔

''کتنے گھنے ہیں عمر بھائی! کب سے تمہیں سوچے بیٹھے تھے لیکن منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔ اب اپنی محبت کا انکشاف فرمایا ہے۔''

''محبت؟'' روشانے نے حیرت سے سہیلی کو دیکھا۔

''ہاں تو بغیر محبت کے ہی امی کو تمہارا رشتہ مانگنے بھیجا ہے۔'' وہ چہکی۔

''مجھے واقعی یقین نہیں آرہا۔ سویرا میں نے تو ہمیشہ عمر بھائی کو......''

''ہاں بولو کیا عمر بھائی کو۔'' سویرا نے گھورتے ہوئے اس کی بات اچکی، روشانے نے کچھ بولنا چاہا مگر سویرا پہلے ہی بول پڑی تھی۔

''دیکھو جب سبکتگین بھائی اور موبی کے رشتے زیر غور تھے تو تمہیں سبکتگین بھائی بڑے بھائی لگتے تھے اور موبی چھوٹا بھائی۔ اب اگر تم نے عمر بھائی کو منجھلا بھائی قرار دیا نا تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔'' سویرا نے اسے دھمکی دی۔

''نہیں...... میں نے یہ کب کہا۔ بس یقین ہی نہیں آرہا۔'' اس نے پھر بے یقینی کی تکرار کی۔

''یقین بھی آجائے گا میری جان اور عمر بھائی کے نام پر دل بھی دھڑکنے لگے گا۔ ہم مشرقی لڑکیوں کے دل کورے کاغذ کی مانند ہوتے ہیں۔ جب ماں باپ کسی سے ہمارا نام جوڑ دیتے ہیں تو دل خود بخود

اس نام کی مالا جپنے لگتا ہے۔ ہمارے ڈائجسٹوں میں یہ ہی لکھا ہوتا ہے نا۔" سویرا نے فلسفہ بولا۔ روشانے کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اور سب سے بڑھ کر خوشی کی بات یہ ہے کہ انکل آنٹی کو ایک ہی رشتے میں اپنی من پسند خصوصیات مل گئی ہیں۔ انکل عمر بھائی کی ذہانت، فطانت اور ڈیشنگ پرسنالٹی کی وجہ سے خوش ہیں تو آنٹی کو رشتوں سے بھرا پرا ہمارا گھر ہمیشہ سے ہی بہت پسند ہے۔ عمر بھائی سے شادی کی صورت میں تمہیں پیار کرنے والے شوہر کے ساتھ شفیق ساس، نٹ کھٹ دیور اور مجھ جیسی پیاری سی نند بھی تو ملے گی۔" سویرا شوخ ہوئی۔ روشانے ہنستی رہی۔

"تمہاری صبوحی پھوپھو اور تمہاری ممی میں تو کیا ہی دوستی ہوگی جناب جو ہم دونوں میں ہے۔ زندگی کے ہر برے بھلے وقت میں، میں نے تمہارا کتنا ساتھ دیا ہے۔ بتاؤ کوئی ہوگی میرے جیسی سہیلی پلس نند۔"

وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ بلاشبہ اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا تھا اور اپنے سب پیاروں کو اتنا خوش اور مطمئن دیکھ کر روشانے کا اپنا دل سکون سے بھر گیا تھا۔

☆☆☆

ممی نے سائرہ آنٹی کی فیملی کو لنچ پر مدعو کیا تھا۔ لنچ پر مدعو کرنا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ پہلے بھی چار، چھ مہینوں میں دونوں خاندان ایک دوسرے کو لنچ یا ڈنر پر انوائیٹ کر ہی لیتے تھے۔ عید، تہوار پر دعوت تو خیر معمول کا حصہ تھی۔ اس بار غیر معمولی بات یہ تھی کہ عمر کے لیے باضابطہ ہاں کر دی گئی تھی اور گھر والوں کے ساتھ یقیناً عمر نے بھی لنچ کے لیے آنا تھا۔

سویرا کے بہت اصرار کے باوجود روشانے نے سویرا کے ہاں جانا ترک کر دیا تھا۔ آج بھی عمر سے متوقع سامنے کے تصور سے ہی دل عجب سے انداز میں دھڑک رہا تھا...... شاید سویرا صحیح کہتی تھی۔ دل کے کورے کاغذ پر انوکھی سی تحریر ابھرنے لگی تھی۔

مقررہ وقت پر سائرہ خالہ، سویرا، ٹیپو اور عمر آ گئے تھے۔ روشانے تو خالہ سے سلام دعا کر کے واپس کچن میں گھس گئی۔ عمر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ممی نے آج بہت پر تکلف لنچ کا اہتمام کیا تھا۔ ڈیڈی نے اپنے سارے فرمائشی پکوان بنوائے اور ممی نے ہنسی خوشی ڈیڈی کی فرمائشی لسٹ کے مطابق کھانے تیار کیے تھے۔

سائرہ خالہ تو دستر خوان کی وسعت دیکھ کر کچھ خفا بھی ہوئی تھیں۔

"ارے سائرہ آپا! اپنے بھائی صاحب کا تو آپ کو پتا ہے۔ دعوت کسی کی بھی ہو، اپنا فرمائشی پروگرام نشر کر دیتے ہیں۔" ممی نے مسکرا کر انہیں مخاطب کیا۔ سائرہ خالہ بھی ہنس پڑی تھیں۔

"روشانے کو تو بلاؤ بیٹا وہ کہاں رہ گئی۔" سائرہ نے سویرا کو مخاطب کیا۔

سویرا اثبات میں سر ہلاتی مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی۔ روشانے کو بلانے کی کتنی کوششیں وہ کر چکی تھی لیکن وہ کچن سمیٹنے کے بہانے کچن میں ہی گھسی ہوئی تھی۔

"کچن سٹ چکا ہے۔ کھانے کے بعد برتن مل کر دھو لیں گے۔ اب باہر تشریف لے آئیں، امی تمہیں یاد کر رہی ہیں۔" اس نے روشانے کو مسکرا کر مخاطب کیا۔

"ہاں بس چلو آتی ہو۔" روشانے پزل ہو رہی تھی اور سہیلی کا جھجکنا شرمانا سویرا کو بہت لطف دے رہا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر ہی ڈائننگ روم تک آئی تھی۔ سائرہ خالہ نے اسے اپنے پاس بٹھایا تھا۔

شکر ہے عمر عین سامنے نہ بیٹھا تھا۔ جیسے تیسے کھانا کھا کر وہ پھر کچن میں گھس گئی۔ کھانے کے بعد ممی، سائرہ خالہ کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں جا بیٹھیں۔ ڈیڈی، عمر کو اپنی اسٹڈی میں لے گئے۔ روشانے اور سویرا مل کر برتن دھونے لگی تھیں۔

"روشانے بیٹا! برتن دھو کر اچھی سی چائے بنا لو۔ میں اور عمر نماز پڑھنے جا رہے ہیں پھر چائے

پہنچیں گے۔" ڈیڈی کچن میں جھانک کر اسے ہدایت دیے کر چلے گئے۔ اس نے دھیمی آنچ پر چائے چڑھا دی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے سویرا کی مدد چاہی۔

"ذرا دیکھ کر آنا ڈیڈی اور عمر بھائی نماز پڑھ کر آ گئے یا نہیں پھر انہیں چائے دے آنا۔"

"اگر تم نے عمر بھائی کو آئندہ عمر بھائی کہا تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔" سویرا غرائی۔

"اچھا بابا تم دیکھ آؤ کہ ڈیڈی اور تمہارے عمر بھائی آ گئے ہیں یا نہیں۔" روشانے نے بیان میں ترمیم کر لی۔ سویرا مسکرا کر کچن سے نکلی۔

"انکل تو اپنی اسٹڈی میں ہی ہیں اور عمر بھائی شاید نماز پڑھ کر گھر واپس چلے گئے ہیں۔ انہیں شام میں کسی دوست کے ہاں جانا تھا۔" سویرا کے کہنے پر اس نے سکون کا سانس لیا۔

"میں آنٹی اور امی کو چائے دے کر آتی ہوں تم انکل کو دے آؤ۔ پھر سکون سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

سویرا ٹرے میں دو کپ سجائے ممی وغیرہ کے پاس چلی گئی تو اس نے ڈیڈی کی چائے لے کر ان کی اسٹڈی کا رخ کیا۔ اپنی ہی دھن میں وہ اسٹڈی میں داخل ہوئی تھی مگر وہاں صرف عمر کو براجمان دیکھ کر ہاتھوں کے طوطے، مینا، چڑیا سب اڑ گئے۔

"ڈیڈی کہاں ہیں؟" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

"مسجد کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا انکل ابھی مسجد میں ہی ہیں۔" عمر کے جواب پر وہ سر ہلاتے ہوئے واپس مڑی تھی۔

"ویسے مجھے بھی چائے کا کوئی خاص پرہیز نہیں ہے۔ پی لیتا ہوں کبھی کبھار۔" عمر کی متبسم آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ بے تحاشا شرمندہ ہوتے ہوئے پلٹی۔ "سوری" کہنے کے ساتھ کپ عمر کے سامنے رکھا۔

"اگر اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحے عنایت کر دو تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" عمر اس بار سنجیدگی سے گویا ہوا۔

روشانے کا دل دھڑکا۔ ہتھیلیاں الگ پسینہ پسینہ ہوئیں۔ ڈائجسٹ میں چھپی کہانیوں کے مطابق کوئی رومانوی سچویشن رونما ہونے کو تھی۔

"ایک بار تم نے کہا تھا کہ اللہ کسی ڈاکٹر کو آپ کا پڑوسی نہ بنائے۔ اب اللہ ایک ڈاکٹر کو آپ کا لائف پارٹنر بنانے والا ہے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں۔"

وہ سنجیدگی سے استفسار کر رہا تھا۔ نہ جملے میں رومانس تھا نہ انداز میں۔ دل کے بہت اندر کسی گوشے میں مایوسی ابھری تھی۔ بہرحال اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"ایک منٹ رکو ......ایک بات اور کرنی ہے۔" اسے جانے کے لیے پر تولتا دیکھ کر وہ پھر بولا تھا۔ روشانے کے قدم تھم گئے۔

"مجھے آلو بینگن اور آلو مٹر کچھ خاص پسند نہیں مجھے سبز پتوں والی سبزیاں ہی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ شادی کے بعد بنا دیا کرو گی نا۔" کس معصومیت سے استفسار کر رہا تھا۔ روشانے کا جی جل کر خاک ہوا۔ اس بار اثبات میں گردن ہلا دی۔

"ایک آخری بات اور......" کچھ توقف کے بعد وہ بولا...... روشانے کا جی دھڑکا۔ اب جانے وہ کیا کہنے جا رہا تھا۔

"میں سبز پتوں والی سبزیاں نہ صرف خود کھایا کروں گا بلکہ تمہیں بھی زبردستی کھلاؤں گا۔ تم میں آئرن کی بہت کمی ہے۔ بنا چوں چرا کیے ساگ، پالک اور میتھی جیسی چیزیں کھا لیا کرو گی نا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"اس سوال کا جواب نہیں اور آپ کے سب سے پہلے سوال کا جواب ہاں میں ہے۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

عمر نے اس کی بات پر غور کیا۔ سمجھ میں آئی تو بے ساختہ ہنس پڑا۔ روشانے نے اسے خفگی سے گھورنا چاہا مگر اس کی بھوری شرارتی آنکھوں میں

دیکھ نہ پائی تھی۔

"یہ ڈائجسٹ اتنے بھی جھوٹے نہیں ہوتے۔" روشانے اس کی محبت سے مسکراتی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوراً ہی وہاں سے نو دو گیارہ ہوئی تھی۔ کچن میں جا کر اس نے سب سے پہلے سویرا کی گردن مروڑنی تھی۔

☆☆☆

واصف انکل کی طبیعت کچھ دنوں سے ناساز تھی۔ ڈیڈی تو تقریباً روز ہی ان کے ہاں چکر لگا آتے۔ آج موبی کے ساتھ ممی ان کا حال پوچھنے گئی تھیں۔ موبی انہیں وہاں ڈراپ کر کے خود اپنے کسی دوست کے ہاں چلا گیا۔ ممی گھر میں داخل ہوئیں تو گھر کی حالت خاصی ابتر تھی۔ سبکتگین کچن میں تھا۔ باپ کے لیے پرہیزی کھانا تیار کرنے کے ساتھ اپنے لیے بھی کھانا بنا رہا تھا۔ خالہ کو اچانک دیکھ کر قدرے شرمندہ ہوا۔

"دو، تین دنوں سے ملازمہ نہیں آ رہی خالہ! اسی لیے گھر کا برا حشر ہو رہا ہے۔" اس نے ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی گھر میں پھیلی بے ترتیبی کی وضاحت دی۔ ممی جی ہی جی میں خود شرمندہ تھیں۔ کیا تھا جو وہ پہلے یہاں کا چکر لگا لیتیں۔

"تم کچن سے نکلو بیٹا! کھانا میں بنا دیتی ہوں۔" انہوں نے بھانجے کو مخاطب کیا۔

"روز آپ کے ہاں کا پکا ہوا ہی تو کھا رہا ہوں خالہ! انکل، بابا کا حال پوچھنے آتے ہیں ساتھ خوامخواہ کھانا بھی لے آتے ہیں۔"

سبکتگین شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ سچ بھی یہ ہی تھا کہ ممی ڈیڈی کے ہاتھ کھانا بھجوا دیتی تھیں لیکن صرف کھانا بھجوانے سے تو فرض ادا نہیں ہونا تھا۔ انہیں گھر کی بھی تو کچھ خیر خبر رکھنی چاہیے تھی نا اور اسی شرمندگی کا اظہار انہوں نے واصف صاحب کے سامنے بھی کیا تھا۔

"بہت شرمندہ ہوں واصف بھائی! اتنے دنوں بعد چکر لگایا ہے۔ بس گھر کے جھمیلے ہی جان نہیں چھوڑتے۔" انہوں نے خجالت بھرے انداز میں بہنوئی کو مخاطب کیا۔

"ارے خدیجہ! اپنی شرمندگی کا اظہار کر کے مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہو۔ روز میرے پاس اپنے پروفیسر کو بھی بھیج دیتی ہو اور پکا پکایا کھانا بھی اور ہمیں کیا چاہیے۔ وہ تو چند روز سے ملازمہ چھٹی پر ہے بس اسی لیے گھر کی حالت ابتر ہو رہی ہے۔" انہوں نے بھی عین سبکتگین والی بات دوہرائی تھی۔

"بس واصف بھائی! اب آپ سبکتگین کا گھر بسانے کا سوچیں۔ گھر میں عورت کا وجود بہت ضروری ہے۔" ان کے کہنے پر ایک لمحے کو واصف صاحب خاموش ہو گئے اور ان کی لمحے بھر کی خاموشی نے ممی کی شرمندگی میں اضافہ کر دیا۔

"آپ نے اور پروفیسر صاحب نے سبکتگین اور روشانے کے حوالے سے جو سوچا تھا بس قسمت کو ہی منظور نہ تھا واصف بھائی!" یہ ممی کے دل کا چور تھا جو اپنا قصور قسمت کے کھاتے میں ڈال دیا۔

"ارے اب اس ذکر کو چھوڑو خدیجہ! روشانے میری اپنی بچی ہے۔ خیر سے اس کا رشتہ اتنی اچھی جگہ طے پایا ہے کہ میرے دل میں اس حوالے سے کوئی ملال نہیں اور جوڑے تو واقعی آسمانوں پر بنتے ہیں اس حقیقت سے کس کو انکار ہے۔" واصف صاحب نے اعلا ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ممی کو مزید شرمندگی میں دھکیل دیا۔

"اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ میں سبکتگین کے لیے لڑکی کہاں اور کیسے ڈھونڈوں۔ جان پہچان والے لوگ سبکتگین کے رشتے تو بہت بتاتے ہیں لیکن میں کسی بچی کو خود جا کر کیسے دیکھ پرکھ سکتا ہوں۔ بس اللہ سے یہ ہی دعا ہے کہ کوئی سلجھے ہوئے اطوار والی، سلیقہ مند اور نیک سیرت بچی مل جائے...... اگر بہو کے روپ میں کوئی تیز طرار سی لڑکی مل گئی تو سبکتگین کی جوانی کے ساتھ ساتھ میرا بڑھاپا بھی خراب ہو جائے گا۔ بس اسی بات سے ڈر لگتا ہے۔" واصف صاحب نے ان سے اپنے دل کی بات کی۔

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں واصف بھائی! اپنے بھانجے کے لیے لڑکی میں خود ڈھونڈوں گی اور ان شاءاللہ جیسی بہو آپ کو چاہیے ویسی ہی ملے گی۔"

ممی نے انہیں تہہ دل سے یقین دہانی کروائی تھی...... اور وہ اس یقین دہانی پر مسرور اور مطمئن ہو گئے تھے۔

☆☆☆

"مبارک ہو بھیا! آپ کو بالکل ویسا داماد مل گیا جیسا آپ چاہتے تھے۔"

یہ صبوحی تھی جو بھائی کو مخاطب کر رہی تھیں۔

ڈیڈی نے چھوٹی بہن کو بغور دیکھ کر ان کے چہرے پر طنزیہ تاثرات تلاشنا چاہے تھے مگر وہاں پر خلوص مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ دل میں قدرے شرمندہ ہوئے۔ انہیں چھوٹی بہن سے بے حد محبت تھی ہاں اس کے طور، طریقوں سے اختلاف تھا۔ بیوی کو بہن کے رنگ میں رنگتا دیکھ کر یہ اختلاف ناراضی بھری خفگی میں بدل جاتا۔ وہ اکثر صبوحی کو بے نقط سنا بھی ڈالتے مگر صبوحی ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہوئے بھائی کی ڈانٹ سن لیتی۔ اس کے ماتھے پر ایک شکن بھی نمودار نہ ہوتی۔ اگر وہ بھائی کی ناراضی کو دل پر لینے والی ہوتی تو اپنی "عزت افزائی" کے بعد دوبارہ وہاں نہ پھٹکتی۔ لیکن وہ ہر چوتھے دن اپنے کسی بھی بیٹے کے ساتھ ان کے گھر پہنچ جاتی۔ یہ ہی تربیت اس نے اپنے بچوں کی کی تھی۔

برگر کلاس کے نمائندے ممی ڈیڈی ٹائپ کے بھانجے کبھی بھی ڈیڈی کی گڈ بکس میں نہ تھے۔ وہ ان کی تربیت پر جہاں بہن کو مورد الزام ٹھہراتے وہاں بھانجوں کے لائف اسٹائل پر انہیں ٹوکنے کے ساتھ ساتھ اپنی خفگی کا بھی برملا اظہار کرتے۔ باقی تین تو چھوٹے تھے ہاں موبی ہی! اکثر ان کی طنزیہ گفتگو کی لپیٹ میں آتا لیکن وہ ماموں کے طنزیہ فقرے بھی ایسے ہنستے مسکراتے سن لیتا کہ ڈیڈی دل ہی دل میں اسے ڈھیٹ اور چکنے گھڑے کے خطاب سے نواز دیتے لیکن آج صبوحی کی مبارک باد سن کر ڈیڈی کو اپنے ماضی کے ناروا رویے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

"بس چھوٹی! ساری بات قسمت کی ہے ورنہ تم نے اور تمہاری بھابھی نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔" ڈیڈی خجل ہوتے ہوئے بولے تھے۔ ممی کی طرح انہوں نے بھی اپنا قصور قسمت کے کھاتے میں ڈالا تھا۔

"سچی بات تو یہ ہے بھیا کہ بے شک روشانے مجھے بہت پیاری ہے لیکن اس معاملے میں میری اپنی غرض بھی پوشیدہ تھی۔ میں نے بیٹے کی ماں بن کر سوچا۔ میرا موبی کچھ لا ابالی سا ہے۔ اسے لوگوں کی پرکھ بھی نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی پٹاخہ قسم کی لڑکی میرے بھولے بھالے بیٹے کو پھنسا نہ لے۔ بس اسی لیے میری خواہش تھی کہ میں کسی اچھی سی لڑکی سے موبی کی منگنی کر دوں تا کہ وہ کہیں ادھر، ادھر دیکھنے سے باز رہے۔"

صبوحی نے بھائی کو دل کی بات بتائی تھی۔ روشانے کو کھونے کا ملال ان کے لہجے سے چھلک رہا تھا۔ ڈیڈی سے بہن کی اداسی نہ چھپ سکی تھی اور نہ ہی اپنی ہنستی مسکراتی بہن کی یہ اداسی انہیں برداشت ہو رہی تھی۔

"ارے چھوٹی! تم فکر کیوں کرتی ہو۔ اپنے بھانجے کے لیے لڑکی میں خود ڈھونڈوں گا بالکل ویسی لڑکی جیسی تم چاہتی ہو۔ بس یہ بتاؤ میرے انتخاب کو قبول کر لو گی کوئی اعتراض تو نہ اٹھاؤ گی۔" بہن کو دلاسا دینے کے ساتھ انہوں نے اپنی تسلی بھی چاہی۔

"آپ کے انتخاب پر تو مجھے پورا بھروسا ہے بھیا۔ جب آپ نے اپنے لیے اتنی اچھی شریک حیات ڈھونڈی تھی تو بھانجے کے لیے کیوں نہ ڈھونڈیں گے۔ اس معاملے میں بھائی آپ اتنی دلچسپی لیں گے۔" صبوحی خوشی سے بے حال ہو گئی تھیں۔

"ارے آہستہ بولو چھوٹی تمہاری بھاوج نہ سن لیں۔ وہ تو آج تک یہ ہی سمجھتی ہیں کہ یہ رشتہ واصف

نے کروایا تھا۔ اسے کیا پتا میں نے واصف کے پیچھے پڑ کر اپنے لو کو ارینج میرج میں تبدیل کروایا تھا۔" ڈیڈی بشاشت سے مسکرائے تھے۔ صبوحی بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

"لیکن آپ لڑکی ڈھونڈیں گے کیسے بھیا۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ پائیں۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑو۔" ڈیڈی کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمکی تھیں۔

یہ معاملہ بھائی پر چھوڑتے ہوئے صبوحی بھی مطمئن انداز میں مسکرا دیں۔

☆☆☆

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کسی بھی معاملے میں مجھے اعتماد میں لینے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کرتیں۔" ڈیڈی ممی پر بگڑ رہے تھے۔

"افوہ پروفیسر صاحب! بلاوجہ گرج برس رہے ہیں۔ آخر میں نے کس معاملے میں آپ کو اعتماد میں نہیں لیا۔" ڈیڈی کی ناراضی ممی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

"آپ سائرہ بہن کے پاس گئی تھیں۔" ڈیڈی نے کڑے تیوروں سے استفسار کیا۔

"ہاں تو......؟" ممی کو وجہ ناراضی اب بھی سمجھ میں نہ آئی۔

"آپ نے سبکتگین کے لیے سویرا کا رشتہ مانگا اور مجھے اس معاملے کی ہوا تک نہ لگنے دی۔" ڈیڈی کی خفگی پر ممی مسکرا دی تھیں۔

"سائرہ آپا کے اقرار کے بعد میں آپ کو سرپرائز دینا چاہ رہی تھی۔ آپ واصف بھائی اور سبکتگین کے حوالے سے کتنا پریشان رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب آپ کو سویرا اور سبکتگین کے رشتے کی خبر ملے گی تو آپ خوشی کے مارے۔"

"بھاڑ میں ڈالیے میری خوشی کو...... ارے مجھے پہلے پتا ہوتا کہ آپ سبکتگین کا رشتہ ڈال چکی ہیں تو میں عمر کے سامنے موبی کا رشتہ پیش کرنے کی حماقت تو نہ کرتا۔" ڈیڈی غرائے تھے۔

"اوہ! یعنی کہ آپ موبی کے لیے سویرا کا رشتہ مانگ چکے ہیں۔ سچ کہہ رہے ہیں نا پروفیسر صاحب آپ کی بات کا یہی مطلب ہے۔" ممی کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ ڈیڈی بس انہیں خشمگین نگاہوں سے گھورتے رہے۔

"یہ خیال تو بہت بار میرے دماغ میں بھی آیا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ آپ مجھے طعنے دیں گے کہ آخر مجھے اپنے سگے بھانجے کی پروا کیوں نہیں ہے۔ کچھ اس روز واصف بھائی کے گھر جا کر میرا دل پسیج گیا۔ بس اسی لیے میں نے سائرہ آپا سے سویرا کے رشتے کی بات کر ڈالی۔ مجھے آپ کے ارادے کی پہلے خبر ہوتی تو میں کاہے کو یہ حماقت کرتی۔ ہم دونوں مل کر موبی کا رشتہ لے جاتے۔"

سبکتگین کے لیے چڑھا وقتی ہمدردی کا بخار اتر گیا تھا اور اب ممی دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اپنے قلق کا اظہار کر رہی تھیں۔ ڈیڈی کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ اس گاؤدی موبی کا رشتہ عمر کے آگے رکھا ہی کیوں۔ آج صبح فجر کی نماز کے بعد جب وہ عمر کے ساتھ واک کر رہے تھے تب ان سے یہ حماقت سرزد ہوئی۔ جواب میں عمر نے آگاہ کیا تھا کہ آنٹی بھی سبکتگین کا پروپوزل لائی تھیں اور سائرہ اس پر غور و خوض کر رہی ہیں۔ عمر نے مزید کہا تھا کہ اب وہ ماں کے سامنے موبی کا رشتہ بھی پیش کر دے گا۔ ماں کو جو رشتہ مناسب لگے گا وہ اسے اوکے کر دیں گی۔

"میں آج ہی سائرہ آپا کے پاس جاتی ہوں۔ ان سے کہوں گی کہ سبکتگین کے رشتے پر غور ہی مت کریں۔ سویرا کا جوڑ موبی کے ساتھ ہی جچے گا۔" ممی نے فوری فیصلہ کیا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ آپ ایسی حماقت بالکل نہیں کریں گی۔ نئی نئی رشتہ داری جڑی ہے۔ کچھ اس کی نزاکتوں کا ہی خیال کریں۔ بس یوں سمجھیں کہ ہم نے سویرا بیٹی کے لیے دو رشتے تجویز کیے ہیں۔ اب سائرہ بہن کس کو سند قبولیت بخشتی ہیں یہ ان کا اپنا

فیصلہ ہوگا۔"
ڈیڈی نے ممی کو مخاطب کیا۔ حیرت انگیز طور پر بات ان کی سمجھ میں بھی آ گئی تھی۔
"ٹھیک کہتے ہیں پروفیسر صاحب! فیصلے کا حق سائرہ آپا کا ہی ہے۔" انہوں نے فراخ دلی سے ڈیڈی کی بات مان لی تھی۔ بیوی کی غیر متوقع فرمانبرداری پر ڈیڈی نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

سویرا کمرے کے چکر پہ چکر کاٹ رہی تھی اور روشانے ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔
"تمہیں اتنی ہنسی کس خوشی میں آ رہی ہے۔" سویرا نے اسے گھورا۔
"میں یہ سوچ رہی ہوں سویرا کہ وقت کتنی تیزی سے بدلتا ہے۔ کچھ دن پہلے میں اس سچویشن سے گزر رہی تھی اور اللہ نے پردہ غیب سے تمہارے بھائی کی صورت میرے لیے مدد بھیج دی تھی۔ میرا تو کوئی بھائی بھی نہیں جو میں تمہیں مشکل سے نکالنے کے لیے پیش کروں۔" روشانے کھلکھلاتے ہوئے بولی تھی۔
"میرے لیے جو دو عدد رشتے آئے ہیں وہ اتفاق سے تمہارے رشتے کے بھائی ہی ہیں۔" سویرا نے اسے خفگی بھرے انداز میں باور کروایا۔
"ہاں تو میرے رشتے کے بھائیوں میں سے چن لو نا کسی ایک کو۔" روشانے صورت حال سے صحیح لطف اٹھا رہی تھی۔
"سوچ سوچ کر ہی تو میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے روشانے۔ عمر بھائی سبکتگین کے حق میں ہیں جبکہ صبوحی آنٹی سے امی کی اچھی خاصی علیک سلیک ہے۔ امی کو وہ بہت بھلے مزاج کی خاتون لگتی ہیں۔ امی کا ووٹ موبی کی طرف ہے۔ عمر بھائی کہتے ہیں کہ سویرا نے دونوں لڑکوں کو دیکھ رکھا ہے۔ زندگی اس نے گزارنی ہے تو فیصلے کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔" سویرا نے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔
"شکر الحمد اللہ۔" روشانے کے غیر متوقع شکرانے پر سویرا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
"تمہارا بھائی اتنا لبرل اور براڈ مائنڈڈ ہے بس اسی لیے اللہ کا شکر کیا۔" وہ مسکرائی تھی۔
"میرا بھائی واقعی اتنا اچھا ہے تم روزانہ شکرانے کے دو نفل پڑھو وہ بھی کم ہیں لیکن تم اتنی ہی بری ہو۔ یاد کرو تم مشکل میں تھیں تو میں نے تمہاری کتنی مدد کی۔ آج میری مشکل میں تم صرف دانت نکوس رہی ہو۔" سویرا نے اسے طعنہ مارا تھا۔
"تم ہرگز میری والی مشکل میں گرفتار نہیں ہو۔ میرا مسئلہ تھا کہ کہیں ممی ڈیڈی میں سے کوئی ہرٹ نہ ہو جائے۔ تم پر ایسا کوئی دباؤ نہیں سوچ سمجھ کر دلی آمادگی کے ساتھ سبکتگین بھائی یا موبی میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو ڈیئر۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔" روشانے نے اسے حوصلہ دیا۔
"میرے لیے یہ اتنا ہی بڑا مسئلہ ہے۔ دل و دماغ کسی ایک بندے پر متفق ہی نہیں ہو رہے۔" سویرا بے بسی بھرے انداز میں بولی۔
"اچھا ٹینشن مت لو ...... کاغذ، قلم لاؤ ہم دونوں کی خوبیاں، خامیاں الگ الگ کرتے ہیں بلکہ وہ پرانے والا کاغذ ہی ڈھونڈ لو، غور نئے سرے سے کر لیں گے اور ہاں سبکتگین بھائی اور موبی سے ہمارے ہاں تمہارا آسانی تا کرا ہو سکتا ہے پھر تم ان دونوں کی آنکھوں میں وہ چمک ضرور ڈھونڈنا جو مجھے بھی ڈھونڈنے سے بھی نہ ملی۔" روشانے اسے جی بھر کر چھیڑ رہی تھی۔
سویرا نے اسے گھور کر دیکھا پھر دوبارہ کمرے کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔
ڈائجسٹوں کی رسیا سویرا کا انتخاب کون ہوگا۔ ممی کا شوخ و شنگ اور ہنس مکھ سا بھانجا محب عالم عرف موبی یا ڈیڈی کا سنجیدہ اور بردبار بھانجا سبکتگین۔ قارئین بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں۔



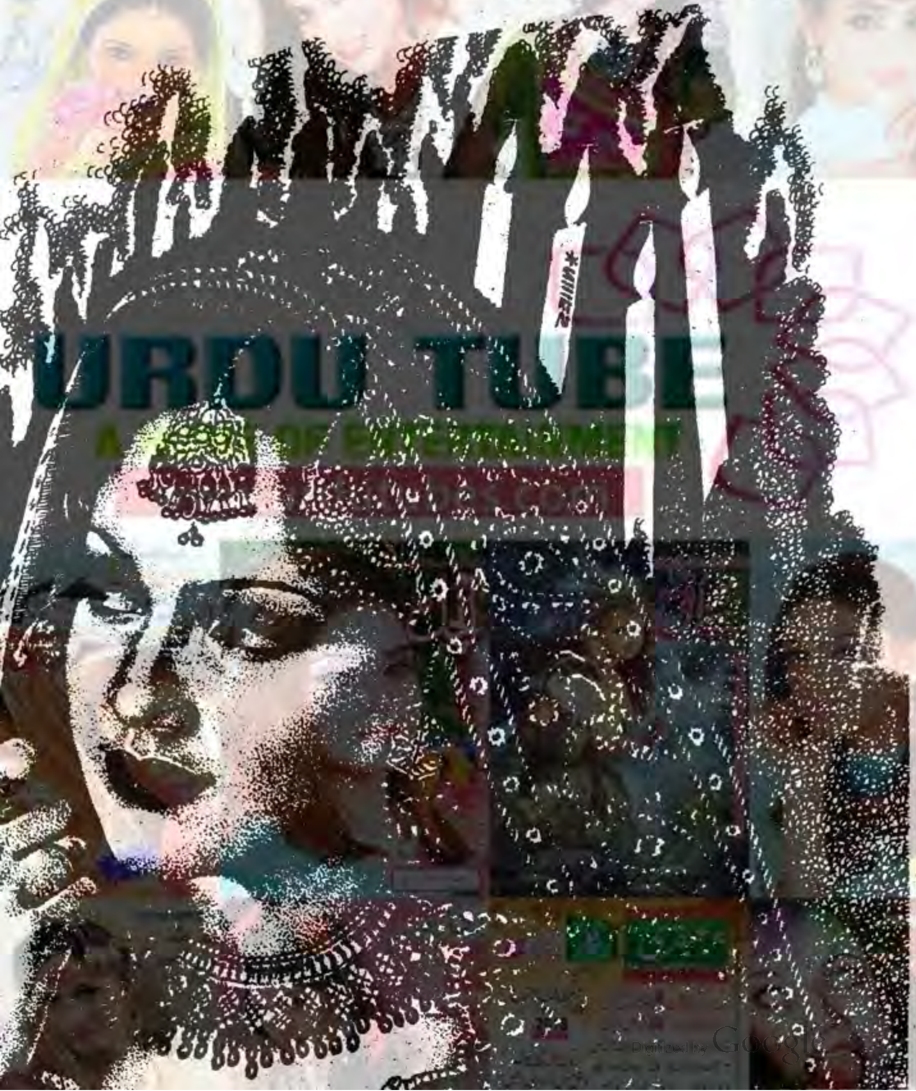
قرۃ العین خرم ہاشمی

کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

محبت اس بڑے شہر کی پرانی گلیوں میں دھمال ڈالتی محورقص تھی۔ مگر وہ اردگرد سے بے نیاز ایسے سر جھکائے چل رہی تھی جیسے زمین پر اس کا کوئی قیمتی سکہ گر کر گم ہو گیا ہو...... اور وہ اسے ڈھونڈتی پھرے۔

آس پاس سے قطعی لاتعلق وہ ہمیشہ کی طرح اس اندرون شہر کی ایک درمیانی گلی سے گزرتی چلی گئی۔

اور محبت دھمال ڈالتے ڈالتے تھک کر وہیں اسی



گلی کے کونے میں کہیں بے ہوش ہو کر گر گئی۔

اور گلی کے سیدھے ہاتھ میں بنے گھروں کی لائن میں سے ایک گھر کی کھڑکی سے نظر آتی محبت بکھیرتی آنکھوں کا نور جیسے بجھ گیا ہو۔

☆☆☆

"کیا کوئی اتنا بھی صبر کرتا ہے جیسے کہ میں، صبر تو دل میں رکھے پتھر کی مانند ہے۔" ہزار بار کا دہرایا جانے والا جملہ سوچ کر اس نے بیرونی دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھے۔

"یا اللہ! یہ گھر ہے یا کوئی ویرانہ!" آج دل کیسی بغاوت پر اتر آیا تھا۔ معمول کی چیزیں بھی غیر معمولی لگ رہی تھیں۔ جلدی سے اپنی چادر اتارتے ہوئے برآمدے سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اماں سوئی ہوئی تھیں۔ ابا یقیناً اپنے وظائف اور عبادت میں مشغول ہوں گے۔ دنیا بھر کے ہر مسئلے کا حل تھا ان کے پاس، دور دور سے لوگ آتے تھے ان کے پاس، ہر شے کا علاج موجود سوائے اپنے گھر کی عورتوں کے بخت بدلنے کے۔

ہاں بھئی! اس گھر کی عورتیں تو پیدائشی گناہ گار تھیں۔ جن پر اللہ کا قہر ہی نازل ہوتا۔ ہر تکلیف کے جواب میں یہ کہا جاتا "استغفار کرو۔" گناہوں کی معافی مانگو۔

اور وہ سوچتی تارک الدنیا ہو کر زندگی گزارنے والی عورتیں اب بھی اللہ سے استغفار کریں۔ کس چیز کے لیے۔ تارک الدنیا ہونے کے لیے یا عورت ہونے کے لیے؟

☆☆☆

سادہ سے گھر کے یہ سادہ سے لوگ اپنی دنیا میں مگن رہتے۔ نہ زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے ایام انہیں بھٹکا سکے نہ وقت کی روش انہیں پھسلا سکی۔ ابا ساری زندگی سرکاری سکول میں اطمینان سے نوکری کرتے رہے۔ ترقی بھی خود ہی مل گئی۔ اور اماں ان کے گھر کے تو اتنے بکھیڑے کھلے رہتے کہ شیطان کی آنت کیا چیز ہو گی ان کاموں کے آگے۔ ہمہ وقت شوہر اور بیٹے کے لیے پریشان۔ کب آئے۔ کب گئے۔ کیا کھایا۔ کیا اوڑھا۔ اور وہ سوچتا کہ بعض لوگوں کی زندگی کتنی محدود ہوتی ہے اور حد اور حدود کا تو اپنا ہی مزہ ہے۔

وہ جو زمانے میں بھر میں محبت کا عظیم طرف دار یا مانا جاتا تھا۔ ہمہ وقت بے چین ہی رہا کبھی ہجر میں کبھی تخلیق میں۔ خدایا! یہ کیسا سفر ہے؟ جو کسی کو نظر نہیں آیا۔ کوئی راہ گزر نہیں بدلتی مگر اندر تک تھکا دینے والا سفر۔ ایک دنیا اس کے عشق و محبت کے افسانوں اور ناولوں سے مرعوب رہتی۔ جوان دلوں کی دھڑکن۔ حب داروں کی روح کا اپنے لفظوں سے مسیحائی کرنے والا۔ جو بھی لکھتا پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش ہو جاتا۔

اس کی زندگی کوئی رکی ہوئی نہ تھی یہ سترھویں گریڈ کا لیکچرار تھا۔ یار دوست تھے۔ ایک نام تھا اور پہچان تھی۔ مگر دل کہیں کسی چادر کے پلو میں اٹک گیا تھا۔ کہیں رک گیا تھا۔ کسی کے در پر ٹھہر گیا تھا۔ اسی گلی میں جہاں محبت دھمال ڈالتی تھی۔ وہ اس گلی کا باسی تھا۔ اور اس دھمال کی ہر تال پر جھومتے اس کے لفظ دنیا بھر میں مانے اور پہچانے جاتے تھے۔

محبت عطا ہے۔ نور الٰہیا ہے۔ محبت خدا ہے۔ یہ گناہ نہیں۔ گناہ تو اسے وہ لوگ بناتے ہیں جو اس کے تقدس و ادب سے بے خبر رہتے ہیں۔ جیسے کوئی کافر کیا جانے کہ اللہ کی شان میں شراکت گناہ ہے۔ ایسے ہی ہاں، بالکل ایسے ہی۔

پر جس کے نور سے وہ اپنے قلم سے جگنو نکالتا۔ وہ کچھ دور کہیں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی اپنی سیاہ بختی پر ماتم کر رہی ہوتی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ ستارہ ہے۔ کسی کی ماہ پارہ ہے۔

☆☆☆

موسم کی رو بدلتے ہی پھپھو نے سیاہ لباس اوڑھ لیا تھا۔ اکتوبر کی خنک ہوا جب صبح سویرے چلتی تو خنکی

کا احساس ہوتا۔ دوپہر میں تپش اور رات میں وہی صبح کا راگ بجاتی سرد ہوائیں۔ درختوں کو چھوتی۔ خاک اڑاتی۔ دل میں انجانا احساس جگائے چل رہی تھیں۔ اور وہ درختوں کے سائے تلے بیٹھی ہوا سے راز و نیاز کرتی اپنی لاحاصل محبت کا سوگ منا رہی تھی۔

محبت کا سوگ کبھی چلا کر تو کبھی خاموش رہ کر منایا جاتا ہے۔ جن پر محبت کا اجالا نہ برسے انہیں سیاہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ وہ سیاہ لباس میں گھر بھر میں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ کبھی اوپر کبھی نیچے تو کبھی اس کمرے میں تو کبھی اس کمرے میں۔ جیسے کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ پھر تھک کر گلابوں کے سائے میں بیٹھ کر سوچنے لگتیں۔ کہ اے محبت کہاں رکھا تھا تجھے کہ تو دوبارہ مل کر نہ دی۔

جو بھی کوئی کہتا کہ کسی نامحرم کو یاد کرنا سوچنا گناہ ہے۔ تو سفید لباس پہن کر رب کی عبادت کرتیں۔ جب خاندان والوں کی عزت دار بیٹی بنتیں، سفید لباس پہنے رہتیں۔

سیاہ لباس میں جب گم شدہ محبت کا سوگ مناتیں تو گناہ کبیرہ کی مرتکب نظر آتیں۔ کوئی مذاق کرتا۔ کوئی طعنہ مارتا۔ کوئی حزن سے دیکھتا۔ ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق سلوک کرتا، پر دیوانوں کو دنیا دنیاداری سے کیا شغف۔ دل میں بلبلا اٹھتیں اور کہتیں کہ محبت کے نام پر جوگ نبھانا گناہ ہے۔ لوگ تو صدیوں میں جوگ لیتے ہیں اور وہ دل خاص ہوتے ہیں جو عشق پرستی میں کامل ہوتے ہیں۔

تسبیح کرتے ہاتھ، دل کی دھڑکنوں سے سہمے جاتے جو اس کا نام وظیفہ کی طرح پڑھتی رہتیں۔ اس کا نام جس کے بنا روح ادھوری تھی۔ زندگی خالی رہ گئی۔ مردود اور کافر کہلائی گئیں۔ اک اور بنت حوا رسم و رواج کی سولی پر چڑھائی گئی۔ کیا میں واقعی کافر ہوں۔ جو زبان تو یاد خدا میں مشغول مگر روح ہجر کے درد سے مغلوب۔ کیا محبت کفر ہے؟ تو خدا کا نام ودود کیوں ہے۔ وہ خود کو محبت کرنے والا کیوں کہتا ہے، کیوں اس نے یہ ساری کائنات اپنے محبوب کے لیے بنائی۔"

☆☆☆

دادا کو گزرے بھی عرصہ ہوا۔ دادی اور پھپھو اوپر والے پورشن میں ہوتیں۔ ابا اپنی بیوی اور بیٹا بیٹی کے ساتھ نیچے والے پورشن میں۔

امی۔ ابا کسی عزیز کے ہاں شادی پر گئے تھے۔ امی کتنی اداس تھیں۔ بار بار ابا کو اور بھائی کو یاد کرواتی رہیں کہ ممتاز صاحب کی بیٹی اپنی مہ پارہ سے پانچ سال چھوٹی ہے۔ پر ان کی بات کا جواب کون دیتا۔

برادری چھوڑنا کوئی آسان بات ہے۔ پھپھو نے جب برادری سے باہر آئے گئے رشتے کے لیے ہاں کروانی چاہی تھی تو ابا نے خود کو مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگانے کی دھمکی دی تھی اور دادی نے تب پھپھو کو اتنا مارا کہ سب کو پھپھو کی فکر ہونے لگی۔ اس دن کے بعد سے پھپھو کے منہ سے اس اجنبی محبت کا نام نہ سنا گیا۔ ہاں مگر وہ ادھوری محبت کا خواب، پھپھو پر ایسا طلسم کر گیا کہ پھپھو اب پہلی والی پھپھو نہ رہیں۔ ہر وقت خوش رہنے والی لڑکی اب سنجیدگی کی چادر اوڑھے پھرتی۔ سب کچھ بدل گیا اور زندگی کے سارے رنگ سفید اور سیاہ میں آسمٹے۔ کبھی کسی نے دھنک کو گہری کھائی میں فنا ہوتے دیکھا ہے۔ ہاں پھپھو کی ست رنگی محبت ایسے ہی فنا ہوئی تھی۔ ایسے ہی کہیں دفن ہوگئی تھی۔ جس کی برسی پھپھو ہر سال مناتیں۔ شاید پھپھو کی زندگی اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی اگر ان کی شادی ہو جاتی مگر اس خاندان میں تو دور دور تک کوئی پھپھو کے جوڑ کا نہ تھا۔

مہ پارہ صحن کی لائٹ بجھائے بیٹھی تھی۔ دادی اور پھپھو شاید سو گئی تھیں کہ اوپر والے پورشن میں مکمل خاموشی تھی۔

"اپنی مہ پارہ کے لیے اتنا اچھا رشتہ ہمیں پھر نہیں ملے گا۔ اسفر" بھابھی کی آواز ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی سے باہر آرہی تھی۔

''ان کا رہن سہن ہم سے قطعی مختلف ہے۔ کیسے گزارہ کرے گی مہ پارہ وہاں۔'' بھائی نے توجیہہ پیش کی۔

''پہلے آپ لوگوں کو مسئلہ تھا کہ رشتہ برادری کا آئے۔ اب برادری کا آیا ہے تو اس میں بھی عیب نکال رہے ہیں آپ۔'' بھابھی نے دکھ سے کہا۔

''تو کیا کروں اپنے خاندانی اصولوں کو پامال کر دوں۔'' بھائی بلاوجہ ہی غصہ ہونے لگے۔

''مجھ سے بھی تو آپ نے شادی کی تھی۔ میں بھی تو غیر برادری کی تھی۔'' بھابھی نے مری ہوئی بے دم آواز سے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''میں مرد تھا اور مہ پارہ عورت ہے۔ مرد کو برادری بدلنے سے اتنا فرق نہیں پڑتا۔ عورت کو پڑتا ہے۔'' بھائی نے سرد لہجے میں کہہ کر بات ختم کر دی۔ مہ پارہ نے ذرا سا آگے ہو کر کھڑکی سے اندر جھانکا۔ بھائی اپنی مکمل فیملی کے ساتھ نظر آئے۔ بھابھی بھی تو غیر برادری کی تھی جن سے بھائی نے ضد کر کے شادی کی تھی۔

تب تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔ ''کیا قسمت کی طرح محبت بھی ہر ایک پر مہربان نہیں ہوتی؟''

تبھی آنکھیں جھپکتے ہوئے تاروں نے اس صحن سے نظروں کا سفر کچھ دور ہی بنے دھمال والی اس گلی کے گھر کی چھت پر بیٹھے منصف حیات کو دیکھا۔ جو اکتوبر کی خوب صورت رات میں نم آنکھوں کے ساتھ ہجر پارہ منا رہا تھا۔

پھر ستارے ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنا نور ان پر برسانے لگے وہ نور جو صرف دل کی آنکھ والے دیکھ سکتے ہیں۔ پھر ستارے منصف کو مہ پارہ کے بارے میں بتانے لگے جو اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بیان جاناں سنتا رہا۔ اور محبت کے نام اک اور ناول لکھتا رہا۔

☆☆☆

منصف حیات اسفر عباس کا بہت اچھا دوست تھا۔ یونہی آتے جاتے کہیں راستے میں اس نے مہ پارہ کو دیکھ لیا۔ بس یہ دن اور وہ دن وہ خالی ہو کر بھی بھر دیا گیا تھا۔ محبت کے مال سے۔ تب اس کے لفظوں کو جیسے کسی نے طلسم پھونک کر اسم کھل جا سم سم بنا دیا تھا۔ جو ہر محبت کرنے والے کے دل کے غار کھولتا۔

رشتہ کیا بھیج دیا منصف نے کہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہائے ہائے کی آواز و پکار۔ ناممکن۔ ناممکن کی صدائیں۔ اور پھر سارے اثبات ناں میں بدل گئے۔ قسمت بھی نامہرباں ہوئی اور خواب بھی چکنا چور ہوئے۔ صرف مہ پارہ کے اور منصف حیات کے گھر سے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کہ جرأت کیسے ہوئی۔ غیر برادری کا ہو کر ہمارے گھر رشتہ ڈالنے کی۔

مہ پارہ کی کم بختی۔ اس اچانک افتاد پر حیراں و پریشاں کہ زندگی جو کبھی سہل تھی۔ دشواریوں کا پہاڑ بن گئی۔ جو اس سے کبھی سر ہو نہیں پایا۔ کالج بند۔ باہر نہیں جانا۔ فیشن نہیں کرنا۔ ہر وہ بات جس سے زندگی رنگین ہوتی وہ سارے خاندان نے اس کے لیے ممنوع قرار دے دی۔ کچھ ویسے ہی بدفطرت لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتی۔ کچھ اپنے دل کے پھپھولوں کا بدلہ اس سے لینے لگے۔

لہٰذا وہ ملزم کہلائی گئی۔ الزام الفت کی شق میں جو اس نے کبھی کیا ہی نہ تھا اور جس کو صرف نام کی حد تک جانتی تھی اس کے ساتھ کئی قصے کہانیاں منسوب کی جانے لگیں۔ یہ قصہ تب تک بڑا ہاٹ ایشو رہا جب تک کہ بھائی کی بھابھی سے شادی نہ ہوئی اور پھر برادری کو ایک نیا قصہ مل گیا۔

اور وہ پرانا قصہ ماضی کا حصہ بن کر کسی گلی میں مقید ہو کر رہ گیا۔ اور صیاد اس کی چابیاں کسی گہرے سمندر میں پھینک کر سکون کی نیند سو گئے۔

کچھ اس کی تربیت کا اثر تھا اور کچھ اس کی فطرت کا کہ آہستہ آہستہ اسے سب کی حد تک بے قصور ماننے لگے۔ خالہ فریدہ کے بار بار اصرار پر ابا

مانے کہ مہ پارہ جا کر ان کی معذور پوتی کو قرآن پاک کی تعلیم دے آئے۔ کہ پردہ دار لوگ تھے۔ قاری صاحب کے بجائے قاریہ کو ترجیح دیتے۔ کچھ رشتہ داری تھی اور کچھ دین کا لحاظ۔ مہ پارہ سے پوچھے بنا ہاں کر دی گئی۔ کبھی خاندانی ڈرائیور لانے لے جانے کے فرائض نبھاتا تو کبھی بھائی یہ کام کرنے پر معمور۔

وقت بدلا تو خالہ کی بہو میں۔ اکثر مہ پارہ کو اپنے ساتھ بازار لے جاتیں۔ پھر اسے شہر کے راستے اور گلیاں سمجھ میں آنے لگیں۔ اب خود ہی وہ اکثر واپس اکیلی آجاتی۔ راستے میں بازار سے اپنی پسند کی چیزیں بھی لینے لگی۔

☆☆☆

منصف حیات کو کسی کے ذریعے علم ہوا تو وہ دعا کرنے لگا کہ اے اللہ۔ غلطی سے ہی سہی اس کے راستے میرے راستے سے ملا دے۔ ان پیاسی آنکھوں کو دیدار یار کرا دے۔ تب دعا سن لی گئی۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں خالہ فریدہ کی نواسیاں بھی آ گئیں۔ بچیاں زیادہ ہو گئیں اور وقت بھی اور پھر واپسی کے سفر کے لیے مہ پارہ کو منصف حیات کی گلی مناسب لگی۔ جہاں زیادہ رش اور ٹریفک نہ تھا۔ مرکزی سڑک پار کرنا۔ ہمیشہ سے ہی بہت مشکل کام تھا اس کے لیے۔

کسی رنجیکے کی دعا قبول ہوئی۔ اور بالآخر وہ دن آ گیا۔ جب مہ پارہ عشق زدہ گلی سے گزری۔ صبح سے ہی منصف حیات کی طبعیت بوجھل تھی۔ شام میں بھی کہیں جانے کو دل نہ چاہا۔ اداس سا کھڑکی کے پار اترتے شام کے سایوں کے رنگ دیکھ رہا تھا۔ کہ اس نے اسے گلی سے گزرتے دیکھ لیا۔ مانا کہ وہ نقاب کیے ہوئے تھی۔ مگر عشق کی بھٹی میں جل جل کر احساس اتنے پختہ ہو گئے تھے کہ اسے گماں نہیں یقین تھا یہ وہی ہے۔ اس کا پیچھا کر کے دیکھ کر اپنے یقین پر خود ہی رشک بھی ہوا۔ پھر تو وہ شہر کے کسی بھی کونے میں ہوتا مقررہ وقت پر گھر آنا نہ بھولتا اور خاموشی کے ساتھ دوسری منزل کی کھڑکی سے تکتا۔ کہ کچھ کہنا دیدار یار سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ محبت مہ پارہ کی قدموں کی چاپ سن کر دھمال ڈالنا شروع کر دیتی۔ جب تک کہ وہ گلی سے نکل نہ جاتی اور کوئی ضبط کرتا روز ٹوٹنے اور جڑنے لگا۔ وہ بے خبر تھی۔ ہر بات سے۔ محبت کے انہونے راز سے۔ یار کے بے ریا انداز سے۔

☆☆☆

پھر اک دن یونہی اوپر نظر پڑی تو ان آنکھوں میں آباد شوق کے جہاں کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ کیا نہیں تھا ان آنکھوں میں تڑپ۔ محبت۔ چاہت۔ طلب۔ حزن۔ قرار۔ کیا کسی کی آنکھوں میں زندگی کے اتنے رنگ بھی سما سکتے ہیں۔ گھبرا کر وہ تیز تیز چلنے لگی۔ کیا کوئی مرد کسی عورت کو پردے کے پار سے بھی پسند کر سکتا ہے۔

پھر کیا ہوا؟ وہ آنکھیں مہ پارہ کی آنکھوں میں سما گئیں۔ محبت کا دھمال مہ پارہ کو نظر آنے لگا۔ تب اس نے جانا کہ کیوں پھپھو محض اک احساس کے سہارے زندہ ہیں۔ ایک نظر کا اتنا کمال ہوتا ہے کہ دنیا بدل جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا اور محبت رگ و جاں میں سما گئی۔ وہ انداز نظر ہر احساس پر حاوی ہو گیا۔ مگر ہائے ری قسمت۔ اب بھی صبر۔ اب بھی جبر۔ اب بھی اظہار نا ممکن۔ کرب در کرب۔

کون تھا وہ؟ کیسے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ ایسے تو مجھے کبھی کسی نے نہ دیکھا۔ نظریں دل چیر کر روح تک چلی گئیں۔ روح کا بھی اک جہاں ہوتا ہے؟ کوئی طلب ہوتی ہے۔ خود سے تنہائی میں سوال کرنے لگی۔ مگر جواب وہی ہاں، ناں، ناں...... ہاں اور فقط ہاں۔

ادھر منصف حیات بگڑنے لگا۔ ماں باپ کی سمجھ میں آ گیا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر شاگردوں کو ڈانٹنے لگا۔ کولیگ ماننے لگے کہ تنہائی ستانے لگی ہے۔ کبھی چڑچڑا ہوتا۔ کبھی بے قرار ...... کرب نارسائی لہو میں درد بن کر دوڑنے لگا۔ ماں باپ پریشان، تھا نہیں ان پر راز مودت نہاں۔ مگر حل کر نہیں سکتے تھے مشکل آساں

وہ بکھر رہا تھا۔ وہ جڑ رہی تھی۔ وہ گلی سے گزرتی

تو اطمینان کے ساتھ۔ وہ پیچھے رہ جاتا بے قراری کے ساتھ۔ ایک کے اندر صحرا نمو پانے لگے تو دوسرے کے اندر سکون کے جھرنے بہنے لگے۔ کیا میں بھی کسی کے لیے اہم ہوں؟ ہر شرط سے، ہر خامی، خوبی سے آزاد ہو کر۔

ان دیکھے مسافر ایک کو دور دراز دیسوں کے قصے سنانے لگے تو دوسرے کو بادلوں کی طرح بھٹکانے لگے۔ تب پہلی مرتبہ مہ پارہ نے جانا کہ ستارے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں۔ وقت بھی مہربان ہوتا ہے۔ دھوپ میٹھی لگتی ہے۔

☆☆☆

تہجد کی نماز پڑھ کر وہ لاشعوری طور پر اسے رب سے مانگنے لگی۔ جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے اس کا چہرہ سامنے آنے لگتا۔ نام تو معلوم نہ تھا۔ پھر بھی وہ مانگتی رہی اور سوچتی رہی۔ کیا کبھی کسی انسان کو بھی اللہ سے مانگا جاتا ہے۔ آج تک صرف صحت، ایمان، سکون اور رزق وغیرہ کے وظائف تو سنے تھے۔ دعائیں مانگی تھیں۔ کسی انسان کو کبھی نہیں مانگا تھا۔

اور وہ اس کے راستوں میں آنے لگا۔ محبت کی شعاعیں جو دونوں طرف سے خارج ہوتی تھیں تو وہ بے خبر کیسے رہتا۔ وہ راستے بدلتی۔ وہ کہیں نہ کہیں اسے تکتا کھڑا نظر آتا۔ کبھی اسے دل ہی دل میں چھچھورا کہتی، کبھی اوچھا پر جب وہ نظر نہ آتا تو بے چین ہو جاتی۔ تب کسی من چلے دکاندار کی دکان سے گانا سنائی دیا۔ اپنی حالت پر محظوظ اور محجوب ہو کر رہ جاتی۔

میرا دل بھی کتنا پاگل ہے
یہ پیار تو تم سے کرتا ہے
پر سامنے جب تم آتے ہو
کچھ بھی کہنے سے ڈرتا ہے
میرا دل بھی کتنا پاگل ہے

☆☆☆

اب وہ اپنی کتابوں کا انتساب لکھنے لگا۔ "اس شخص کے نام جسے قسمت نے میرا نہیں بنایا۔" لوگ پڑھتے اور دکھی ہوتے۔ عشق کی بے قدری پر۔ جنوں کے ہار جانے پر۔ درد، ہجر۔ فراق محبت کی بجائے اس کے موضوع ہونے لگے۔ اور محبت کے المیہ انجام پر رونے لگے۔

☆☆☆

پھپھو اپنی محبت کا درد دل میں لیے منوں مٹی تلے جا سوئیں۔ دادی بھی ملک عدم کو سدھاریں۔ بھائی اپنے کاروبار کو وسیع کرتے کرتے نیوزی لینڈ جا بسے۔ پیچھے رہ گئے اماں، ابا، وہ اور اس کی محبت۔ مہ پارہ پچیس سے اوپر کی ہو گئی اور منصف حیات تیس سے اوپر کا۔ پر ادھوری محبت کا ادھورا دائرہ یونہی گردش کرتا رہا۔ خالہ فریدہ کی نواسیاں اور پوتی نے قرآن پاک مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ ہر وقت گھر میں ہی رہتی۔ اور ماں اس کی تنہائی سے خائف۔ اتنا پڑھی بھی نہیں تھی کہ کہیں نوکری کرے۔ بھائی تو ملکوں ملکوں گھومتا بزنس کے سلسلے میں۔ گھر بھی بدل لیا۔ علاقہ بدلا تو لوگ بھی نئے نئے ملے۔

پر اس انجان سے محبت کا زائچہ آج بھی بناتی۔ اس بے نام شناسا کو اب بھی اللہ سے مانگتی۔ محبت کتنی عجیب ہوتی ہے انسان سے ناممکن کو ممکن بنانے کی دعا کرواتی ہے۔ تنہائی میں پہروں اس کو سوچتی۔ کہاں ہو گا؟ کیا کر رہا ہو گا؟ کیسا ہو گا؟ اللہ جانے سچا تھا یا جھوٹا تھا؟ شادی شدہ تھا یا غیر شادی شدہ؟

سوال وجواب کا سلسلہ خود ہی چلتا خود ہی ٹوٹتا رہتا۔

☆☆☆

"کسی کی بدنظر ہے اس پر جو اس کا جوڑ نہیں ملتا کہیں۔" اماں فاطمہ جب بھی آتیں۔ اماں ابا سے کہتیں۔ ابا تو خاموش ہو رہتے۔ مگر اماں رونے لگتیں۔

"ہمارے بعد کیا کرے گی اکیلی۔ بھائی تو ملکوں......ملک سدھارا۔"

امی اتنا پریشان ہوئیں کہ بستر سے جا لگیں۔ بھائی پریشان۔ ابا نالاں۔ امی کی ایک ہی ضد۔ "مہ پارہ کی شادی۔ مہ پارہ کی شادی" کبھی ابا سے ہاتھ جوڑ کے کہتیں "ساری زندگی کچھ نہیں مانگا۔ آپ سے بس ایک چیز مانگتی ہوں میری آنکھوں کو میری بیٹی کی خوشی دکھا دیں میری پہلی اور آخری خواہش بھی ہے

آپ سے۔" بھائی بھی آ گئے۔ بھابھی بھی امی کا ساتھ دیتیں۔ دونوں ساس بہو مل کر رونا شروع ہو جاتیں۔ گھر میں مرگ کا سا سماں ہو جاتا۔

بھائی اور ابو کی ایک ہی ضد برادری سے باہر نہیں۔ ہم برادری نہیں چھوڑ سکتے۔ اپنے اصول قربان نہیں کر سکتے، چاہے جان چلی جائے، تب وہ سوچتی، مکہ کے منافقوں کی طرح مسلمان ہیں، یہ ریت روایت نبھائیں گے چاہے ایمان چلا جائے۔"

تب بیمار ماں نے اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کی کہ رب میری دمی کا مقدر بنا دے اسے پھر کسی کی اجڑی پھپھو بننے سے بچالے۔ برادری کے ہر گھر میں کوئی پھپھو، کوئی خالہ، کوئی بہن، کوئی بیٹی ایسے منحوس رسم و رواج کا شکار تھی۔ ان کی بے رنگ اور بے کیف زندگیاں دیکھ کر جی ہولتا تھا۔ کوئی بھائی کے بچے سنبھالتی، کوئی بہن کا گھر۔ کسی کو گھر کا سب سے خستہ حال کمرہ ملتا۔ تو کوئی دردر بہن بھائیوں کے آسرے پر۔ کوئی کہتا اس پر اثر ہے کسی نے کہا کہ کالا جادو کروایا ہے۔ کوئی توڑ نہیں اس کی سیاہ بختی کا۔ کوئی برادری میں جوڑ نہیں اس کم بختی کا۔"

کسی ایسے ہی عام سے دن ان کے دروازے پر کوئی خاص سی دستک ہوئی۔ کچن میں مشغول مہ پارہ نے کام والی ماسی کو دروازہ کھولنے کا کہا۔ باہر سے کسی اجنبی عورت کی آواز پر جلدی سے ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ آج کل سب ہی امی کی عیادت کو آرہے تھے۔

"باجی کون آیا ہے۔" کام والی ماسی سے پوچھتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔

یہ کیا۔ دعائیں کبھی ایسے بھی قبول ہوتی ہیں۔ اس کو نہیں معلوم کہ کتنے لوگ آئے ہیں۔ بس اسے پتہ تھا کہ اس کا محبوب آج پہلی بار اس کے گھر آیا ہے۔ ساری کائنات سمٹ کر اس چہرے پر آ گئی۔ اور زندگی میں اور تم تم اور میں پر ٹھہر گئی۔ مہ پارہ اور منصف حیات۔ کتنے ہی سمے بیتے۔ ہوش کی دنیا میں آئی تو خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے باہر نکل آئی۔ ذہن میں سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ دل کی دھڑکنیں بھی۔ بھابھی کو مہمانوں کے پاس بھیجا۔ اور خود جا کر امی کے پاس بیٹھ گئی۔ امی سوئی ہوئی تھیں۔ چہرے پر تفکر کی لکیریں اب بھی واضح تھیں۔ دنوں میں بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ بھابھی نے خود ہی مہمانوں کو سنبھال لیا تھا۔ کوئی پونے گھنٹے بعد واپس آئیں تو خود ہی بتانے لگیں کہ کون لوگ آئے تھے۔

اور جیسے جیسے بھابھی بتاتی گئیں وہ پتھر کی ہوتی گئی حیرت سے۔

کیا یہی وہ منصف حیات ہے۔ جس کی ایک ذرا سی جرأت پر۔ مجھ پر زندگی کا ہر دروازہ بند کر دیا گیا۔ کیا اتنی سچی اور خالص محبت تھی اس کی کہ ایک دوسرے کو جانے اور ملے بنا ہم اتنے قریب ہو گئے۔ کیا یہ محبت ہے ؟ کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ محبت کیسی ہوتی ہے؟

منصف حیات آیا تھا۔ بھائی کو یہ بات معلوم ہوئی تو تھوڑا خفا ہوئے مگر بولے کچھ نہیں کہ امی کی طبیعت بگڑنے کا ڈر تھا۔ ویسے بھی منصف حیات نے کبھی بھی حد سے بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سوائے رشتہ ڈالنے کی بات کے علاوہ۔

امی بس ایک ہی فکر میں گھلی جا رہی تھیں۔ اور ابو نے اس کا اچھا حل نکالا کہ اپنے دور کے چچا کے رنڈوے بیٹے کے لیے جس کی عمر 40 سے اوپر اور اولاد نرینہ کی بھی کمی تھی۔ دلیل کافی مضبوط تھی کہ۔

"امیر اور کھاتے پیتے لوگ ہیں رکھ رکھاؤ والے مہ پارہ سکھی رہے گی وہاں، میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

اور امی ایسے اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی انجانا شخص ہو اور اس کے چہرے کے نقش کہیں کھو گئے ہوں۔ خاموشی سے بیڈ کی پشت کے سہارے نیم دراز ہو گئیں...... کہ پتھر کبھی پگھلا نہیں کرتے۔ دعاؤں سے مناجاتوں سے۔ پتھر کے صنم کے دل بھی پتھر کے ہوتے ہیں۔

اور پھر امی، منصف اور مہ پارہ۔ ان کی دعاؤں کی مثلث بن گئی۔ ایسی مثلث جس کا ہر زاویہ برابر تھا۔ اور مطلوب و مقصود بھی یکساں۔ بھائی آخر بیٹے تھے۔ امی کی منت سماجت پر دل پگھلا ضرور مگر خاندان و برادری کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سب تو عشق کے کام ہیں جو

پوری دنیا سے لڑ پڑتا ہے اور عشق یہاں روز روز کرتا کون ہے؟ یہ کام کرنا بڑے دل جگر والوں کا خاصا ہے۔
بھائی نے فقط امی سے اتنا کہا۔
"صرف آپ کا بیٹا بن کر وعدہ کرتا ہوں کہ مہ پارہ کا ہاتھ اس کو دوں گا جو اسے خوشی سے تھامے اور ہمیشہ تھامے رکھے۔ بنا کسی غرض کے۔"
اور امی تو جیسے اسی عہد و پیماں کی منتظر تھیں۔
اگلے دن سہ پہر کو اپنی نیند سو گئیں۔
امی کے دسویں پر سارا خاندان جمع تھا۔ بھائی مہ پارہ کے کمرے میں آئے۔ کھڑکی سے باہر شام ہو رہی تھی۔ وہ صدمے اور غم سے نڈھال تھی۔
اور ابو سب رشتہ داروں سے کہتے پھر رہے تھے کہ۔
"بس بیٹی کا رشتہ ہونے کا انتظار تھا۔ بڑی خوشی تھی اس رشتے پر۔ بس بیٹی کی خوشی دیکھنا نصیب میں نہ تھی۔"
آخر لوگ اچھی چیز کو کسی کا نصیب کیوں نہیں کہتے۔ ہمیشہ برا ہی کیوں مقدر کا لکھا سمجھا جاتا ہے۔ جو ٹل نہیں سکتا۔ کبھی قسمت ہمیں موافق چیزوں سے بھی تو نوازتی ہو گی؟
"مہ پارہ جلدی سے اپنا ضروری سامان باندھ لو۔ اور یہ امی کا زیور بھی اس میں سنبھال لینا۔" بھائی نے عجلت میں کہا۔
پرسوں بھائی لوگوں کی فلائٹ تھی نیوزی لینڈ کی۔ وہ خوش فہم ہوئی کہ بھائی اسے بھی ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔
"بھائی اتنی جلدی کیا ہے؟ مجھے تھوڑا وقت دیں۔ ابھی تو میری ماں کے بچھڑنے کا غم بھی تازہ ہے۔ آپ مجھے ابا سے بھی دور کر رہے ہیں۔"
"سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔ تم سے جتنا کہا ہے اتنا کرو۔" بھائی نے ڈپٹ کر کہا۔
سہم کر سامان باندھنے لگی کہ بھائی کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔
"مگر ابھی کیوں؟ ابھی تو کل کا وقت ہے۔ اتنی جلدی کس چیز کی ہو گی۔ شاید امی کے صدمے سے دماغ نے کام کرنا چھوڑ گیا ہے؟ کیا بھائی کو بھی امی سے پیار ہے؟ ہمارے خاندان کے مرد تو رشتہ و تعلق سے زیادہ رسم و رواج سے پیار کرتے ہیں۔" اپنی سوچوں میں مگن۔ پیکنگ کرتی رہی۔
"کاش منصف حیات کی کوئی تصویر بھی ہوتی میرے پاس...... دور دیس جا کر اسے دیکھ سکتی۔"
تو نہیں تو تیری تصویر ہی مل جائے
تو ہم سے مجذوبوں کو جینے کا وظیفہ مل جائے
پھر امی کی یاد آ گئی۔
کیسے سہوں گی یہ دوہرا ہجر اے خدا
سوچتے سوچتے کب آنکھ کھلی معلوم نہیں۔ بھابھی کے اٹھانے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بھائی اس کا بیگ پکڑے کھڑے تھے۔ اور بھابھی جلدی چادر کھول کر اس کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ مہ پارہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وال کلاک پر رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔ دونوں تیار نہیں تھے۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دل کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔ امی کے جاتے ہی سب بدل گئے۔ کہاں بھیج رہے ہیں مجھے یہ لوگ۔ کہیں پھپھو کی طرح پورشن تو نہیں الگ کر رہے ہیں میرا۔
بھائی اور بھابھی اسے دونوں طرف سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے آئے۔ سب مہمان سو چکے تھے۔ سردیوں کی خاموشی اور کہر زدہ رات تھی۔
لیکن یہ کیا بھائی اور بھابھی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اسے باہر لے آئے۔ سب مہمان سو چکے تھے۔ کہیں سے کوئی کتا سردی سے گھبرا کر اپنے مخصوص انداز میں چلایا تھا۔ بھائی نے گیٹ کھول کر جلدی سے مہ پارہ کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے گئے۔ وہاں ایک کار موجود تھی۔ بھائی نے عجلت میں اسے گاڑی میں بٹھا دیا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اسے لگا اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے بس دل کام کر رہا ہے۔
بھائی ڈرائیونگ سیٹ میں بیٹھے شخص سے مخاطب تھے۔ اسے کچھ کہہ رہے تھے۔ بھائی نے کیا کہا کیا نہیں کہا۔ اسے کچھ معلوم نہیں۔ ابھی تو ماں کا غم بھی پوری طرح منایا نہیں تھا کہ...... ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو جب اس نے دیکھا تو وہ گاڑی اسٹارٹ

کر کے آگے لے چکا تھا۔ مگر یہ کیا۔

☆☆☆

صبح سارے گھر میں بھابھی کی چیخ و آہ و بکا جاری تھی۔ سب مہمانوں کی آنکھ کھل گئی۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ سب لوگ اوپر نیچے کے کمروں سے نکل رہے تھے۔

بھابھی نے رو رو کر سب کو جو بتایا تو سب کی آنکھیں یوں کھلیں جیسے ان میں کبھی نیند تھی ہی نہیں۔ عورتیں واویلا کرنے لگیں۔ اور مرد غیرت و غصے سے بل کھانے لگے۔

"چھوڑیں گے نہیں اس بدذات کو۔ ہماری برادری کا نام ڈبو گئی ماں کا کفن میلے ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ نہ جانے کون تھا، کب سے عشق کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔"

"توبہ توبہ ایسی حرافہ! بات ہوتی ہے تو آگے نکلتی ہے، ایسے تو نہیں کوئی رشتہ بھیجتا...... آہا ئے۔ جانے دو باجی اس بات کو تو عرصہ بیت گیا دفنائے ہوئے، یہ کوئی نیا ہی چکر لگتا ہے۔ کتنا کہا تھا کہ علاقہ نہ بدلو کیا پتا کوئی نیا یار ہو۔" ہر کوئی اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ خاندان کے کچھ بزرگ و جوان شہر کی خاک چھاننے لگے ایک بار مل جائے تو وہ حشر کریں گے آنے والی تمام نسلوں کی لڑکیاں لرز جائیں۔

تیسرا دن آ پہنچا۔ بھائی کی فلائٹ تھی۔ جاتے ہوئے بھرے مجمع میں کہا کہ "مر گئی ہمارے لیے مہ پارہ۔ مرتے دم تک میں اور میری پوری برادری کا کوئی شخص اس سے تعلق نہیں رکھے گا۔ وہ مرے یا جیے۔ دیکھتے ہیں کتنے دن تک رکھتا ہے اس کا یار اس کو۔ خوش ہو یا روئے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔" ساری برادری کے دلوں میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

شاباش اے! شاباش کے نعرے لگے۔ تب وہ اس خاندان کے ہر فرد کے لیے دفنا دی گئی —— دوسری برادریوں کو بتایا گیا کہ مر گئی ماں کے صدمے سے۔ سب نے مل کر فاتحہ پڑھی دنیا دکھاوے کے لیے اور پھر وہ اس چوٹ کو لیے اپنی آنے والی نسلوں کی لڑکیوں کے لیے دل خراش مگر نہ ٹوٹنے والا اصول بنانے لگے۔ کیا مسلمان ہوتے ہوئے بھی ان کو ضرورت تھی کہ وہ دین میں کوئی اختراع نکالتے۔ کیا وہ بدعتی نہ تھے۔ وہ تو منکر بھی تھے اصول خدا سے اور رسول کی رضا سے۔ جو بیٹی کو صرف اپنی جاگیر کا حصہ گردانتے تھے اسے اپنے دل کا ٹکڑا نہیں کہتے تھے۔

☆☆☆

اور ابو کو بالکل ایسے ہی چپ لگی جیسے امی کو اس پکی عمر کے آدمی کا مہ پارہ کے لیے رشتہ سن کر لگی تھی۔

اور وہاں بھابھی جہاز میں بیٹھی بھائی سے کہہ رہی تھیں۔

"آپ نے کچھ جلدی نہیں کر دی اصغر! مہ پارہ کے معاملے میں......" اور بھائی نے کہا۔

"وعدہ جتنی جلدی وفا کرنے کی کوشش کریں تو بہتر ہوتا ہے ورنہ مصلحتیں اور حجتیں دیر کرا دیتی ہیں۔"

اور یہاں

آسٹریلیا کے ایک خوب صورت سے اپارٹمنٹ میں مہ پارہ بیٹھی بت بنی منصف حیات کو تک رہی تھی۔

"کیا دعائیں اس طرح قبول ہوتی ہیں۔ غیر محسوس طریقے سے اپنا کام دکھا جاتی ہیں۔ ہم دعائیں سوچ کر کرتے ہیں۔ اور دعائیں جب قبول ہوتیں ہیں تو ہمیں سوچنے کا موقع بھی نہیں دیتیں۔"

اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یوں بامراد ٹھہرائی جائے گی۔

منصف حیات اپنے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے اپنے دل کی ہر بات بتا رہا تھا۔ ہر ہجر کی گھڑی۔ ہر دیدار کا لمحہ۔ ہر انتظار کا کرب ...... اور وہ خاموشی سے ایسے سن رہی تھی جیسے کوئی اس کے احساسات کی ترجمانی کر رہا ہو۔ لیکن لب خاموش تھے کہ مرد اگر اقرار محبت کرے تو معتبر اور اگر عورت کرے تو کم تر کہلاتا جاتا ہے۔

لیکن محبت کا فرشتہ کہیں آس پاس کھڑا ان دونوں پر مسکرا رہا تھا کہ محبت مرد و عورت کے تفاوت کے بغیر بھی عظیم جذبہ ہے...... اور یہ کہ

میدان وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں۔



مکمل ناول

شہر کے پوش علاقے میں بنے، سفید رنگ کے گیٹ کے سامنے بلیک کرولا کار کا ہارن بجا تو مستعد چوکیدار نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ بڑے سے پورچ میں خاموشی کا راج تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ اسے ملی اطلاع کے مطابق وہ دونوں اس وقت گھر پر موجود تھے۔ پھر بھی وہ اسے خوش آمدید کہنے باہر نہیں آئے تھے۔ نئے بنے رشتے پر یہ دوسری گانٹھ لگی تھی۔ پہلی گانٹھ اس رشتے کے بننے سے بہت پہلے ہی لگ چکی تھی۔

اور ابھی نجانے قدم قدم پر ایسی کتنی ہی چھوٹی بڑی گانٹھیں لگنی تھیں۔ اپنے سے آگے چلتے مرد کی رہنمائی میں وہ پورے اعتماد سے گھر کے اندر داخل ہوئی۔ خوب صورت لاؤنج میں بڑی سی اسکرین کے سامنے وہ دونوں موجود تھے۔ پاس کھڑی ملازمہ کے متوجہ کرنے پر دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ہر دل عزیز باپ کے پہلو میں کھڑی اس عورت کو دیکھنے لگے، جو ان کی ماں بننے کا دعویٰ کر کے یہاں تک پہنچی تھی۔

وہ دونوں بچے یہ بات پچھلے پانچ مہینے سے جانتے تھے، وہ اپنے باپ کی زبانی سنتے بھی تھے مگر آج جب یہ دن ان کی زندگی میں آیا، تو ان کا معصوم دل ماننے سے انکاری ہو گیا۔

باپ نے دوسری شادی کرنے سے پہلے اپنے انتخاب سے بچوں کو ملوایا۔ پھر بالآخر پانچ ماہ بعد وہ

انعم نجف رضوی

کاسۂ ذات





عورت ان کی ماں کے درجے پر فائز ہو ہی گئی۔

باپ نے پیار سے ان دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ تو وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھے۔

''السلام علیکم!''

بلیک ساڑھی میں اس کا متناسب سراپا اور کھلا کھلا رنگ، دیکھنے والی آنکھوں کو متاثر کر رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے دونوں بچوں کو گلے سے لگالیا۔ جب اسے اچانک فیصل کے کہے کچھ جملے یاد آئے۔

''میری زندگی میرے بچے ہیں۔ اگر وہ تمہارے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر سکے تو......''

اس کی سرد آواز کی سرگوشی اس کے اطراف چکرائی۔ اس عورت نے دونوں بچوں کو خود سے الگ کیا۔ اسے اس نئے رشتے پر لگی پہلی گانٹھ یاد آئی تھی۔ اسے آج بھی وہ شام اور ادھوری بات نہیں بھولی تھی۔ جب اسے پروپوز کرتے ہوئے اس نے یہ شرط رکھی۔ یعنی اس کی ذات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ صرف آزمائے جانے کے لیے کسی کے گھر جا رہی تھی۔ اگر سامنے کھڑے مرد نے ہاتھ تھامتے ہوئے مخلص ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا تو پھر وہ کیوں ایسا سوچتی۔

''مجھے اپنے بچوں سے بہت محبت ہے!''

اس مرد نے دوبارہ یاد دہانی کروائی تو اس عورت نے نرمی سے مسکرا کر ان کے معصوم چہروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

مگر اس کے لمس میں گرم جوشی نہیں، ایک عجیب طرح کی سرد مہری تھی، جسے صرف وہ دونوں بچے ہی محسوس کر سکے۔ ان کا باپ چہرے پر فخریہ مسکراہٹ سجائے انہیں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''اماں! آج کیا پکانا ہے؟''

سارے گھر کی اچھی طرح صفائی ستھرائی کرنے کے بعد وہ ہاتھ دھو کر دوپٹے سے پونچھتے ہوئی صحن میں بیٹھی اماں کے پاس آئی۔ اماں سردیوں کی نرم گرم دھوپ کے مزے لیتے ہوئے، سخت بے مزہ ہوئیں اور منہ بنا کر بولی۔

''بانو سے پوچھ۔ مجھے کیا پتا۔ جو اس مہارانی کا دل کرے گا، وہی تو پکے گا اس گھر میں، میری کیا مجال کہ میں کچھ بول سکوں۔'' حسب معمول اماں نے چڑ کر جواب دیا۔

''بانو بھابھی تو ابھی سو کر نہیں اٹھی ہے۔'' رانی نے دھیرے سے کہا۔ بانو اکثر دیر سے سو کر اٹھتی تھی۔ رفیق صبح سویرے کام پر چلا جاتا تھا۔ اسے ناشتہ دینے کی ذمہ داری بھی رانی کے سر تھی۔ اور تو اور اس کے چاروں بڑے بچوں کو تیار کر کے، ناشتا کروا کر اسکول بھیجنا بھی اس کے ذمے تھا، جب کہ ان کا چھوٹا مدثر ابھی سال کا ہوا تھا۔ وہ بھی ماں سے زیادہ رانی کے پاس پایا جاتا۔

''اس مہارانی کو کیا فرق پڑے گا۔ اس نے ناشتہ اس وقت کرنا ہے، جب باقی سب دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ بھی ہو جائیں گے۔ تو ایسا کر دال چاول بنا لے۔ ساتھ پودینے کی چٹنی اور پیاز بھی تیار کر لینا اور ہاں پچھلی بار کی طرح دال سخت نہ ہو۔ دھیان سے کام کیا کر۔ تو بھی پتا نہیں کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔'' اماں اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے بنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد باہر نکلی تو سر پر چادر اوڑھی ہوئی تھی۔

''میں ذرا محلے کا ایک چکر لگا آؤں، کافی دنوں سے کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' اماں کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

آج رانی کا دل بہت بھرا ہوا تھا۔ بار بار اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ شاید یہ پچھلے کئی دنوں کی بیماری کا اثر تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ جس ذہنی اور جسمانی کرب سے گزری تھی، وہ وہی جانتی تھی، کلی کھلنے سے پہلے ہی اس کی کوکھ میں مرجھا گئی۔ رانی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی گود کے خالی پن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نجانے کب چاول چنتے چنتے

ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

☆☆☆

رانی چھ بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھی۔ غربت میں آنکھ کھولی اور پلی بڑھی۔ بڑی دو بہنوں کی شادی خاندان میں دور کے رشتے داروں میں بہت سادگی سے ہوئی۔ وہ دونوں بمشکل اکیس سے بائیس سال کے درمیان تھیں جب باپ کی مرضی پر سر جھکائے خاموشی سے رخصت ہو گئیں۔ گھر میں ابا کا بہت رعب تھا۔ اماں یا کسی کی بھی جرأت نہیں تھی کہ ان کے آگے بول سکے۔

اماں تھوڑے سے پیسوں میں گھر چلانے کی تگ و دو میں لگی رہتی۔ ابا ٹرک چلاتا تھا۔ اس لیے جب وہ گھر سے باہر ہوتا، تو وہ وقت ان سب کے لیے آزادی اور خوشی کا ہوتا تھا۔

رانی بہت شرارتی اور تیز تھی۔ بڑی بہنوں کی نسبت اس میں بغاوت کے جراثیم وافر مقدار میں پائے جاتے۔ وہ ان سب سے زیادہ ذہین اور دور تک سوچنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ گھر میں بھی رہتی تو اودھم مچائے رکھتی۔ جان بوجھ کر اماں کو تنگ کرتی، ستاتی اور ان سے ڈانٹ سنتی۔ اکثر اسے مار بھی پڑ جاتی مگر وہ ضدی تھی۔ اس کا مزاج اپنے باپ کی طرح تھا۔ نہ دبنے والا۔ حاکمیت اور ضد سے بھرا۔

مگر حالات اور اس کی کم عمری کی وجہ سے اس کی فطرت ابھی کھل کر سامنے نہیں آئی اور وہ دب کر رہ گئی۔

رانی سولہ سال کی تھی۔ جب اس کے لیے پہلا رشتہ آیا اور اس کے لیے آئے پہلے رشتے پر ابا نے، کسی تحقیق کے بغیر فوراً ہاں کر دی۔ رانی کی آواز کو دبا کر، اسے رسموں اور رواجوں کی بڑی بڑی زنجیریں پہنا کر رخصت کر دینے کا سندیسہ سنا دیا گیا تو وہ حیران و پریشان رہ گئی۔ اس نے ابھی خواب دیکھنے شروع کیے تھے۔ وہ اپنی بڑی بہنوں کی طرح سر جھکائے کسی بھی کھونٹے سے نہیں بندھنا چاہتی تھی۔

اسے زندگی جینے کی خواہش تھی۔ اور وہ جینا چاہتی تھی مگر......!

ابا کو صرف بیٹیوں کو رخصت کرنے سے غرض تھی۔ اس لیے نہیں کہ ابا کو اپنی بیٹیوں کے اچھے اور محفوظ مستقبل کی بہت فکر تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ابا کو چھ بیٹیاں بوجھ لگتی تھیں۔ اس لیے وہ جلد از جلد اس بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

لائن سے لگی چھ بیٹیاں سامنے سے ہٹتیں تو، سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے بھی نظر آتے۔ جن کے اچھے مستقبل کے لیے ابا اکثر سوچ میں ڈوبا رہتا۔ ابا اپنے منہ کے نوالے بھی انہیں کھلا دیتا۔ ابا کے لیے احمد اور اصغر بازوؤں کی طرح تھے۔ رانی نے بامشکل میٹرک کے امتحان دیے تھے۔ وہ پڑھنے میں بہت ذہین نہیں مگر محنتی تھی۔ رٹا لگا کر پاس ہو ہی جاتی۔ اس نے میٹرک کے امتحان کی تیاری بہت مشکل سے کی تھی۔

اسکول جانا اور پڑھنا ایک عیاشی کی طرح تھا مگر اس نے ضد اور رو دھو کر اسکول نہیں چھوڑا۔ اماں بھی اس کا شوق دیکھ کر چپ ہو جاتی۔ وہ ماں تھیں اس لیے اپنی اولاد کے سامنے کمزور پڑ جاتی۔ ابا نے بھی زیادہ اعتراض اس لیے نہیں کیا کہ جب تک اس کا کوئی رشتہ نہیں آتا، اسے پڑھنے دو اور جب اس کا رشتہ آیا تو ابا نے ایک لمحے کی دیر کیے بغیر ہاں کر دی اور اس کی ساس نے مسکراتے ہوئے نشانی (شگن) کے طور پر کڑکڑاتا ہوا سو کا نوٹ اس کی گوری ہتھیلی پر رکھا۔ یوں وہ ایک انجان شخص اکرم کے نام سے منسوب ہو گئی۔

☆☆☆

رانی کا ہونے والا سسرال کافی بڑا تھا۔ اس کے سسرال میں ایک عدد بوڑھی ساس، تیز و عیار جیٹھ اور جٹھانی، جن کے اس وقت چار بچے بھی تھے اور اس کی چار عدد بیاہی ہوئی نندیں، جو آس پاس ہی رہتی تھیں۔ اکرم سب سے چھوٹا اور لاڈلا تھا۔ اس

کے لیے سونی دوہنی لانے کا ارمان ماں اور بہنوں کو جانے کب سے تھا۔ اس لیے رانی کو دیکھتے ہی انھوں نے رشتہ دے دیا۔ ایک تو رانی خوب صورت تھی اور دوسرے کم عمر بھی۔

رانی کی ساس یعنی اماں نے بتایا کہ اکرم اپنے بھائی رفیق کے ساتھ ہی اپنی زمینوں پر جاتا ہے۔ گھر اپنا اور ذاتی ہے۔ ابا کو یہ رشتہ دل و جان سے پسند آیا کہ لڑکا کماؤ پوت ہے۔ بھلے دیکھنے میں مناسب اور رانی سے کچھ سال بڑا تھا مگر ابا خوش تھا کہ لڑکے والوں نے کسی قسم کی کوئی خاص فرمائش نہیں کی اور نہ ہی جہیز مانگا تھا۔

بلکہ ابا کے کہنے پر وہ سادگی سے شادی کرنے پر راضی ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ انھیں بس لڑکی چاہیے۔ اماں نے ہمیشہ کی طرح ابا کی مرضی پر سر جھکا دیا۔ یہ رشتہ

دوسرے گاؤں سے، رشتہ کروانے والی مائی جیراں لے کر آئی تھی۔ جو ان کے گھر کے حالات سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ ابا نے اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے فوراً ہاں کر دی تھی۔

دو مہینے کے بعد جون کی ایک تپتی شام میں، چند قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں رانی کی قسمت کی ڈور دولہا بنے اکرم کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ چونکہ شادی بہت سادگی سے ہو رہی تھی اس لیے مہمانوں کی تواضع لال شربت اور تھوڑی سی مٹھائی سے کی گئی۔ جس پر وہاں بیٹھے مہمانوں نے بہت منہ بنایا مگر ابا نے اپنی ایک اور ذمہ داری کو خوشی اور سکون کے ساتھ رخصت کر دیا۔

نئے لوگ اور نئی جگہ کا خوف، اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے وین میں عورتوں کے جھرمٹ میں پھنس کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بھانت بھانت کی آوازیں، بچوں کے رونے چلانے کا شور، شدید گرمی، ریشمی جوڑا پہنے وہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔ اوپر سے گاڑی چل کم اور جھٹکے زیادہ کھا رہی تھی۔ اللہ اللہ کر کے بس ایک گھر کے سامنے رکی۔

رانی نے دل میں شکر ادا کیا اور اپنی چھوٹی نند رخسانہ کے کہنے پر آہستہ سے وین سے نیچے اتری۔ تنگ گلی میں بنا دس مرلے کا گھر اس کے سامنے تھا۔ گھر کے باہر بھی رنگ برنگی جھنڈیوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ ہی شادی والا گھر ہے۔ رانی نے ایک نظر ڈال کر سر جھکا لیا اور آگے چلتی عورتوں کی رہنمائی میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی گھر کے اندر داخل ہوئی۔

میکے کی طرح، رانی کا سسرال میں استقبال بھی اسی طرح ہوا جیسے سر سے کوئی مصیبت اتاری گئی ہو۔ نہ کوئی شگن کیا گیا اور نہ ہی کوئی رسم ادا ہوئی۔ شاید اس کی عزت اور اہمیت کا تعین، اس کی رخصتی کے وقت، باپ کی حیثیت اور رتبے سے ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی اسے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

گھر کے اندر بڑے سے صحن میں بچھی رنگین پایوں والی چارپائی پر اسے بٹھا کر وہ سب آپس میں باتوں میں مصروف ہو گئے۔ تین گھنٹے کی مسافت سے زیادہ، بارات کے روکھے پھیکے استقبال نے سب کو تھکا دیا تھا۔ اوپر سے کھانا بھی نہیں ملا۔ سب کا بھوک سے برا حال تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر ہی، اس کے گھر والوں کی برائیاں شروع ہو گئیں۔ وہ لال جوڑے میں گھبرائی اور سہمی ہوئی سی بیٹھی، ان کی باتوں پر پہلو بدلتی رہی۔

''شکر کریں اماں۔ ابھی ہم صرف گھر کے لوگ ہی گئے تھے بارات لے کر۔ سوچیں اگر خاندان کے لوگ بھی موجود ہوتے تو کتنی باتیں بناتے۔'' بڑی نند ثریا نے منہ بنا کر اعتراض کیا تھا۔

''دلہن کے ابا نے شرط رکھی تھی کہ رخصتی سادگی سے اور صرف گھر کے لوگوں کی موجودگی میں ہو گی کہ وہ زیادہ خرچہ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر مجھے کیا پتا تھا کہ اتنے کنجوس ہوں گے کہ بارات کو بغیر کھانا کھلائے ہی رخصت کر دیں گے۔ جیسے بیٹی رخصت نہیں کی بوجھ اتار کر پھینکا ہے۔ ارے او ارشد بیٹا۔ تُو ہی ہمت کر

اور قریبی تندور سے نان ہی لے آ۔ ہائے میری تو بھوک کے مارے جان نکل رہی ہے۔" اماں نے اپنے بڑے داماد (ثریا کے شوہر) سے کہا۔ جو اپنے بچوں کو بھی بھوک سے روتا دیکھ رہا تھا۔ اس لیے فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔ ساس سے پیسے پکڑ لیے اور سر ہلاتا گھر سے باہر نکل گیا۔

"شکر کریں کہ آپ کے "ہیرے جیسے قابل" بیٹے کو، کسی نے اپنی بیٹی دے دی ہے۔ اعتراض تو ایسے کر رہی ہیں جیسے اپنے عیبوں کا پتا نہیں ہے۔"

بانو نے طنز کے تیر چلائے اور اپنا پراندہ لہراتی ہوئی، کمرے کی طرف چلی گئی۔ نئی بہو کا خیال کرتے ہوئے، اماں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کی طبیعت صاف کر دیتی۔ پاس بیٹھی ثریا اور رخشندہ نے بھی ماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے چپ رہنے کا کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی ارشد گرم گرم نان لے کر آ گیا۔ وہ قریبی تندور سے بیسن اور آلو والے نان کے ساتھ دہی بھی لے آیا۔ سب ہی بھوکے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے کھانے پر ٹوٹ پڑے اور مزے لے کر کھانے لگے۔ رانی کے آگے ٹرے رکھ کر سب کھانے میں مصروف ہو گئے۔ رانی کا گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔ پتا نہیں اسے وہاں بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی، جب اس کی ساس نے چھوٹی بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ اسے بازو سے پکڑ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔

"یہ ہے آپ کا کمرا رانی بھابھی۔" رخسانہ نے کمرے میں پہنچ کر کہا۔ رانی نے ایک سرسری سی نگاہ ڈالی۔ کمرا روایتی طریقے سے سجایا گیا تھا۔

"آپ آرام کریں۔ پتا نہیں اکرم بھائی کب تک آئیں گے۔ ابھی تو اپنے یار، دوستوں کے ساتھ مصروف ہیں۔" رخسانہ نے اسے پلنگ پر بٹھایا اور آرام کا مشورہ دیتے ہوئے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ رانی نے پہلی بار سکون کا سانس لے کر ٹیک لگائی۔ باہر کی نسبت کمرا ٹھنڈا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ ایسے ہی نیم دراز لیٹی اپنی زندگی میں آنے والی اس تبدیلی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اب تک تو سب اس کی توقعات کے برعکس ہی ہوا تھا۔

"پتا نہیں ان کا مزاج کیسا ہوگا؟" رانی نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا۔ سارے سفر میں بس ایک یا دو بار ہی اکرم کی جھلک دیکھ پائی تھی۔ اسے اکرم اچھا لگا تھا۔ شاید یہ اس نئے رشتے کا کمال تھا کہ وہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مسکرانے لگی۔ یوں ہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے سوئے ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی جب کمرے میں گرنے والی کسی چیز کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی مگر اکرم کو کمرے میں دیکھ کر اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے یکدم ہی شرم نے گھیر لیا۔

اکرم آگے بڑھا۔ رانی خود میں سمٹی تھی۔ رانی کو لگا جیسے اکرم کچھ بول بھی رہا ہے مگر الفاظ رانی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ شاید وہ بہت گھبراہٹ کا شکار تھی۔

اکرم چیزوں سے ٹھوکر کھاتا آگے بڑھا اور پلنگ کے پاس آکر ایک دم ہی بستر پر ڈھیر ہوگیا۔

رانی پاؤں پیچھے کرتی ساکت رہ گئی۔ وہ ہکا بکا اپنے قدموں کے پاس بے سدھ پڑے اکرم کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اکرم نشے میں تھا۔ وہ ساری رات اسی صدمے کی حالت میں، اپنی زندگی کے اس بھیانک پہلو پر سوچتی رہی۔ صبح جب موذن کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو اس کے بے جان وجود میں ہلچل ہوئی اور اس کی منجمد آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی دروازہ کھول کر باہر نکلی تو سب سے پہلے اس کا سامنا، وضو کر کے اپنی کمرے کی طرف جاتی اماں سے ہوا۔ اماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس پر سے ہوتی ہوئی ان کی نظر پلنگ پر بے سدھ پڑے اکرم پر پڑی تو وہ نظریں چرا کر رہ گئی۔

''رانی بیٹی۔ تُو کپڑے بدل لے۔ آ ادھر میرے ساتھ۔'' اماں اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکرم کی اس حرکت کے بارے میں کسی اور کو پتا چلے۔ رانی گم صم سی اس کے پیچھے چل پڑی۔ اماں کے بستر پر نیند میں گم ہوتے ہوئے وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی زندگی میں سکھ کے سانس اور سکون کی بہت کم نیندیں لکھی گئی ہیں۔

☆☆☆

نئی مما کے آنے سے ان کے گھر اور زندگی میں بہت تیزی سے تبدیلی رونما ہوئی۔ نئی مما نے آتے ہی سمجھ داری سے ہر چیز اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ہر دیکھنے والی آنکھ کے لیے وہ ایک محبت کرنے والی، اپنے گھر سے مخلص اور وفا شعار ماں کے روپ میں تھی۔ بچے تو بچے، شوہر بھی اس کے گن گاتا تھا۔ وہ تھی ہی اس قابل۔ سب اس کی کرشمہ گری تھی کہ ہر چیز اس کے آنے سے سج گئی۔ وہ نیری ٹیل کی کسی ملکہ کی طرح سب کو اپنے بس میں کرنا جانتی تھی۔

سسرال میں تھا ہی کون؟ صرف ایک بڑی نند فریحہ، جو شادی کے بعد کئی سالوں سے دبئی میں مقیم تھی۔ اس لیے کسی کی روک ٹوک کا ڈر نہیں تھا۔ وہ یہاں کی بے تاج ملکہ تھی۔ فیصل جو اس سے شادی کرنے سے پہلے کئی طرح کے وسوسوں کا شکار تھا۔ اب بہت خوش اور مطمئن رہتا۔ فیصل کو اپنے فیصلے اور انتخاب کی درستی پر فخر ہونے لگا۔ طوبیٰ کے مرنے کے بعد وہ بہت اکیلا اور تنہا ہوگیا تھا۔

دونوں بچوں کی ماں سے محرومی کا احساس اسے قدم قدم پر پریشان کرتا تھا۔

فریحہ آپی اس کی فکر و پریشانی میں مبتلا رہتی تھیں اور اسے بار بار دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیتیں۔ فیصل خود بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ اکیلے زندگی گزارنا اس کے لیے بھی ممکن نہیں ہے مگر وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لیے جب اس نے دوسری شادی کا ارادہ کیا تو بہت سوچ سمجھ کر اور ہر پہلو کا جائزہ لینے کے بعد رانیہ کو اپنے بچوں سے ملوایا تھا۔

رانیہ سے اس کا پہلا تعارف کچھ عرصہ پہلے ہی ہوا تھا۔ وہ اس کے آفس میں کچھ عرصہ قبل بطور ریسپشنسٹ آئی تھی۔ اس کا با اعتماد انداز اور خوب صورتی سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ فیصل اور وہ بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ فیصل اپنے طور پر اسے اچھی طرح جانچ اور پرکھ رہا تھا اور جب اسے یقین ہوگیا اب مستقبل میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا تو اس نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنایا۔

ایک دن سادگی سے نکاح کر کے اسے اپنے گھر لے آیا۔ فریحہ آپی فوراً پاکستان نہیں آسکتی تھیں۔ اس لیے فون اور انٹرنیٹ پر ہی اسے دیکھ کر اور بات کر کے تسلی کر لی۔ یوں رانیہ اس کے گھر اور زندگی میں بہار کا تازہ جھونکا بن کر چھا گئی۔

ایک سال اتنی جلدی گزرا جیسے آنکھ جھپکی ہو۔ ان ہی دوڑتے بھاگتے دنوں میں، ایک دن شرماتے، جھجکتے ہوئے رانیہ نے اسے ''خوش خبری'' سنائی۔ تو وہ بہت حیران ہوا، پھر خوشی سے جھوم اٹھا۔ رانیہ اسے

خوش دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ ایک خدشہ جو کبھی کبھی اس کے ذہن میں ڈنک مارتا تھا، وہ آج ختم ہو گیا تھا۔

رانیہ بہت خوش تھی۔ اسے محسوس ہوتا کہ جیسے ساری بادشاہت اسے ملنے والی ہو۔ آنے والے وقت کا ایک خوش کن خواب اس کی آنکھوں میں سج گیا تھا۔ بہت جلد اس گھر میں ان دونوں کا بچہ بھی اس پیار میں حصے دار بننے کے لیے اس دنیا میں آنے والا تھا۔

رانیہ کو بے چینی سے بس اس وقت کا انتظار تھا۔ جواب زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ وہ مطمئن اور خوش تھی کہ سب اس کی مرضی اور سوچ کے مطابق ہو رہا ہے۔ ان دنوں وہ بنا پروں کے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ مضبوط ہوتے قدموں نے اس کے سب ڈر اور خوف مٹا دیئے تھے۔

☆☆☆

اکرم ہر لحاظ سے اس کی سوچوں سے ہٹ کر نکلا تھا۔ شروع کا کچھ عرصہ تو وہ شرمائی گھبرائی سب کی ایکسرے کرتی نظروں سے ہی خائف رہی تھی۔ اس لیے وہ ٹھیک سے کسی بات کا اندازہ نہیں لگا سکی۔ پھر جب اس پر گھر کی ذمہ داری پڑی تو اسے اپنی حیثیت کا ایک بار پھر اندازہ ہوا۔

سارے گھر پر جیٹھ اور جٹھانی کا راج تھا۔ سارا حساب کتاب، لین دین، ملنا ملانا، سب وہ لوگ کرتے تھے۔ ساس معزول حکمران کی طرح، چارپائی پر بیٹھ کر حکم چلانے کی ناکام کوشش کرتی رہتی۔ اکثر اماں کا کھوٹا سکہ بھی چل جاتا کیونکہ بہر حال وہ گھر کی بڑی بزرگ اور ان کی ماں تھی۔ اس لیے بہت سی جگہوں پر دونوں بیٹوں کو ماں کی بات سننی ہی پڑتی۔

رانی اس گھر کا سب سے کم زور فرد تھی۔ اس کا شوہر گھر میں ٹکتا ہی نہیں تھا۔ یار، دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے والا، کبھی کما کر گھر نہیں لایا۔ اس لیے اس کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ تیزی سے گزرتے دن رانی کو یہ احساس دلانے لگے کہ آنے والا وقت اس کے لیے بہت مشکل ثابت ہوگا۔ وہ والدین کے گھر بھی بہت خوش حال زندگی نہیں گزار رہی تھی مگر وہاں اتنی مشکلیں اور سختیاں بھی نہیں تھیں۔

شادی کے بعد وہ بامشکل دو سے تین بار ہی اپنے میکے جا سکی تھی۔ نہ تو اس کے والدین کی یہ خواہش تھی کہ وہ زیادہ آئے جائے اور نہ سسرال والے چاہتے تھے کہ وہ آئے روز میکے جا کر بیٹھ جائے۔ کیونکہ ان لوگوں کو مفت کی نوکرانی مل گئی تھی جس کے کندھوں پر سارے گھر کی ذمہ داری ڈال دی گئی تھی۔ اکرم سے شادی کے عوض، اسے جو چار دیواری کا تحفظ اور تین وقت کی روٹی مل رہی تھی، اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے اسے کولہو کے بیل کی طرح کام کرنا پڑتے تھے۔

رانی نے پہلے پہل گھبرا کر اپنی ماں سے بات کرنا چاہی۔ ماں نے پہلی شکایت سنتے ہی اسے ٹوک دیا۔

''آئندہ سسرال کی بات میکے میں نہیں کرنا۔ اچھی بیٹیاں اپنا گھر بسانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔'' رانی ٹکر ٹکر ماں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

وہ اپنا درد، اپنا خوف، اپنی تکلیف کس سے کہتی؟ ماں باپ نہیں تو اور کون؟ بڑی بہنیں اپنے اپنے گھر بار والی، اور چھوٹی بہنیں ابھی معصومیت کی سرحد پر تھیں۔ انھیں اپنے دکھ سنا کر وہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے صبر کی بوسیدہ چادر اوڑھ کر ماں باپ کے گھر سے نکل آئی مگر اس کی بوسیدہ چادر میں خواہشوں اور محرومیوں کے بہت سے سوراخ تھے۔ جہاں سے شکوے شکایت کی تند و تیز ہوائیں اکثر اندر آتی رہتیں اور تن من کو سلگا دیتیں۔

رانی صبح سویرے اٹھ جاتی۔ سب سے پہلے اماں کو ناشتہ بنا کر دیتی۔ اس کے بعد باری باری جو بھی اٹھتا، رانی اسے گرم گرم ناشتا پیش کرتی۔ ساتھ ساتھ گھر کے باقی کام بھی نبٹاتی جاتی۔ جانوروں کے چارے سے لے کر باڑے کی صفائی ستھرائی تک اس کی ذمہ داری تھی۔ آئے روز کے مہمانوں اور نندوں کی آمد اس پر اضافی بوجھ تھا مگر وہ دم سادھے سب کا حکم بجا

لاتی۔ شکوہ کس سے کرتی اور کس بل بوتے پر۔

وہ جس زمین پر کھڑی تھی نہ وہ اس کی اپنی بنی اور نہ سر پر تنا ہوا آسمان اس کا ہوا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ جیسے وہ کرائے کے زمین اور آسمان تلے رہ رہی ہے۔

رانی بہت ڈرپوک یا دبو قسم کی لڑکی نہیں تھی مگر وہ بولتی تو کس کی شہ اور پشت پناہی پر؟ یہاں چھوٹی سے چھوٹی غلطی اسے گھر سے باہر نکال سکتی تھی۔ وہ اسی ہونے اور نہ ہونے کے درمیان گھن چکر بنی اپنا وقت کاٹ رہی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہ اپنی حالت سے ناواقف، سب سے بہت بےزار اور اکتائی ہوئی تھی۔

ایک دن صبح کے وقت، اسے الٹیاں کرتے دیکھ کر جہاں اماں ٹھٹکی۔ بانو بھی اپنے کمرے سے فوراً باہر نکل آئی اور اس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے سارا گھر ہی سر پر اٹھالیا۔

"لو جی ہم نے کیا مفت خوروں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ پہلے ہی اس گھر میں بیٹھ کر کھانے والے کم ہیں جو نئے مہمان کی تیاری کی جا رہی ہے۔ بی بی یہ کارنامہ سرانجام دینے سے پہلے اپنے حالات بھی دیکھنے تھے۔ شوہر تمہارا دنیا جہان کا نکما اور نکھٹو ہے۔ اسے سوائے دوستیاں نبھانے کے دوسرا کوئی کام نہیں آتا۔ تم کس برتے پر اس بچے کو دنیا میں لاؤ گی؟ تمہارا بوجھ ہم اٹھا رہے ہیں کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

رانی آنسو پیتی خاموشی سے سر جھکائے کونے میں بنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اپنے جیٹھ اور بت بنے شوہر کے سامنے اسے مزید تماشا بننا منظور نہیں تھا۔

"کیوں صبح سویرے اپنی نحوست کا رونا رو رہی ہے؟ مت بھول کہ یہ گھر اور زمینیں دونوں بھائیوں کی سانجھی ہیں۔

ارے کچھ شرم کر، ابھی کچھ مہینے پہلے مدثر کی پیدائش پر تیرے مشکل وقت میں اس نے تیرا کتنا ساتھ دیا۔ تو بس ملکہ عالیہ بنی پلنگ توڑتی رہی اور چھوٹے مدثر کو یہ بےچاری سنبھالتی رہی۔ سارا گھر بھی اور تیرے روز، روز کے آئے بھوکے ننگے رشتہ داروں کو بھی۔ جو مبارک باد دینے کے بہانے آتے اور کھانا کھائے بغیر نہیں جاتے تھے۔"

اماں کی فراٹے بھرتی زبان نے کیا رکنا تھا، ساتھ ہی بانو کی چیختی چلاتی آواز سے گھر میں عجیب سا شور پیدا ہو گیا۔ فیاض، ماں اور بیوی دونوں کو چپ کروانے کی کوشش کرنے لگا۔ جبکہ اکرم خاموشی سے گھر سے نکل گیا۔ چولہے کے سامنے، رانی سر جھکائے پیڑھی پر بیٹھی، لکڑیوں کی راکھ میں تنکا پھیرتے ہوئے، صحن سے آتی آوازوں پر آنسو بہا رہی تھی۔

یہ سچ تھا کہ اس نے شادی کے بعد سے اس گھر اور یہاں کے مکینوں کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر اسے اس نئے رشتے اور یہاں کی زندگی سے سوائے طعنوں، ذلت اور بےرخی کے کچھ نہیں ملا تھا۔ شادی خوشی کا نام نجانے کن لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس نے تو آئے روز نئے نئے امتحان ہی دیکھے تھے۔ بیس سال کی عمر میں وہ غم کی فصل کاٹ رہی تھی۔

میکے جاتی تو وہاں بھی کوئی اس کا منتظر نہیں ہوتا۔ نجانے بیٹیاں کیوں بوجھ لگتی ہیں ماں باپ کو۔ جنہیں صرف بیاہنے کی فکر رہتی ہے۔ رانی کے اندر عجیب سی بغاوت سر اٹھانے لگی تھی۔

وہ اکثر سوچتی اور جلتی کڑھتی رہتی کہ اس کے والدین نے اسے کیسے انجان لوگوں کے سپرد کر دیا اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ کیا کبھی انھوں نے یہ سوچا کہ جن کے ہاتھوں میں اپنی بیٹی دے رہے ہیں کیا وہ اس کے قابل بھی ہیں؟

اس کے امید سے ہونے کی خبر کسی کے لیے بھی خوشی کا باعث نہیں بنی۔ ساس نے بانو بھابھی کے سامنے اس کی طرف داری نہیں کی تھی بلکہ اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ بعد میں اسے بلا کر بھی ٹھیک ٹھاک

سنائی تھیں۔ یہ ہی رویہ اس کی نندوں کا بھی تھا۔ وہ بھی یہ سن کر اپنے نادر خیالات کا اظہار کرنے لگیں۔ رہ گئی بات اکرم کی تو وہ اس دن ایسا غائب ہوا کہ دو ہفتے تک گھر ہی نہ آیا۔

آ بھی جاتا تو رانی کو کیا فرق پڑ جانا تھا۔ عادی جواری تھا۔ خوش ہوتا تو مہربان بن جاتا، نہیں تو اپنی ہار کا غصہ اسے مار کر نکال لیتا۔ رانی اسے دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے اب ڈرنے لگی تھی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتی کہ اکرم گھر ہی نہ آیا کرے۔

اماں اور بانو بھابھی تو صرف زبان سے زخم لگاتی تھیں جو نہ دکھتے تھے، نہ ان پر مرہم پٹی کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ مگر اکرم کی مار کے زخم تو ٹھیک ہونے میں کئی دن لگا دیتے تھے۔ اب زخموں کے ساتھ روزمرہ کے کام کرنا اس کے لیے دہری اذیت بن جاتی تھی۔ تین ہفتے بعد اکرم گرد میں اٹا، بڑھی شیو اور لمبے بالوں کے ساتھ گھر آیا تو اماں نے اسے لتاڑتے ہوئے اپنی ذمہ داری اٹھانے کا احساس بھی دلایا مگر یہ سب سن کر بھی اس کا رویہ معمول کے مطابق ہی رہا۔

اس رات بھی نشے میں دھت ہو کر رانی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے، اسے بالکل بھی اس کی حالت کا احساس یا خیال نہیں تھا۔ رانی نے نفرت کی شدید لہر اپنے اندر اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی۔

رات کے آخری پہر، اپنے چور چور جسم کے ساتھ پلنگ پر لیٹی آنسو بہاتی ہوئی وہ جان گئی تھی کہ اس کی طرح، اس کا ہونے والا بچہ بھی بدنصیب اور دوسروں کی ٹھوکروں پر پلنے والا ہوگا۔

"کاش یہ بچہ پیدا ہی نہ ہو۔"

سب کے رویوں کی سزا، اس نے بھی خود کو کوس کر دی تھی۔

مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ کچھ باتیں منہ سے نکلتے ہی قبولیت کا درجہ پا لیتی ہیں۔

☆☆☆

"مما مجھے گود میں بیٹھنا ہے۔"

رمشا مسلسل ضد کر رہی تھی اور بار بار ناشتے کی ٹرے ہاتھ سے پیچھے کر دیتی۔ آج اتوار کا دن تھا۔ فیصل بھی گھر پر موجود تھا۔ وہ اور رانیہ بہت خوش اور مطمئن انداز میں لان میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

جب اپنی نیند پوری کر کے آنکھیں ملتی ہوئی رمشا وہاں چلی آئی۔ آتے ہی باپ کی گود میں بیٹھ کر لاڈ سے باتیں کرنے لگی۔ فیصل بھی سب بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رانیہ نے بہت ناگواری سے اس منظر کو دیکھا تھا اور سر جھٹک کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس وقت رجو ٹرے ہاتھ میں چلی آئی۔

"رجو۔ رمشا بے بی کو اندر لے جاؤ اور ناشتہ کروا دو۔ یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ملازمہ نے گھبرا کے کہا۔

"بیگم صاحبہ میں نے رمشا بے بی سے بہت بار کہا مگر وہ نہیں مانیں اور بھاگ کر یہاں آ گئیں۔ اس لیے میں ٹرے اٹھا کر یہاں لے آئی۔"

رجو نے جلدی سے وضاحت سے جواب دیا۔

"بری بات ہے رمشا بے بی۔ ٹیبل مینرز ہوتے ہیں۔ آپ ابھی نہیں سیکھو گی تو سب کیا کہیں گے۔ چلیں شاباش ناشتہ کر کے آئیں۔"

اس نے بظاہر نرم لہجے میں کہا مگر اس کے لفظوں میں واضح اکتاہٹ موجود تھی۔

"نہیں۔ مما کی گود میں بیٹھ کر بریک فاسٹ کروں گی۔" رمشا نے لاڈ سے کہتے ہوئے اپنے دونوں بازو اس کی طرف کیے۔ رانیہ نے فیصل کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔

فیصل فوراً اس کے اشارے کو سمجھ گیا اور پیار سے رمشا کو سمجھانے لگا کہ وہ ناشتا کر لے مگر رمشا ضدی لہجے میں مسلسل ایک ہی بات کی گردان کیے جا رہی تھی۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ رمشا کتنی ضدی ہو گئی ہے۔ جب تک ممکن تھا میں اس کے سب لاڈ اٹھا لیتی تھی مگر اب۔" رانیہ نے اپنی حالت کی طرف اشارہ

کیا۔ اس کا پانچواں مہینہ چل رہا تھا۔
"رمشا بس بہت ہو گیا۔ بہت ضدی ہو گئی ہو۔ جاؤ رجو کے ساتھ اور ناشتا کرو۔ میں دوبارہ کوئی آواز نہ سنوں۔"
فیصل ایک دم ہی ضد کرتی رمشا پر چلایا اور اسے اپنی گود سے اتار دیا۔ رمشا ایک دم ہی ڈر گئی اور رونے لگی۔ رجو نے صاحب کے اشارے پر اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتی ہوئی اندر لے گئی۔
"آپ نے بلاوجہ بچی کو ڈانٹ دیا۔ میں اسے کسی طرح بہلا لیتی بلکہ آپ کہتے تو اسے گود میں بٹھا لیتی۔ کیا ہوا اگر ڈاکٹر نے بہت احتیاط سے کام لینے کا کہا ہے۔ میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی فیصل۔"
رانیہ نے بہت نرمی سے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔
فیصل کا تنا ہوا چہرہ ایک دم ہی پرسکون ہو گیا۔ رانیہ کی محبت اور فکر مندی نے اس کے اندر سکون پھیلا دیا تھا۔ اس نے جواباً محبت سے رانیہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔
"نہیں بھئی۔ ہمارے ہونے والے بچے کا بہت خیال رکھو۔ مجھے اندازہ ہے کہ ماں کی کمی کی وجہ سے رمشا اور عادل تھوڑے ضدی ہو گئے ہیں۔ مگر اب تم آ گئی ہو تو سب آرام سے دیکھ لینا۔"
رانیہ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ صرف سوا سال ہی ہوا تھا اسے اس گھر میں آئے اور فیصل اب مکمل طور پر اس کے زیر اثر آ گیا تھا۔ فیصل کی کوئی کال آ گئی، تو وہ موبائل کان سے لگا کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔
"کتنی حیرت کی بات ہے ناں۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس شخص کی ترجیحات میں اس کے بچے پہلے نمبر پر تھے مگر آج......"
رانیہ نے ایک مطمئن نظر بڑے سے لان پر ڈالی اور آگے جھک کر فریش جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

☆☆☆

"بھائی میں نے مما سے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے خود ناشتا کروائیں مگر پاپا نے ڈانٹ دیا اور مجھے اندر بھیج دیا۔"
رمشا ہچکیاں لیتی اپنے سامنے بیٹھے عادل کو ساری بات بتا رہی تھی۔ عادل کی آنکھوں میں اداسی گہری ہو گئی مگر اس نے اپنی پیاری بہن کے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے دلاسا دیا۔
"رمشا تمہیں بھی ضد نہیں کرنی چاہیے تھی ناں۔ میرے ساتھ ناشتہ کر لیتیں۔"
عادل نے اس کا بھیگا چہرہ ٹشو پیپر سے صاف کیا اور اس کے چہرے پر آئے بالوں کو نرمی سے پیچھے کیا۔ رمشا کے سیاہ بال بہت گھنے تھے۔ عادل کو یاد آیا کہ اس کی امی کے بال بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ رمشا کے بال بھی ان کی طرح لمبے ہوں۔ اس لیے وہ اپنے ساتھ ساتھ اس کے بالوں کا بھی بہت خیال رکھتی تھیں۔
جب بھی عادل رمشا کو امی سے تیل لگواتے دیکھتا تو ضد میں اپنے بالوں میں بھی تیل لگواتا تھا۔ امی ہنستی تھیں اس کی اس حرکت پر مگر بعد میں اسے بہت پیار سے سمجھاتی بھی تھیں کہ......
"اچھے بھائی بہنوں سے ضد نہیں کرتے بلکہ ان کا خیال رکھتے ہیں۔"
عادل اس وقت ایسی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا مگر رانیہ کے آنے کے بعد اس نے بہت سی باتوں کو سنجیدگی سے لینا اور اس پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے کی طرح وہ اپنا وقت ویڈیو گیمز کھیلنے میں نہیں گزارتا تھا بلکہ زیادہ سے زیادہ وقت رمشا کے ساتھ رہتا۔ وہ رمشا کی ایسے حفاظت کرتا جیسے وہ اس سے کئی سال بڑا ہو۔ بڑا تو وہ سچ میں ہو گیا تھا۔
"بھائی! پاپا بھی تو وہاں تھے نا۔ وہ بھی مجھے اپنے ہاتھوں سے ناشتا کروا سکتے تھے مگر پاپا نے مجھے ڈانٹ دیا۔ پاپا بالکل اچھے نہیں ہیں، وہ پہلے مجھے نہیں ڈانٹتے تھے۔" رمشا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔
"پہلے کی بات اور تھی رمشا۔ اب نئی مما آ گئی ہیں۔ پاپا ان کی زیادہ فکر کرتے ہیں۔" عادل نے

اداسی سے کہا۔

اس کی نظروں کے سامنے ایسے کتنے ہی منظر آ گئے جب اس کے باپ نے اپنی نئی بیوی کی خاطر انھیں نظرانداز کیا تھا۔ کتنی جھڑکیاں، کتنی ڈانٹیں، سرزنش، نئی مما کی جھوٹی سچی شکایتیں سن کر وہ انھیں سنا چکے تھے۔ عادل بچہ تھا مگر بچے ہی رویوں میں چھپے پیار اور نفرت کو سب سے پہلے محسوس کرتے ہیں۔

عادل نے جو محسوس کیا، اسی کی بنیاد پر وہ رمشا کو آنے والے برے وقت سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

''اچھا اب بس۔ میں ہوں ناں اپنی گڑیا کے ساتھ۔ ابھی ہم مل کر ناشتہ کریں گے پھر میں تمہیں نئی ڈزنی مووی دکھاؤں گا۔'' عادل نے اسے بہلایا اور پھر رجو کو آواز دے کر ناشتا اپنے کمرے میں منگوالیا۔ دونوں قالین پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ عادل نے آملیٹ اور سلائس کا پہلا نوالہ بنا کر رمشا کی طرف بڑھایا۔ وہ مزے لے لے کر کھانے لگی۔

☆☆☆

''دیکھنے میں تو اچھی بھلی تھی پھر کیا ہوا؟''

رانی یہ بات کتنی بار سن چکی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ سوال ہر بار کیا جاتا۔ اس رات اس کے منہ سے نکلی دعا اس کے حق میں سنی گئی اور تیسرے مہینے کے شروع میں، ایک رات اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ ساری رات تڑپ تڑپ کر گزاری۔ پاس سویا ہوا اکرم اس کی دبی دبی چیخیں سننے کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوا۔ صبح پہلی بار اس سے گھر کا کوئی کام نہیں ہوا۔ بانو بھابھی کے بچے اسکول سے لیٹ ہوئے اور شوہر کو بھی ناشتا نہیں ملا تو وہ تنتناتی ہوئی، اپنے کمرے سے نکلی اور درد سے تڑپتی رانی کے سر پر آ کر بولنے لگی۔

شور سن کر اماں بھی صحن سے اٹھ کر رانی کے کمرے کی طرف آئی تو اسے دیکھ کر چونک گئی۔ اکرم کو ہاتھ مار کر اٹھایا۔

''ارے اٹھ جا منحوس۔ کیا بھنگ پی کر سو رہا ہے۔ تیرے پاس پڑی وہ تڑپ رہی ہے۔ لوگوں کے طعنے سن رہی ہے اور ایک تُو ہے کہ بے حس پڑا ہے۔ اٹھ جا۔ رانی کو فوراً قریبی ہسپتال لے جا۔ مجھے خیر نہیں لگتی ہے۔''

اماں کے کہنے پر اکرم آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ بانو بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ رانی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اکیلی اکرم کے ساتھ ہسپتال جاتی۔ اس لیے اماں نے آواز دے کر ساتھ والی پڑوسن سلمٰی کو بلالیا۔ جس سے رانی کی اچھی سلام دعا تھی اور اس کی ہمدرد بھی تھی۔ وہ اکثر اس کے پاس آتی جاتی رہتی۔

قریبی سرکاری ہسپتال جانے کے کچھ دیر بعد سلمٰی بھاگی ہوئی گھر آئی اور رانی کی طبیعت شدید خراب ہونے کا بتایا۔ اماں نے گلی کا بچہ بھیج کر سب سے قریب رہنے والی بیٹی ثریا کو بلایا۔ جب تک یہ لوگ کلینک پہنچے۔ ڈاکٹر اپنا کام کر چکی تھی۔ رانی کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے کوکھ میں ہی مر گیا تھا۔ کم عمری اور اچھی خوراک نہ ملنے اور مناسب آرام نہ کرنے کی وجہ سے رانی کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے اکرم کے ساتھ ساتھ اماں اور ثریا کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔

''اس کی کم عمری اور خراب صحت کی وجہ سے یہ ہوا ہے۔ کم از کم اسے اچھی غذا اور کچھ آرام تو کرنے دیتے۔ بے چاری موت کے منہ سے واپس آئی ہے''

ڈاکٹر نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے، دوائیوں کا ایک لمبا پرچہ لکھ دیا۔ دو دن کے بعد اسے بہت سی ہدایتوں کے ساتھ گھر بھیج دیا گیا۔ رانی کی حالت کا سن کر اس کی ماں اور سب سے بڑی بہن سمیرا ملنے آئیں مگر شام ہونے سے پہلے چلی گئیں۔ اماں اور بانو چاہتی تھیں کہ وہ رانی کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ بانو نے دبے لفظوں میں کہا بھی مگر اماں اپنے شوہر کی وجہ سے سخت مجبور تھی۔ جو بیٹیوں کا میکے آنا اور رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ سب سمجھ کر بھی خاموشی سے سر جھکا کر، اپنے آنسو پیتی وہاں سے چلی گئی۔

رانی کو اس کڑے وقت میں کسی بہت اپنے کی

ضرورت تھی۔ وہ بہت اداس اور دکھی تھی مگر آج بھی اس کے دکھ، درد سننے والا کوئی نہیں تھا۔

سسرال میں سب جانتے تھے کہ اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے وہ جو چاہے سلوک اس کے ساتھ روا رکھتے۔ سوال کس نے کرنا تھا اور حساب کس نے دینا تھا؟

رانی جس نے سارا گھر سنبھالا ہوا تھا۔ بیماری کے دوران کوئی اسے ایک وقت کی روٹی بھی بستر پر دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بالآخر ایک دن ہمت کر کے اسے اٹھنا ہی پڑا اور آہستہ آہستہ پہلے کی طرح گھر کے سارے کام کرنے لگی۔

مگر اب اماں اور بانو بھابھی کے ہاتھ نیا مشغلہ آ گیا۔ ہر آئے گئے کے سامنے رانی کے بیمار ہونے کا قصہ مزے لے لے کر سناتیں۔ قیاس آرائی کرتیں، سننے والے بھی ہاں میں ہاں ملاتے، عجیب سی نظروں سے کام کرتی رانی کو گھورنے لگتے۔ رانی دکھی دل کے ساتھ سب سنتی اور کاموں میں لگی رہتی۔

رانی جو ایک بار پھر سے اس درد اور تکلیف سے گزر رہی تھی، اب اسے نئی آزمائش اور رویوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کی تنگ زندگی، اب اس کے لیے موت کا کنواں بن گئی۔ مگر وہ مجبور تھی اس میں سانس لینے کے لیے۔

رانی نے ہاتھ میں پکڑی پرات میں چاولوں پر ٹپ ٹپ پانی کے قطرے گرتے ہوئے دیکھے تو چونک کر اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔

"کتنی دیر ہو گئی۔ اماں واپس آنے والی ہوگی۔" رانی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ ماضی کا آسیب، اکثر اسے اپنے بس میں کر لیتا اور ضبط کے بہت سے دھاگے ٹوٹنے لگتے۔

☆☆☆

"رمشا بے بی اب بس بھی کریں۔ کب سے کہہ رہی ہوں کہ بال بنوالیں۔ مگر آپ ہیں کہ سن ہی نہیں رہیں۔"

رجو، رمشا کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی مگر رمشا مزے سے بال کھولے یہاں سے وہاں پھر رہی تھی۔ رجو نے کتنی بار کوشش کی کہ اس کی دو چوٹیاں بنا دے مگر رمشا ہر بار منع کر دیتی۔

"ابھی میرا موڈ نہیں۔" کہہ کر رمشا بھاگ جاتی۔

اس وقت فیصل آفس سے واپس لوٹا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھی رمشا نئی یاد کی ہوئی انگلش نظم گاتے ہوئے، اپنی گڑیا کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ فیصل نے اس کے معصوم چہرے پر محبت بھری نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہماری بیٹی کیا کر رہی ہے؟"

فیصل نے کافی دنوں کے بعد اسے پہلے والے لہجے میں پکارا تو رمشا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ جلدی سے اپنی گڑیا دکھاتے ہوئے بولی۔

"پاپا۔ دیکھیں میری ڈول کے بال کتنے لمبے ہیں ناں۔"

"ہاں مگر میری گڑیا سے زیادہ نہیں۔" فیصل نے محبت سے کہتے ہوئے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

ایک دم ہی اسے طوبیٰ کی یاد بہت شدت سے آئی تھی۔ شاید اس لیے کہ طوبیٰ اور رمشا کے بال بالکل ایک جیسے تھے۔ لمبے، گھنے اور خوب صورت......!

اسی وقت اپنے چہرے کے تاثرات کو بامشکل قابو میں کرتے ہوئے رانیہ ان کے پاس آئی۔

"مجھے ریڈی رہنے کا کہہ کر، خود آپ پچھلے آدھے گھنٹے سے یہاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔"

رانیہ نے بظاہر بہت نرم لہجے میں کہا مگر وہ اندر ہی اندر حسد کی آگ میں جل رہی تھی۔

فیصل جسے رمشا کے پاس بیٹھے ابھی دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے، اس کے پکارنے پر چونکا اور کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھنے لگا۔

آج ڈاکٹر کے پاس اس کی اپائنمنٹ تھی اور فیصل نے اسے آفس سے نکلنے سے پہلے فون کر کے

تیار ہونے کا کہہ دیا تھا۔ اپنے کمرے سے نہ نکلنے والی رانیہ اسی وجہ سے لاؤنج میں آئی تھی۔ ورنہ وہ بیڈ پر لیٹے ہوئے صرف حکم چلاتی رہتی۔ سارا گھر نوکروں کے سر پر تھا۔ چاہے وہ سیاہ کریں یا سفید۔ رانیہ جس نے آتے ہی گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اپنے قدموں کی مضبوطی کا یقین پاتے ہی ہر چیز سے لاپروا ہوگئی تھی۔

''ہاں بس ویسے ہی۔۔۔!''

فیصل نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور سنجیدہ چہرہ لیے وہاں سے اٹھ گیا۔ رانیہ دل ہی دل میں کڑھتی، پاس کھڑی رجو کو ضروری ہدایات دیتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

''میں نے ٹھیک سے بال بھی نہیں باندھے۔ ابھی خشک ہی نہیں ہوئے تھے۔''

رانیہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے، اپنے بیگ میں سے ہیئر برش نکالا اور بالوں میں پھیرنے لگی۔ فیصل نے ایک نظر اس کے نئے اسٹائل میں کٹے کندھے تک آتے، ہلکے براؤن بالوں پر ڈالی۔ رانیہ کے بال بہت اچھے نہیں تھے مگر وہ انھیں بہت سیٹ رکھتی تھی۔

''تم نے کبھی بال لمبے کرنے کا نہیں سوچا۔ طوبیٰ کے بال بہت لمبے اور خوب صورت تھے۔ رمشا کے بال ماں پر گئے ہیں۔''

فیصل نے سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے گاڑی موڑی۔ رانیہ کا ہاتھ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اسے ہر وہ چیز اور حوالہ برا لگتا تھا جو فیصل کو اس کے ماضی کی یاد دلاتا۔ فیصل اکثر کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کر جاتا۔ جس میں اس کی گزری زندگی کے لمحوں کی خوشبو آتی تھی۔

رانیہ اپنی حسد کی آگ میں سلگتی، اپنے حال کو نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ کسی کے ماضی کے بیتے ہوئے لمحے گن رہی تھی۔

اپنے حال سے ناراض، ماضی میں رہنے والے، اپنا مستقبل اس دلدلی زمین کی طرح بنا دیتے ہیں، جس پر قدم رکھو تو وہ خود پر کھڑا رہنے نہیں دیتی بلکہ بہت اندر کہیں دفن کر دیتی ہے۔

☆☆☆

ان دنوں ہی اکرم نے لڑ جھگڑ کر زمین میں سے اپنا حصہ لے لیا اور کاروبار کرنے کے بہانے نجانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے لگا کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا۔

اسے رانی کے کسی دکھ، کسی تکلیف سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ نہ وہ اسے کوئی چیز لا کر دیتا تھا۔ رانی کی بنیادی ضرورتیں اماں کی مہربانی سے پوری ہو جاتی تھیں۔ بانو بھابھی نے اسے تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اپنی مرضی کے بغیر اسے کچھ بنانے بھی نہیں دیتی تھی۔ رانی بھرے پُرے گھر میں بھی فقیروں جیسی زندگی گزار رہی تھی۔ کپڑوں سے لے کر کھانے پینے تک کے لیے بھی وہ دوسروں کی محتاج تھی۔

ان دنوں اماں شدید بیمار ہو کر چارپائی سے لگ گئی۔ اسے دمے کا مرض تھا۔ جو وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ اماں ساری ساری رات سینے پر ہاتھ رکھے کھانستی، کبھی سینہ مل کر سانس لینے کی کوشش کرتی۔ اس کی حالت کے پیش نظر، رانی ہر وقت اس کے پاس رہتی۔ اکرم تو گھر آتا ہی کم کم تھا۔ اماں کے بہانے رانی کو بھی کچھ دیر آرام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی، وہ بانو بھابھی کی کٹیلی نظروں اور زہریلی زبان سے بچ جاتی۔

ایک دن اماں غسل کرنے کے بعد چمک دار دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رانی نے اس کے کم خشک ہوتے بالوں میں ہلکا سا تیل لگایا اور نرمی سے کنگھا پھیرنے لگی۔ اماں نے نرم آواز میں اسے پکارا۔

''رانی۔ دو دن کے بعد جمعرات ہے۔ تو تیاری کر لے۔ صبح سویرے ہی سلمیٰ کے ساتھ نکل جانا۔''

''سلمیٰ کے ساتھ؟ مگر کہاں اماں؟'' رانی نے ہاتھ روک کر حیرت سے پوچھا۔

''درگاہ شریف پر چلی جا۔ سنا ہے کہ پیر شاہ کی دعا میں بہت اثر ہے۔ اللہ تیری جھولی بھرے۔ تجھے جیتا جاگتا بچہ دے۔ تُو نے میری بہت خدمت کی ہے۔''

اماں نے آہستہ سے کہا تو حیرت اور خوشی سے رانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جلدی سے تیل کی شیشی پر ڈھکن لگایا اور ہاتھ دھونے کے لیے برآمدے میں لگے نلکے کی طرف بڑھی جب اماں کی آواز نے اس کے قدم روکے۔

''اور سن۔ اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ خاص کر اس بانو سے۔ جلتی ہے تجھ سے۔''

اماں نے آہستہ آواز میں اسے ہدایت کی اور پرسکون سی چارپائی پر لیٹ گئی۔ رانی نے اثبات میں سر ہلایا اور خوشی سے سرشار ہو کر باقی کے کام نمٹانے لگی۔

☆☆☆

''اتنی دیر ہو گئی؟ رمشا ابھی تک نہیں آئی؟''

عادل بے چینی سے لان کے چکر لگا رہا تھا۔ آج صبح رمشا کو بخار ہو رہا تھا۔ وہ اسکول کے لیے تیار ہو کر ناشتا کی میز پر آئی تو اسے دیکھ کر فیصل نے اسے اسکول جانے سے منع کر دیا' پاس بیٹھی رانیہ سے مخاطب ہوا۔

''جب بھی موسم تبدیل ہوتا ہے۔ رمشا ضرور بیمار پڑتی ہے۔ طوبیٰ اس لیے بہت احتیاط سے کام لیتی تھی۔ ابھی بھی اس کا ماتھا گرم ہو رہا ہے۔ کہیں بخار تیز نہ ہو جائے۔''

''اوہو فیصل۔ آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ عادل کو اسکول ڈراپ کر دیں۔ میں رمشا کو دوائی دے کر سلا دوں گی۔ آپ دیکھیے گا شام تک بالکل فٹ ہو گی اور اگر خدانخواستہ اس کا بخار نہ اترا تو اسے قریبی کلینک لے جاؤں گی۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔'' رانیہ نے کچھ سوچتے ہوئے جلدی سے کہا۔ عادل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ نجانے کیوں اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

''پاپا میں رمشا کے پاس رک جاتا ہوں۔'' عادل نے جلدی سے کہا تو رانیہ نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ رمشا کی نسبت وہ بہت سمجھدار اور ذہین تھا۔ اس لیے رانیہ اس سے محتاط رہتی تھی۔

''نہیں عادل بیٹا۔ آپ اسکول جاؤ' میں ہوں رمشا کے پاس۔ فکر مت کرو۔''

اس سے پہلے کہ فیصل کچھ کہتا، رانیہ نے جلدی سے کہا اور آواز دے کر رجو کو بلایا اور اسے رمشا کو کمرے میں لے جانے کا کہا۔ عادل بجھے دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا مگر اسکول میں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ بے چین رہا۔ اسکول سے واپس آتے ہی وہ سیدھا رمشا اور اپنے مشترکہ کمرے کی طرف بھاگا۔ جب رجو نے اسے آواز دے کر روکا۔

''عادل بابا۔ رمشا بے بی، میڈم صاحبہ کے ساتھ باہر گئی ہیں۔'' عادل نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ یک دم ہی ڈر گیا۔

''کیا رمشا کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔''

اپنی ماں کو کھونے کے بعد، وہ اپنے سے جڑے ہر رشتے کے بارے میں خوف زدہ رہتا تھا۔ موت سے زیادہ، اسے جدائی کا خوف تھا۔ کسی بہت پیارے اور اپنے کے گم ہو جانے کا خوف۔

''نہیں۔ ان کی طبیعت بہتر تھی۔ بس وہ ضد کر رہی تھیں کہ باہر جانا ہے۔ اس لیے میڈم صاحبہ انہیں قریبی مارکیٹ لے گئی ہیں۔'' رجو نے تفصیل سے جواب دیا اور اسے کپڑے تبدیل کرنے کا کہہ کر کچن میں چلی گئی۔ عادل یونی فارم تبدیل کیے بغیر لان میں آ گیا اور بے چینی سے مسلسل چکر لگاتے ہوئے، اپنے ہاتھ میں بندھی گھڑی پر وقت دیکھ رہا تھا۔

''ابھی تک آئیں کیوں نہیں۔'' عادل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رمشا کو کسی طرح اپنے سامنے لے آئے۔ رجو نے کئی بار باہر آ کر اسے آواز دی، بہلانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانا۔ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

"رمشا آئے گی تو اندر جاؤں گا۔" تھک ہار کر رجو نے اسے، اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

وہ چلتے چلتے تھک گیا تو قریبی بینچ پر بیٹھ گیا۔ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرہ سجائے وہ گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کے گھنے سلکی بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بلاشبہ خوب صورت بچوں میں شمار ہوتا تھا۔

"مما! کبھی بھی مجھے اور رمشا کو اپنے ساتھ لے جانا پسند نہیں کرتیں۔ پھر آج کیوں؟" عادل جتنا سوچتا، اتنا ہی الجھ رہا تھا۔

عادل کو اپنی ماں کی یاد شدت سے آئی۔ پھر اس کا ذہن رانیہ کی طرف مڑ گیا۔

"وہ دن بھی کتنے اچھے تھے۔" عادل کے دل میں اداسی پھیلنے لگی۔

اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا کہ پہلے پہل رانیہ مما کے ساتھ مل کر وہ سب آؤٹنگ پر جاتے۔ ہر ویک اینڈ پر جوائے لینڈ کا پروگرام رانیہ مما خود بناتی تھیں اور ان دونوں کو سرپرائز دیتیں۔ دونوں خوشی سے سرشار اچھلتے، کودتے چل پڑتے۔ ایک مکمل اور بھرپور شام گزار کر، واپسی پر کسی اچھی جگہ ڈنر کر کے، سب سے آخر میں آئس کریم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، من پسند میوزک سنتے ہوئے وہ گھر لوٹتے تھے۔

مگر پھر آہستہ آہستہ رانیہ مما اور پاپا انہیں گھر میں چھوڑ کر جانے لگے۔ رمشا یا وہ ضد کرتے تو فیصل چڑ کر ڈانٹ دیتا۔ فیصل کی غیر موجودگی میں رانیہ بھی سخت لہجے میں تنبیہہ کرتی کہ بچے ہر جگہ ساتھ نہیں جاتے۔ عادل تو بہت حد تک پیچھے ہٹ گیا مگر رمشا اکثر ضد کرتی۔ کتنے ہی دن، کتنی ہی راتیں، دونوں بچوں نے لاؤنج کی سیڑھیوں پر، بھیگی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے، ان دونوں کے واپس لوٹنے کے انتظار میں گزاری تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ پیچھے ہٹنے لگے مگر رمشا اکثر معصومیت سے سوال کرتی۔

"مما ہر وقت غصے میں کیوں رہتی ہیں؟"

عادل کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہ جاتا۔

اسے ڈھلتی دوپہر میں وہاں بیٹھے تقریباً دو گھنٹے ہو گئے۔ جب گاڑی کا ہارن بجا۔ عادل نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا تو گاڑی بڑے سے پورچ میں آ رکی۔ پہلے رانیہ کی طرف کا دروازہ کھلا۔ وہ بہت ادا سے بالوں کو جھٹکتی، دھیرے سے قدم اٹھاتی آگے بڑھی۔ دوسری طرف کا دروازہ کھلا۔ ہنستی مسکراتی رمشا سینے سے بڑی سے گڑیا لگائے، تیزی سے نیچے اتری تو اپنی جگہ بیٹھا عادل اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ اسی وقت رمشا کی نظر بھی اس پر پڑی۔ وہ خوشی سے چلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

"بھائی دیکھو۔ مما نے مجھے کتنی بڑی ڈول لے کر دی ہے۔ آپ کو پتا ہے۔ اس کے ساتھ دو ڈریس اور ہیں......"

رمشا نے گڑیا کے خوب صورت کپڑے ڈبے میں سے نکالتے ہوئے کہا اور اسے گڑیا کے ساتھ ملی مختلف چیزیں دکھانے لگی۔ عادل اپنی جگہ سے اٹھا اور حیرت سے آگے بڑھا۔

"رمشا تمہارے بال۔" عادل نے اس کے کندھے سے بھی اوپر کٹے بالوں پر بہت حیرت اور دکھ سے ہاتھ پھیرا۔

"بھائی۔ مما نے کہا کہ ابھی میری عمر بہت چھوٹی ہے ناں۔ اتنے لمبے بال اچھے نہیں لگتے۔ اس لیے کٹوا دیے۔ اچھی لگ رہی ہوں ناں۔"

رمشا خوشی سے کہتے ہوئے اسے گول گول گھوم کر دکھانے لگی۔ اسی وقت مسکراتی ہوئی رانیہ ان کے پاس سے گزری۔ عادل نے ایک نظر اس کے خوب صورت چہرے پر ڈالی۔ جس کی آنکھوں میں تنفر بہت واضح تھا۔ عادل کی نگاہوں سے نگاہ ملی تو رانیہ نے بہت عجیب سا تاثر اس کی آنکھوں میں ابھرتے ہوئے دیکھا۔

رانیہ چونکی مگر پھر وہ سر جھٹک کر اندر کی طرف

چل پڑی۔ عادل نے اپنے اندر اٹھتے غصے کی لہر کو بہت مشکل سے دبایا۔ جو رانیہ کو دیکھ کر ایک دم ہی ابھرا تھا۔ اس کے وہاں سے جاتے ہی، اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

''میں پاپا سے کہوں گا۔ وہ ضرور مما کو ڈانٹیں گے۔''

عادل نے اپنے ہاتھ کی پشت سے گیلی آنکھوں کو صاف کیا اور رمشا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اندر کی طرف مڑ گیا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے بیٹی۔ بہت دکھی نظر آتی ہو؟''

رانی کتنی ہی دیر سے سر جھکائے، دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے، پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ آس پاس سے گزرنے والے بہت سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر ترحم بھری نظر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔

سلمیٰ اور رانی صبح سویرے ہی گھر سے نکلیں۔ بانو بھابھی کو یہ ہی بتایا کہ رانی کی ماں کی طبیعت خراب ہے۔ اس لیے وہ ماں سے ملنے جا رہی ہے۔ اس پر بھی بانو کا منہ بن گیا اور بڑبڑانے لگی۔

رانی سب سن کر بھی ان سنی کرتی، اماں کو بتا کر سلمیٰ کے گھر چلی گئی۔ اکرم پچھلے کئی دنوں سے گھر نہیں آیا تھا۔

بڑی سی چادر میں سر سے پاؤں تک چھپی رانی خالی ہاتھوں میں امید اور آس کے دیئے جلائے، صرف کرائے کے پیسوں کے ساتھ عازم سفر ہوئی۔ پانچ گھنٹے کی مسافت، مسافروں سے کھچا کھچ بھری بس اور شدید گرمی میں پیاس نے نڈھال سا کر دیا تھا۔ سلمیٰ بہت باتونی تھی۔ اس کے پاس باتیں کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ سارے راستے اپنے چھوٹے سے بٹوے سے پیسے نکالتی رہی۔ کبھی قلفی والے سے قلفی لے لیتی اور کبھی ٹھنڈی بوتل خود بھی پیتی اور رانی کو بھی لے دیتی۔

وہاں پہنچ کر سلمیٰ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ مزار کا ماحول حسب توقع ہی تھا۔ جمعرات کی وجہ سے رش بھی بہت تھا۔ عورتوں والے حصے میں رانی ایک کونے میں بیٹھ گئی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو زار و زار رونے لگی۔

کالی چادر میں لپٹی ایک گوری چٹی عورت نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ رانی نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اپنی چادر سے صاف کیا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک انجان چہرہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ سلمیٰ نجانے کہاں رہ گئی تھی۔ رانی نے ادھر اُدھر نظر گھما کر دیکھا۔ وہ عورت رانی کے پاس کھسک آئی اور ہمدردی سے اس سے حال دریافت کرنے لگی۔

رانی نے ایک انجان اور ہمدرد چہرہ سامنے پایا تو اپنے دکھوں کی گٹھڑی کھول کر بیٹھ گئی۔ وہ بولتی گئی اور وہ عورت افسوس سے سر ہلاتی رہی۔ رانی چپ ہوئی تو اس عورت نے نرمی سے رانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

''تیری قسمت میں بہت دکھ لکھے ہیں اوپر والے نے۔ نہ ماں باپ کے گھر سکھی رہی اور نہ شوہر کے۔ پھر اوپر سے اپنے وجود کے ادھورے پن کا دکھ اور اذیت۔ کوئی بھی اس تکلیف کو نہیں سمجھ سکتا۔

اولاد نہ ہو تو ایک صبر رہتا ہے مگر اس طرح امید کا بننا اور ٹوٹنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا تین بار ہوا تھا مگر یہاں آ کر دعا کروانے سے اللہ نے میری جھولی بھر دی۔ ان شاء اللہ تیری جھولی بھی ضرور بھرے گی۔ امید رکھ۔

مگر......'' وہ عورت کہتے ہوئے چپ ہو گئی۔

''مگر کیا؟'' رانی نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

''بس ایک بات یاد رکھنا۔ اس کی بارگاہ میں اپنی ذات کا کاسہ جب بھی پھیلاؤ، اس میں بھی جھوٹ، منافقت مت شامل کرنا۔ خاص کر کسی کی بھی دل آزاری کے کھوٹے سکے لے کر اپنے دکھوں کا سودا مت کرنا۔ تم جانتی ہو، وہ ہر ایک کے کاسے میں سے دکھوں، آنسوؤں، فریادوں، محرومیوں کے سب کھوٹے سکے چنتا ہے، ان کے بدلے اپنی رحمت

کے دروازے کھول دیتا ہے مگر وہ کبھی بھی منافقت اور ریاکاری کے سکے نہیں قبول کرتا۔

یہاں مانگنے آئی ہے تو خالص دکھ کا سودا کرنا۔ وہ ضرور نوازے گا۔"

وہ عورت پورے یقین سے کہہ کر چلی گئی۔ رانی گم صم بیٹھی اس کی باتوں پر غور ہی کرتی رہ گئی۔

"کاسۂ ذات، سودا، خالص دکھ۔" وہ الجھ کر رہ گئی۔

"دنیا بھی بس فلسفہ بولنا جانتی ہے۔ دل پر گزری قیامتیں کون جانتا ہے۔"

رانی نے سامنے سے آتی سلمیٰ کو دیکھا اور خودکلامی کرتے ہوئے اٹھ گئی۔ شام ڈھلے جب وہ گھر پہنچی تو ایک نئی خبر اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

عادل کے برعکس فیصل نے رمشا کے کٹے بال دیکھ کر حیرت کا اظہار تو ضرور کیا مگر جب رانیہ نے اپنے مخصوص انداز میں سمجھایا کہ رمشا کی عمر بہت کم ہے اور وہ بہت کمزور ہے۔ اس طرح اس کی نشوونما ٹھیک سے نہیں ہوگی اور ویسے بھی وہ اپنے بال نہیں سنبھال سکتی۔

تو فیصل بھی اس کی تائید کرنے لگا۔ عادل غصے میں کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کر چلا گیا۔ فیصل نے حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر رانیہ کو۔ وہ چہرے پر پریشانی کا تاثر لاتے ہوئے کندھے اچکا کر بولی۔

"لگتا ہے کہ عادل نے مجھے اپنی ماں کی جگہ نہیں سمجھا ہے۔ اس لیے میری ہر بات اور عمل کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔" رانیہ نے مصنوعی اداسی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"تم فکر مت کرو۔ تمہاری طبیعت ایسی نہیں ہے کہ ٹینشن لو۔ میں دیکھ لیتا ہوں عادل کو، کیا مسئلہ ہے۔"

فیصل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور اٹھ کر عادل کے پیچھے چلا گیا۔ رانیہ کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سے مسکراہٹ ابھری اور پھر فوراً ہی معدوم ہوگئی۔ رمشا خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ رانیہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر سر جھٹک کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ رمشا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے پاس آئی اور تھوڑا سا جھک کر اندر جھانکنے لگی۔

عادل چیخ چیخ کر بول رہا تھا، اتنے دنوں کے پکتے لاوے کو آج راستہ مل گیا تھا۔ فیصل جو پہلے اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ ایک دم ہی غصے میں آ گیا اور عادل کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ رمشا نے ڈر کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"بس بہت ہوگیا۔ تم بہت بدتمیز ہوگئے ہو۔ میرے بے جا لاڈ پیار نے تمہیں بگاڑ دیا ہے۔ آج کے بعد تم نے رانیہ سے کوئی بدتمیزی کی تو نتائج کے ذمہ دار صرف تم ہوگے۔" فیصل نے سختی سے کہتے ہوئے، ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف ہوا۔ فیصل تیزی سے کمرے سے باہر نکلنے لگا تو ڈری سہمی رمشا پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور نمی بہت واضح تھی۔ فیصل نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بھاگتی ہوئی عادل کے پاس چلی گئی۔ فیصل کے دل پر بوجھ پڑا۔ وہ گہری سانس لے کر وہاں سے چلا گیا۔ عادل غصے سے سر جھکائے صوفے پر بیٹھا تھا۔ رمشا نے پاس آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ڈرتے ہوئے اسے پکارا۔

"بھائی۔" عادل نے سر اٹھایا اور اس کی بھیگی آنکھوں کو دیکھ کر فوراً ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں رمشا۔ کچھ نہیں ہوا۔ تم نے کھانا کھایا؟" عادل نے اس کی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ رمشا نے نفی میں سر ہلایا۔

"بھائی آپ نے بھی تو نہیں کھایا تھا ناں۔" رمشا نے معصومیت سے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے رمشا۔'' عادل نے بے دلی سے کہا۔ رمشا نے اپنے ننھے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما اور بولی۔

''بھائی آپ کو اچھا نہیں لگا کہ میرے بال اب چھوٹے ہو گئے ہیں۔ وعدہ بھائی آئندہ کبھی بھی نہیں بال کٹواؤں گی۔ آپ مما سے ناراض مت ہوں۔ وہ تو اچھی ہیں ناں۔ ہمارا اتنا خیال رکھتی ہیں۔'' عادل اونہہ کہہ کر رہ گیا۔

وہ رمشا کو کیا سمجھاتا کہ رانیہ نے کس طرح ان سے ان کا باپ چھین لیا ہے۔ بلکہ وہ سب کچھ چھین لینا چاہتی تھی۔ وہ سنڈریلا اور سنو وائٹ کی سوتیلی ماں کی طرح ہی تھی۔

''خوب صورت، مکار اور ظالم۔''

''تم مجھ سے وعدہ کرو کہ پھر بھی ان کے ساتھ کہیں بھی اکیلے نہیں جاؤ گی۔''

عادل نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو رمشا نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ عادل نے مطمئن ہو کر گہری سانس لی تھی۔

☆☆☆

رانی پیر شاہ کے ڈیرے سے لوٹی تو اندھے اعتقاد کی بیساکھیوں کے سہارے، زندگی کی دوڑ میں تیز بھاگنے اور ریس جیتنے کی کئی امیدیں اس کے پلو سے بندھی ہوئی تھیں۔ وہ امیدوں اور خواہشوں کے بہت سے جگنوؤں کو مٹھی میں قید کر کے سمجھ رہی تھی کہ آنے والی راتیں، ان کی روشنی سے کٹ جائیں گی مگر وہ یہ بھول گئی کہ جگنو کی مدھم روشنی، صبر کے گھرے اندھیروں میں تو کام آتی ہے مگر خود غرضی اور بے حسی کی تیز دھوپ میں نہیں۔

وہ تھکی ہاری گھر واپس لوٹی تو ایک نئی خبر اس کی منتظر تھی۔ جسے سنتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔

''مبارک ہو تجھے۔ اکرم نے دوسری شادی کر لی ہے۔'' بانو بھابھی نے اسے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں اطلاع پہنچائی۔ رانی اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' کچھ دیر کے بعد اس کے منہ سے بامشکل نکلا۔

''چل تُو پھر سچ معلوم کر کے مجھے بھی بتا دینا۔ اندر ماں بیٹے کی میٹنگ جاری ہے۔''

بانو بھابھی نے تیکھے انداز میں کہا اور پراندہ جھٹکتے ہوئے مڑ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

''پہلے ہی اس گھر میں ویلے اور نکھٹو لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا ہے، جن کا بوجھ بھی ہمیں اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اوپر سے آئے روز کے نت نئے تماشے۔ میں صاف کہہ دوں گی مدثر کے ابا سے۔ بس بہت ہو گیا۔ اب کسی کی اور ذمہ داری نہیں اٹھانی۔ اپنا حصہ تو لے گیا ہے۔ اب کیا ہماری جان لے گا۔''

بانو بھابھی بڑبڑاتے ہوئے، دراصل اسے سنا رہی تھی۔ صحن میں کھیلتے بچوں کو ڈانٹتے ہوئے، کمر پر دھموکے جڑے اور دھکا دیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف لے جانے لگی۔ بچے ماں کے تیور دیکھ کر سہم کر بھاگ کر کمرے میں چلے گئے۔ بانو بھابھی نے کمرے کا دروازہ زور سے بند کیا۔ سارے گھر میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

رانی بڑے سے صحن میں اکیلی رہ گئی۔ شام کب کی ڈھل چکی تھی۔ رانی نے گہری سانس لی اور اپنی چادر اتار کر گول مول سی لپیٹ کر ایک طرف پھینکی اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی، اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ نیم وا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ اندر سے آتی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

اماں پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی اور اکرم دائیں طرف بیٹھا اماں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی چمک دور سے بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ اماں بے زاری سے بار بار اس کے ہاتھ جھٹک رہی تھی۔

''چل ہٹ۔ بڑا آیا ماں کی فکر کرنے والا۔'' اماں نے اپنے پاؤں پیچھے کرنا چاہے مگر اکرم نے مضبوطی سے پکڑ لیے۔

''اماں۔ میری پیاری اماں! بات تو سن۔''

اکرم کے لہجے میں شہد گھلا ہوا تھا۔
''کبھی مجھ سے تو اس لہجے میں بات نہیں کی۔''
رانی نے سوچا۔
رانی کو لگا جیسے اس نے نیم کا کڑوا پانی پی لیا ہو۔اس کے سارے جسم میں کڑواہٹ پھیل گئی تھی۔
''کون ہے وہ بدذات؟'' اماں گرجی۔
''اس لیے تو مہینہ مہینہ بھر گھر نہیں آتا تھا؟ ارے کماتا تو کچھ ہے نہیں تو، دوسری شادی کس بل بوتے پر کی ہے تو نے؟'' اماں مسلسل اکرم کو ڈانٹ رہی تھی مگر وہ ڈھیٹ بنا، مسکراتے ہوئے سب سن رہا تھا۔
''اماں تو غصہ مت کر۔سب بتاتا ہوں تجھے۔''
اکرم ماں کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ رانی کو لگا کہ مزید یہاں کھڑا رہنا بے وقوفی ہے۔
''مگر میں عقل مند بھی کب تھی؟'' خود سے سوال جواب کرتی وہ باورچی خانے میں چلی آئی۔
رات کے کھانے کی تیاری کرتے ہوئے وہ اپنے ذہن سے سب جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر یہ سب آسان کب تھا؟ کیا وہ پتھر کی بنی تھی۔ جس کا کوئی احساس نہیں تھا۔
اس بات کو تین دن گزر گئے تھے مگر رانی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کل کی بات ہو۔
وہ بالکل گم صم ہو گئی تھی۔ وہ جو اتنی خوشی سے پیر شاہ سے تعویذ لے کر آئی تھی۔ کالا دھاگا اور کالی مرچ پر دم کروا کر لائی تھی۔ وہ سب اسی طرح الماری کے خفیہ خانے میں پڑا ہوا تھا اور وہ حیران و پریشان اپنی زندگی میں آنے والی نئی آزمائش کو دیکھ رہی تھی۔ اب کے اکرم لوٹا تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سلیقے سے کٹے ہوئے بال، کلین شیو، اور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔
رانی نے اسے پہلی بار گنگناتے ہوئے اور بات بے بات قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔
حتیٰ کہ بانو بھابھی نے اس کی بدلی حالت کو دیکھ کر رانی پر طنز کے تیر چلانا شروع کر دیے۔
''اسے کہتے ہیں سچی خوشی۔'' بانو بھابھی نے اکرم کے چمکتے ہوئے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''دیکھ۔ وہ کتنا خوش اور مطمئن ہے۔ ایک عورت نے کیسے اس کی کایا پلٹ دی اور ایک تو تھی کہ اس میں رتی برابر بھی تبدیلی نہیں لا سکی۔''
رانی اس کی باتوں پر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی مگر لب پر کوئی شکوہ نہیں لائی تھی۔
اس لیے نہیں کہ وہ صابر تھی۔
اس لیے کہ ابھی اس کا وقت نہیں تھا۔
وہ وقت کے حکمرانوں کے آگے بے بس اور کمزور تھی۔ اکرم ان تین دنوں میں مسلسل اماں کو مختلف طریقوں سے منانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ابھی بھی اماں کو سیب کاٹ کر دیتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔
''اماں تو خوامخواہ ناراض ہو رہی ہے۔ جب تیری بہو بہت جلد ہنستا، کھیلتا پوتا تیری گود میں ڈالے گی تو تو خود ہی مان جائے گی۔'' اکرم نے کہا تو اماں سیب کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے ''اونہہ'' کہہ کر رہ گئی۔
''سنبھال کر رکھ اپنی بیوی اور بچے کو۔ مجھے نہیں چاہئیں۔''
اماں کے لہجے میں واضح نرمی در آئی مگر پھر بھی غصہ دکھانا نہیں بھولی۔
''اچھا اماں۔ ناراض مت ہو۔'' اکرم کو راستہ مل گیا۔ وہ مزید اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے بولا۔
''دیکھ اماں! میں نے رانی سے بیاہ تیرے کہنے پر بغیر کسی ضد کے کر لیا مگر تین سال گزر جانے کے باوجود وہ عورت میرے دل میں جگہ نہیں بنا سکی۔ دل تو دل وہ اس گھر کے آنگن میں بھی خوشی کے پھول نہیں کھلا سکی۔ اماں ایسی عورت کے ساتھ میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔ مگر وہ تیری مرضی سے آئی ہے تو تیری مرضی سے ہی جائے گی۔''

اکرم نے اس فراخ دلی سے کہا جیسے رانی جیتی جاگتی عورت نہیں، کٹھ پتلی یا استعمال کی کوئی چیز ہے۔ جسے اماں اپنی مرضی سے جب دل چاہے استعمال کر سکتی تھی۔

رانی کو پہلی بار شدت سے اس گھر اور اس زندگی سے نفرت ہوئی تھی۔

ماں کو منا کر اکرم اسی شام واپس چلا گیا۔ رانی کی قسمت کا فیصلہ اب اماں کے ہاتھ میں تھا۔

ان دنوں اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ہر کام وہ ادھورا کرتی یا خراب کر دیتی۔ جس پر بانو بھابھی اسے بے نقط سناتی۔ ایک دن سلمٰی سے اس کی ملاقات ہوئی تو رانی نے اپنے دل کا بوجھ اس کے سامنے اتار پھینکا۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے چٹکی بجاتے حل بھی پیش کر دیا۔

"پگلی انتظار کس بات کا کر رہی ہے۔ کیا تجھے پیر شاہ کے تعویذوں پر یقین نہیں ہے؟ ایک بار تیری اولاد ہو گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا اکرم کس طرح بھاگا بھاگا آئے گا۔"

"مگر اکرم تو یہاں آتا ہی نہیں ہے۔ پھر......"

رانی کہتے کہتے جھجک گئی۔ سلمٰی ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کی عقل پر افسوس کرنے لگی۔

"بے وقوف۔ اس کی ماں تو یہاں ہے نا۔ ان سے ملنے تو آئے گا۔ بس تجھے موقع کا فائدہ اٹھانا ہے۔

پگلی۔ وہ زمانے اور تھے جب کسی کی خدمت سے پتھر دل بھی موم بن جاتے تھے۔ اب وہ وقت نہیں ہے۔ زندہ رہنا ہے تو اپنا حق لینا سیکھو اور جو نہ دے اس سے چھین لو۔ تو بانو بھابھی کی باتیں سنتی ہے، اس کے بالشت بھر کے بچوں سے بے عزتی کرواتی ہے۔ اماں کو سنبھالتی ہے مگر بدلے میں تجھے کیا ملا؟ بہو، بیوی یا کسی بھی رشتے کا مان؟ عزت؟ رتبہ؟

اونہہ! میں تو صاف کہتی ہوں اگر بندہ اپنے ساتھ ہی اچھا نہ ہو تو دوسروں کے ساتھ لاکھ اچھا بنے کوئی فائدہ نہیں۔"

سلمٰی نے اسے اپنے تجربات اور خیالات کی روشنی میں ایک لمبا لیکچر دیا تھا۔ رانی کو لگ رہا تھا جیسے اس کے سامنے سے کوئی پردہ ہٹ رہا ہے۔ سلمٰی کی بات اسے ٹھیک لگی۔ جس نے اسے زندگی کا ایک نیا رخ دکھایا تھا۔

یہ وہ روزن تھا جو اس کے اندر پکتے لاوے کو باہر نکلنے کا راستہ دکھا رہا تھا۔ اس دن رانی وہاں سے لوٹی تو اس میں ایک واضح تبدیلی آئی تھی۔

اب وہ پہلے کی طرح بانو کی چپ چاپ نہیں سنتی تھی۔ اکثر جواب دے دیتی یا ان کی باتوں کو ان سنا کر کے گزر جاتی۔ جس پر وہ تپ جاتی اور اول فول بکنے لگتی۔ رانی گھر کے کام بھی ادھورے کرنے لگی۔ کبھی سالن میں مرچ زیادہ کر دیتی یا کبھی نمک۔ جان بوجھ کر روٹیاں جلا دیتی۔ نندیں آتیں تو اس دن سر پر دوپٹہ باندھ کر بستر پر لیٹ جاتی اور ہائے ہائے کرنا شروع کر دیتی۔ کبھی جان بوجھ کر سیڑھیوں سے اس طریقے سے گرتی کہ اسے چوٹ نہ آئے۔

مگر شور ایسے کرتی کہ جیسے کوئی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہو۔ اس نے ان طریقوں سے یہ بات سمجھ لی کہ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ٹیڑھی کر لینی چاہیے۔

وہ جب تک اچھی بن کر رہی، خاموشی سے تکلیف اور درد برداشت کرتی رہی کسی نے اس کے ساتھ ہمدردی نہیں کی، اس کی فکر نہیں کی، مگر اب جب وہ اپنی جھوٹی تکلیف پر شور کرتی تو سب لوگ گھبرا کر اس کے آس پاس جمع ہو جاتے۔

رانی جان گئی تھی کہ اپنا حق کیسے وصول کرتے ہیں۔ پہلے وہ گھریلو سیاست کا شکار مظلوم لڑکی تھی، اب وہ گھریلو سیاست کی کھلاڑی بنتی جا رہی تھی۔ ادھر کی اُدھر لگانا، جھوٹ سچ بولنا، مطلب کے لیے کسی کو بھی گلے سے لگا لینا، ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینا۔ وہ ان کاموں میں اتنی تیزی سے طاق ہوئی کہ دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی کی سگی نہیں بنے

گی، سوائے اپنی ذات کے!
مگر وہ ایک بات بھول گئی کہ......
جو اس آزمائش سے گھبرا کر رحمان کا راستہ چھوڑ کر، شیطان کا راستہ اپنا لیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔
کیونکہ قائم رہنے والی ذات تو رحمان کی ہی ہے۔ باقی ہر چیز کو فنا کا حکم ہے۔
☆☆☆
لاؤنج میں لگی بڑی اسکرین پر وہ اپنا پسندیدہ ویڈیو گیم کھیلنے میں مگن تھا۔ رمشا اسکول سے آکر سو رہی تھی۔ عادل کو دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ بے چین سا سارے گھر میں چکر لگاتا رہتا۔ جس سے رانیہ کو بہت چڑ تھی اور وہ اکثر اس کا برملا اظہار بھی کرتی کہ......
''تم کیا بدروح کی طرح سارے گھر میں منڈلاتے رہتے ہو۔'' عادل سن کر ان سنی کر دیتا۔ جس پر رانیہ مزید تپ جاتی مگر عادل کو کب اس کی پروا تھی۔
وہ کافی دیر تک فریحہ پھپھو کا انتظار کرتا رہا اور پھر بور ہو کر گیم لگالی۔ فریحہ آج کل پاکستان آئی ہوئی تھی اور ابھی بازار گئی ہوئی تھی۔ عادل نے والیم تیز کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے سارا ٹی وی لاؤنج گونج رہا تھا۔ رجو کئی بار اسے آواز کم کرنے کا کہنے آئی کیونکہ رانیہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی اور اگر اس کے آرام میں خلل پڑتا تو......
اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔
مگر سامنے بھی عادل تھا جس نے ہر بار کی طرح اس بار بھی اس کی بات سن کر ان سنی کر دی۔ تھک ہار کر رجو واپس چلی گئی۔
عادل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہو گیا تھا۔
وہ کسی کی بات نہ سنتا اور نہ ہی مانتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد فریحہ شاپنگ کر کے واپس لوٹیں، تو عادل کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر خوش گواری سے مسکرانے لگیں۔ عادل گیم میں اتنا مگن تھا کہ اسے کسی کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔
فریحہ نے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ گیم میں ہونے والی لڑائی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کے غصے کو باہر نکال رہا ہو۔ فریحہ نے اسکرین کی طرف دیکھا اور پھر عادل کی طرف۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ عادل کے پاس رکھا ریموٹ اٹھا کر آواز کم کی تو وہ چونکا۔
''پھپھو! آپ آگئیں۔ میں کب سے انتظار کر رہا تھا۔''
عادل نے کہتے ہوئے دوبارہ اپنی نظریں اسکرین پر مرکوز کر دیں۔
''تمہیں اپنے جان سینا سے فرصت ملے تو کچھ نظر آئے ناں۔ کیا فضول گیمز کھیلتے ہو تم بچے بھی۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔ توبہ ہے بند کرو اسے۔'' فریحہ نے کہتے ہوئے ٹی وی بند کیا۔
''اوہو پھپھو! یہ کیا کیا آپ نے۔ میں میچ ہار گیا۔'' عادل نے منہ بنا کر ریموٹ سائیڈ پر رکھا۔
''عادل بیٹا۔ ان فضول گیمز کو چھوڑو اور مجھ سے وعدہ کرو کہ اپنی پڑھائی پر دھیان دو گے۔ تمہارا رزلٹ بہت خراب آیا ہے۔''
فریحہ آج ان کے اسکول سے ہو کر آئی تھیں۔ جہاں ٹیچرز اور پرنسپل کی زبانی ساری صورت حال جان کر بہت دھچکا لگا تھا۔
عادل دن بہ دن پڑھائی میں کمزور ہوتا جا رہا تھا اور وہ کلاس میں سب سے لڑائی جھگڑا کرنے میں آگے آگے رہتا تھا۔
دونوں بچوں کو نہیں پتا تھا کہ وہ ان کے اسکول گئی تھیں۔ عادل مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔
''پھپھو جیسا آپ کہیں گی، میں ویسا ہی کروں گا مگر آپ کو بھی ایک وعدہ کرنا پڑے گا۔''
عادل نے کہا تو فریحہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"کیسا وعدہ؟" فریحہ نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"فریحہ پھپھو! آپ وعدہ کریں کہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔" عادل نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ فریحہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ عادل کی کالی آنکھوں میں خوف اور بے چینی واضح تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر اس وقت امید کے کتنے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔

فریحہ اس کا معصوم سا چہرہ دیکھتی رہ گئیں اور بے اختیار ہو کر اسے خود سے لگا لیا۔

فریحہ کو آئے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ وہ سرپرائز وزٹ پر تین ہفتے کے لیے اکیلی پاکستان آئی تھی اور یہاں کے بدلے حالات دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ دونوں بچے چہروں سے پریشان حال اور کملائے ہوئے لگتے تھے۔ انھیں دیکھ کر تو فریحہ کا دل مٹھی میں آ گیا۔

اور رات کو تنہائی ملتے ہی جب انہوں عادل کی زبانی رانیہ اور بابا کے بدل جانے کے بے شمار قصے سنے تو وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"فیصل اتنا بھی بدل سکتا ہے۔ میں نہیں مانتی۔" فریحہ نے سوچا مگر وہ جانتی تھیں کہ بچوں کی باتیں بھی غلط نہیں ہیں۔ نہ ور کچھ نہ کچھ تو ایسا ہے جو اس ساری صورت حال کی وجہ بن رہا ہے۔

فی الوقت فریحہ نے اسے تسلی دے کر چپ تو کروا دیا مگر رانیہ کا سرد اور خشک رویہ ان کے سامنے تھا۔ کچھ دنوں میں ہی فریحہ کو اندازہ ہو گیا کہ......

وہ بہت ڈرامے باز قسم کی عورت ہے۔ اس کی چالاکیاں دیکھ دیکھ کر وہ بھی دنگ رہ گئیں۔

یہاں بہت کچھ ایسا ہو رہا تھا، جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ جیسے جیسے ان کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے، عادل بہت بے چین رہنے لگا اور بار بار اس سے وعدہ لینے کی کوشش کرتا۔ ابھی بھی اس نے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا تو فریحہ خود پر قابو نہیں رکھ سکیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور عادل کو نرمی سے الگ کیا۔ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر محبت سے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"دیکھو عادل بیٹا۔ میں یہاں زیادہ دن تک نہیں رک سکتی، وہاں آپ کے دونوں کزنز روز مجھے فون کرتے ہیں اور جلد واپس آنے کی تاکید کرتے ہیں۔ آپ خود بتاؤ کہ میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔" فریحہ نے نرمی سے کہا تو عادل سوچ میں پڑ گیا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں پھپھو۔ اگر آپ بھی امی کی طرح واپس نہیں جائیں گی تو آپ کے بچوں کی بھی سوتیلی ماں آ جائے گی اور سوتیلی ماں چاہے سنڈریلا کی ہو یا سنو وائٹ کی یا ہماری۔ کسی کی بھی اچھی نہیں ہوتی۔" عادل نے سمجھداری سے سر ہلاتے ہوئے کہا تو فریحہ اپنی جگہ ساکت رہ گئیں۔ انہیں لگا کہ جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے لیا۔

☆☆☆

ازل سے قدرت کا ایک اصول ہے کہ اچھائی اور برائی ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

منزل کا تعین کرنے میں ہم بہت سا وقت ضائع کر دیتے ہیں، یا جلدی میں غلط منزل چن لیتے ہیں۔ جیسے کوئی پھول چن لے اور کوئی کانٹے اپنے مقدر میں بوئے۔

ایسا ہی رانی کے ساتھ ہوا۔ اس نے دعا اور اللہ پر یقین رکھنے کے بجائے، اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ راستہ چنا، جو زمینی خدا ہونے کا دعویٰ کرنے والے پیر شاہ کے آستانے کی طرف جاتا تھا۔

جو اپنے سفلی عمل سے جانے کتنے گھروں میں نفاق کے بیج بو چکا تھا۔ پہلی بار کی ڈری سہمی رانی اگلی بار بہت اعتماد سے پیر شاہ کے پاس اپنے شوہر اور سسرال والوں کے لیے تعویذ لینے پہنچی تھی۔

رانی کو لگتا تھا کہ یہ اس کا وہ جائز حق ہے، جو اسے آج تک نہیں ملا۔ پیر شاہ ایسے کام مفت میں نہیں کرتا تھا۔ اس لیے رانی نے اس بار پیسوں کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ یہ وہ پیسے تھے جو وہ مختلف حیلے

بہانوں سے اماں سے لے لیتی یا اماں اور بانو بھابی کی نظر بچا کر ان کے بٹوے سے نکال لیتی۔ سلمٰی نے اسے سمجھایا تھا کہ اگر اپنا مقصد حاصل کرنا ہے تو پیسہ لگانا پڑے گا۔ نہیں تو ساری زندگی کسی معجزے کے انتظار میں سسرال والوں کی جوتیاں کھاتی رہے۔ رانی جس کے اندر بغاوت سر اٹھا چکی تھی۔ وہ اب سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔

رانی نے پیر کو مطلوبہ رقم ادا کر کے اپنی مٹھی میں بند تعویذ کو اپنے نصیب کے تالے کی کنجی سمجھ لیا اور جب گھر لوٹی تو بہت مطمئن تھی۔

پیر شاہ کی ہدایت کے مطابق رانی نے تعویذ پانی میں گھول کر گھر کے لوگوں کو پلا دیا تھا۔ ایک تعویذ اکرم کے لیے تھا۔ جس کے گھر آنے کا انتظار اسے شدت سے تھا۔

”بس ایک بار وہ گھر آ جائے۔ یہ تعویذ پیتے ہی، وہ غلام بن جائے گا۔“ رانی پیر شاہ کے دعوے کے مطابق خود کو تسلی دیتی اور خوش ہوتی رہتی۔

ایک دن اکرم اچانک صبح سویرے گھر چلا آیا۔ رانی بھینسوں کے باڑے سے واپس آئی تو اکرم کو صحن میں اماں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے دیکھ کر بے اختیار خوشی سے کھل اٹھی۔ وہ سلمٰی کی ہدایت کے مطابق جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ دیوار میں لگے درمیانے سائز کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ سویرے سے دھلا ہوا سادہ سا چہرہ، ملگجے کپڑے، بکھرے ہوئے بال۔ اس وقت کچھ اور تو ممکن نہیں تھا۔ اس لیے رانی نے جلدی سے اپنے بالوں میں کنگھی کی اور انھیں سلیقے سے باندھ کر، ہلکے رنگ کی لپ اسٹک لگا کر، کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے دور کرتی، باورچی خانے کی طرف دوڑی۔

اکرم کے لیے دودھ پتی بنا کر سلیقے سے کپ ٹرے میں رکھ کر باہر کی طرف لپکی اور پاس جا کر دھیرے سے سلام کیا۔ اکرم نے سرسری سی نظر ڈالی اور پھر چونک گیا۔

آج اس کا ہونق اور اجاڑ چہرہ کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ اکرم کی نظر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر کپ تھام کر فوراً اماں کی طرف متوجہ ہو گیا مگر یہ ایک لمحہ بھی رانی کو سرشار کر گیا۔ اس کا اعتماد خود پر بڑھ گیا۔ رانی نے جلدی جلدی سب کام سمیٹے۔ آج اس نے اکرم کی پسند کا کھانا بہت دل لگا کر تیار کیا۔ اس کے لیے خاص سوجی کا حلوہ، دیسی گھی میں بنایا۔ وہ آج اکرم کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کے لیے بہت خاص ہے۔

کھانا لگانے سے پہلے اور بعد میں بھی وہ اکرم کے آگے پیچھے چکر لگا رہی تھی۔ اکرم نے بہت حیرت سے اس کے چہرے کی خوشی اور قدموں کی بے تابی کو دیکھا۔ آج سے پہلے اس نے رانی کو صرف گھر کے کاموں میں معروف اور بے ترتیب حلیے میں پھرتے دیکھا تھا مگر اب کی بار رانی کے ظاہری حلیے میں واضح تبدیلی تھی۔

سادہ سے مگر صاف ستھرے لباس میں سلیقے سے کنگھی کیے بالوں اور یات بے بات ہنستی ہوئی رانی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ پہلے وہ جب بھی گھر آتا۔ رانی کو کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھتا۔ وہ ساس، جٹھانی، ان کے بچوں اور مہمانوں کی خدمت کرنے میں اپنے مجازی خدا سے بے پروا رہتی تھی۔

اکرم کو بہت برا لگتا تھا کہ رانی کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ آوارہ مزاج، جو نگر نگر کی خاک چھانتا رہتا تھا۔ جانتا تھا کہ ایک روٹی تو وہ کسی ڈھابے سے بھی کھا لے گا مگر ایک بیوی جس محبت اور خیال سے اپنے شوہر کو کھانا پیش کرتی ہے، اس کا خیال رکھتی ہے، وہ بات رانی میں نہیں تھی اور یہ چیز ہی اسے دوسری عورت کی طرف متوجہ کر گئی۔ جو اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھنے کا ہنر بخوبی جانتی تھی۔ اس نے وقت ضائع کرنے کے بجائے سمجھ دار عورتوں کی طرح اس مرد کی زندگی کے خلا کو بھانپ لیا تھا۔

آج رانی نے بھی وہ طریقہ استعمال کیا، چاہے دیر سے ہی سہی مگر اسے اپنے شوہر کا خیال رکھنا آ ہی

گیا۔

''اتنی بھی بری نہیں ہے رانی!''

اکرم نے ایک مرد کی نظر سے اسے دیکھا۔ وہ جو شام سے پہلے شہر لوٹ جانے کی نیت سے آیا تھا۔ تین دن کیسے گزر گئے، اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ تین دن میں رانی چکور کی طرح اس کے گرد چکر لگاتی رہی حتیٰ کہ بانو بھابھی بھی جل بھن کر رہ گئی اور کئی بار اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتی رہی۔

''تیری یہ حالت ——— تو شادی کے شروع کے دنوں میں بھی نہیں تھی۔ خیر تو ہے کہیں شوہر پر تعویز گنڈے تو نہیں کر رہی۔'' بانو بھابھی اپنی مکار نظروں سے اسے گھورتی تو رانی اس سے نظریں چراتے ہوئے منہ بنا کر رہ جاتی۔

مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ پیر شاہ کے تعویذ گھول کر اکرم کو پلا بھی چکی تھی۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی کہ پیر کے پہلے تعویذ نے ہی کام کر دکھایا ہے۔

اور یہ اسی تعویذ کی کرامت تھی کہ اس کے سب بگڑے کام اب سنورنے لگے تھے۔

رانی سے چڑنے والا اکرم، اب ہنس ہنس کر باتیں کرتا، رانی کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ رانی کو اماوس کی رات کا انتظار تھا۔ جب اس نے صحن میں بنی کیاری میں دوسرا تعویذ دبانا تھا۔ اسے یہ کام بہت جلد اور اکرم کے واپس جانے سے پہلے کرنا تھا۔ اسے مناسب موقع کا انتظار تھا اور وہ موقع اسے ایک رات مل ہی گیا۔

☆☆☆

گرمیوں کی طویل راتیں تھیں۔ بانو اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ چھت پر سوتی تھی جبکہ اماں صحن میں چارپائی بچھا کر سوتی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ رانی نے ایک نظر گہری نیند سوئے ہوئے اکرم پر ڈالی اور آہستہ سے بنا آہٹ کیے بستر سے نیچے اتر آئی۔ دبے قدموں سے چلتی کمرے میں بنی کھڑکی کے پاس آئی اور پردہ ہٹا کر کچھ ٹٹولنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی انگلیوں نے مطلوبہ چیز کے لمس کو محسوس کیا تو بے اختیار اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے جلدی سے مٹھی میں تعویذ قید کیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

وہ بلی کی طرح پاؤں رکھتی، دبے قدموں سے صحن کے کونے میں بنی کیاری کی طرف بڑھنے لگی۔

اماں کی چارپائی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے چوکنی نظروں سے دیکھا۔ وہ دوسری طرف کروٹ لیے سو رہی تھیں۔ رانی نے اطمینان کی سانس لی اور فوراً کیاری کے پاس اکڑوں بیٹھ کر پہلے سے رکھی کھرپی سے مٹی کھودنے لگی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ گڑھا گہرا ہے تو جلدی سے دوسرے ہاتھ کی مٹھی کھول کر تعویذ کو دیکھا اور مسکرا کر اسے گڑھے میں رکھنے لگی۔ ابھی اس نے تعویذ کو نرم مٹی میں رکھا ہی تھا جب اچانک سے کھٹکا ہوا اور ایک دم سے ہی سارا صحن پیلے بلب کی تیز روشنی میں نہا گیا۔ رانی ڈر گئی۔ اس کے ہاتھ سے کھرپی چھوٹ کر نیچے مٹی میں گر گئی۔

اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ بانو کمر پر ہاتھ رکھے اسے گھور رہی تھی۔ رانی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ تیز بلب کی روشنی سے اماں بھی جاگ گئی اور کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔

''کون ہے اس وقت؟'' رانی نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اسی وقت بانو آگے بڑھی۔

''آپ یہاں گہری نیند کے مزے لیتی رہیں اور یہ ڈائن آپ کی موت کا سامان کر رہی ہے۔'' رات کے اس پہر ہر سو پھیلی خاموشی میں بانو کی تیز آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔

''کیا بکے جا رہی ہے؟'' اماں نے گہری نیند سے اٹھنے کی وجہ سے چڑ کر پوچھا۔

''مجھ سے نہیں۔ اس سے پوچھیں کہ رات کے اس پہر آپ کی چارپائی کے پاس مٹی کیوں کھود رہی تھی؟ ضرور کوئی تعویذ کا چکر ہو گا اماں۔ چاہتی ہو گی کہ آپ جلد از جلد مریں اور اس کی جان چھوٹے

آپ کی چاکری کرنے سے۔" بانو نے رانی کی طرف قدم بڑھائے، جو خوف زدہ ہو کر پیچھے کی طرف ہٹی۔ اماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"رانی تو اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے؟"

اماں نے حیرت سے استفسار کیا۔ رانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بانو نے جھک کر گڑھے میں سے تعویذ نکال لیا اور فاتحانہ انداز میں اماں کی طرف بڑھیں۔

"یہ دیکھیں اماں۔ میں غلط نہیں کہہ رہی تھی۔"

اماں ایک دم ہی چونکیں۔ درگاہ شریف پر دعا کرنے کے لیے اماں نے ہی اسے بھیجا تھا مگر وہ تعویذ کب لے کر آئی تھی۔

اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ اور کہتا یا سنتا، ایک دم ہی غصے سے بپھرا اکرم آگے بڑھا، جو بانو کے شور سے جاگ کر سب سن اور دیکھ چکا تھا۔ رانی کو بالوں سے پکڑ کر اس نے زور سے زمین پر دھکا دیا اور پھر نہ اس کے ہاتھ رکے اور نہ پیر۔ اماں نے ایک دوبار اسے آواز بھی دی مگر وہ غصے میں جنونی ہو کر اسے بری طرح پیٹ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ گالیاں بھی دے رہا تھا۔

"چھوڑ دے اسے اکرم! بس کر دے۔ کیوں رات کے اس پہر تماشا لگا رہا ہے۔" اماں نے کھانستے ہوئے بامشکل کہا۔ اکرم نے ہانپتے ہوئے اماں کے زرد چہرے کی طرف دیکھا اور پھر نفرت بھری نگاہ سسکتی رانی پر ڈالی۔

"یہ عورت کبھی میرے دل تک نہیں پہنچی اماں! اپنی ہر خدمت اور فرماں برداری کے باوجود۔

میں اکثر سوچتا تھا کہ ایسا کیوں ہے اور آج مجھے اس کا جواب بھی مل ہی گیا۔ اس عورت کا ہر عمل صرف مجبوری اور اپنے حالات کی وجہ سے تھا۔ اس لیے تو یہ کبھی کسی کا دل نہیں جیت سکی مگر آپ بھی ٹھیک کہتی ہیں اماں! مجھے اسے چھوڑ ہی دینا چاہیے۔ میں اسے طلاق دیتا ہوں۔" اکرم نے ایک لمحہ لگایا اور چار سال سے بنا رشتہ۔ ایک جھٹکے میں ختم کر کے غصے سے پاؤں مارتا گھر سے نکل گیا۔ پیچھے ہکا بکا سی رانی اپنی مار اور تکلیف کو بھول کر اس کے کہے آخری لفظوں پر غور کرتی رہ گئی۔

"طلاق۔ مگر پیر شاہ نے تو کہا تھا کہ شوہر میرا غلام بن جائے گا پھر کیسے۔"

رانی نے حیرت سے خود سے سوال کیا۔ بانو اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر طنزیہ مسکراہٹ سجائے، شور کی آواز سن کر جاگے اپنے شوہر کو لے کر وہاں سے چلی گئی۔ اماں سر جھکائے خاموش بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ رانی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور لڑکھڑاتے قدموں سے بامشکل اٹھی اور چند قدم ہی چلی تھی کہ اماں نے اسے پکارا۔

"پو پھوٹنے کا انتظار کر لے رانی۔ پہلے ہی تیری جلد بازی نے تجھے عرش سے فرش پر لا پھینکا ہے۔ جو بھی تھا تو اپنے گھر میں آباد تو تھی ناں۔ مگر اب۔ کاش تو مجھے ایک بار اعتماد میں لے لیتی تو آج یہ نوبت نہیں آتی۔" اماں کے لہجے میں افسوس تھا۔ رانی نے پلٹ کر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی۔

"تم ظالم لوگوں سے تو خدا ہی نمٹے گا۔ تم سب کے سینوں میں پتھر کے دل ہیں۔ میری آہ اس گھر کے لوگوں کو کبھی سکون سے نہیں رہنے دے گی۔"

رانی روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ باقی کی رات رانی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے گزار دی۔ وہ اماں کی بات مان کر رک گئی تھی کیونکہ جو بھی تھا اماں کی بات درست تھی کہ اندھیرے میں گھر سے نکلنا اسے مہنگا پڑ سکتا تھا۔

اس کا ذہن مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ جب قریبی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوئی۔ رانی بے حس و حرکت بیٹھی، اذان سنتی رہی۔ جب روشنی پھیلنے لگی تو وہ مختصر سے سامان اور چھوٹے سے بٹوے میں چند روپے لے کر اپنے کمرے سے نکلی۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ رانی نے ایک اداس نظر سارے گھر پر

ڈالی۔ نکاح کے تین بولوں نے اسے اس گھر کا مکین بنا دیا تھا اور تین بولوں نے ہی اسے ایک لمحے میں پرایا کر دیا۔ وہ تھکے ہارے قدم اٹھاتی آگے بڑھی۔

رانی جانتی تھی کہ اس کے باپ کے گھر میں بیٹیوں کے لیے جگہ بہت کم تھی اور وہ تو اب طلاق یافتہ بیٹی تھی۔ اس کے باپ نے اسے کب قبول کرنا تھا۔ اس کے پاس اس گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ہی کرن تھی۔

اور وہ تھی اس کی اکلوتی اور واحد سہیلی سلمٰی۔

☆☆☆

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا اس بدذات کا۔" سلمٰی نے منہ ہی منہ میں غائبانہ طور پر اکرم کو چند گالیاں دیں۔

سلمٰی نے ساری بات سننے کے بعد اس جملے کے علاوہ کچھ نہیں کہا اور شوہر کو کام پر بھیج کر رانی کو ناشتہ کروایا۔ اس سے مزید دکھ کا اظہار کرنے کے بجائے، اسے لے کر بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑی اور اپنے پیسوں سے لاہور کا ٹکٹ لے کر دیا۔ اسے بس میں بٹھاتے ہوئے ایک پتا کاغذ میں لکھا ہوا اسے پکڑایا اور بولی۔

"نیلو باجی کے پاس چلی جاؤ۔ میں انھیں فون بھی کر دوں گی۔ اس وقت وہ ہی ہیں جو تمہاری مدد کر سکتی ہیں۔" رانی نے اچھی طرح سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور اپنا چہرہ نقاب میں چھپا لیا۔ سلمٰی کی ہدایت کے مطابق رانی نے سارے راستے نہ کسی سے بات کی اور نہ ہی کسی سے کوئی چیز لے کر کھائی۔

سلمٰی نے سختی سے سمجھایا کہ......

"دنیا کے سمندر میں تیرنا ہے تو اپنے زور بازو پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ ڈری، سہمی عورت ہر مرد کے لیے سب سے آسان اور تر نوالہ ہوتی ہے۔ آگے کی زندگی کیسے ہو گی؟ اس کا فیصلہ اب اسے خود کرنا تھا۔ سارے راستے بھاگتے دوڑتے منظروں کے ساتھ ساتھ، مختلف سوچوں میں گھری رانی نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

"زندگی سے سب کچھ چھین لینے کا۔ اپنے حق سے بھی زیادہ۔"

☆☆☆

"عادل اب اندر بھی آ جاؤ۔ کب سے کھیل رہے ہو تم۔ چلو اچھی سی ڈزنی مووی دیکھتے ہیں۔"

عادل بہت خراب موڈ کے ساتھ پورچ میں کھڑا فٹ بال کو زور زور سے زمین پر مار رہا تھا جیسے اپنے اندر کا سارا غصہ فٹ بال پر نکال دینا چاہتا ہو۔ رمشا اسے کئی بار بلانے آئی مگر عادل ٹس سے مس نہیں ہوا۔ فریحہ نے گہری سانس لے کر اس کے ناراض چہرے کو دیکھا۔

کل رات ہونے والی ساری گفتگو سننے کے بعد سے اس کا مزاج ایسا ہی جارحانہ ہو رہا تھا۔ فریحہ کو بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ عادل بہت ضدی ہے۔ گھر کے حالات کی وجہ سے اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے۔

اس وقت اندر سے ہنستے مسکراتے فیصل اور رانیہ نکلے۔ فیصل نے ایک سخت نگاہ عادل پر ڈالی جو لاپروا سا اپنے کھیل میں مگن تھا۔ فیصل رانیہ کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہا تھا۔ رانیہ کے پانچویں مہینے کے آخری کے دن چل رہے تھے۔ اس کے ظاہری حلیے میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ وہ نزاکت سے چلتی ہوئی، گاڑی تک آئی۔ جب فیصل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ رانیہ کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے تھوڑا سا دور گیا۔

رانیہ نے طنزیہ نگاہ تھوڑی دور کھڑے عادل پر ڈالی اور سر جھٹک کر گاڑی کے دروازے کی طرف بڑھی، جب اچانک عادل نے زور سے کک ماری اور فٹ بال زور سے آ کر رانیہ کے پیٹ پر لگی۔ رانیہ نے خوف سے چیخ ماری۔ فریحہ اور فیصل ایک دم تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ فیصل نے جلدی سے رانیہ کو سہارا دیا۔ تب تک فریحہ بھی اس کے پاس آ گئی۔

"رانیہ تم ٹھیک تو ہو نا۔" فیصل نے پریشانی سے پوچھا تو رانیہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار بہت

واضح تھے اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"فیصل اسے جلدی سے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"
فریحہ نے کسی ممکنہ خدشے کے تحت کہا۔ فیصل نے رانیہ کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور پھر غصے سے بڑے بڑے قدم اٹھاتا عادل کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ فریحہ اسے روکتی۔ فیصل نے کتنے ہی تھپڑ اس کے چہرے پر مارے کہ اس کے گالوں پر فیصل کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے۔
"فیصل۔ بس کرو۔ بچے کو اس طرح مارتے ہیں کیا؟" فریحہ تڑپ کر آگے بڑھیں اور عادل کو اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔
"تمہارا انتظام تو میں آ کر کروں گا! میں نے کہا تھا کہ وہ میری آخری وارننگ ہے۔ باز آجاؤ مگر تم۔"
فیصل غصے سے پھنکارتا ہوا گاڑی کی طرف پلٹا۔
فریحہ نے سرخ چہرہ اور آنکھوں میں نمی لیے کھڑے عادل کا ماتھا چوما۔ فیصل تیزی سے گاڑی نکال کر رہ گیا۔
"فریحہ پھپھو۔ میں نے جان بوجھ کر مما کو نہیں مارا۔ میں امی کی قسم کھاتا ہوں۔" عادل نے سسکتے ہوئے کہا تو فریحہ نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔
"ہاں بیٹا میں جانتی ہوں۔ پاپا کی بات کا برا مت ماننا۔ انھیں غصہ آ گیا تھا۔"
فریحہ نے نرمی سے اسے سمجھایا تو وہ ان کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے اندر کی طرف بھاگ گیا۔ اسی وقت ڈری سہمی سی رمشا فریحہ کے پاس آئی اور اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔
"پھپھو۔ پاپا نے بھائی کو کیوں مارا؟ کیا مما کی طرح پاپا بھی سوتیلے ہو گئے ہیں؟" رمشا نے حیرت سے سوال کیا۔ فریحہ نے دکھی دل کے ساتھ اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا۔
وہ کتنی مجبور اور بے بس ہیں۔ انہیں اس بات کا بہت شدت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ رمشا کو بہلا کر وہ اندر لے آئیں۔ عادل کمرے میں بند ہو گیا۔ فریحہ نے پریشانی سے وال کلاک کی طرف دیکھا اور پھر فیصل کو فون کیا مگر اس نے فون ریسیو نہیں کیا۔ فریحہ کی پریشانی بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد فیصل، نڈھال سی رانیہ کا ہاتھ تھامے گھر کے اندر داخل ہوا تو فریحہ فوراً ان کی طرف بڑھیں۔
"سب ٹھیک ہے ناں؟"
فریحہ کے پوچھنے پر فیصل نے اثبات میں سر ہلایا۔ رانیہ کو بیڈ پر لیٹا کر فیصل نے تھکی ہوئی سانس لی اور پاس رکھے صوفے پر گر گیا۔
"ڈاکٹر نے بہت احتیاط کرنے کا کہا ہے۔ سچی میری تو جان ہی نکل گئی۔ اگر رانیہ یا بچے کو کچھ ہو جاتا تو۔"
فیصل نے پریشانی نے کہا۔
"اللہ بہتر کرے گا۔ رانیہ تم ریسٹ کرو۔ میں تمہارے لیے کھانا بھیجتی ہوں۔" فریحہ نے نرمی سے کہا اور مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ رانیہ ٹھیک ہے۔ نہیں تو پتا نہیں کیا ہوتا۔ بڑی مشکلوں سے فریحہ نے دونوں بچوں کو کھانا کھلا کر سلا دیا۔ خود کافی کا مگ بنا کر لاؤنج میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں اور لیپ ٹاپ آن کر کے تیزی سے انگلیاں چلانے لگیں۔
اسکائپ پر اپنے بچوں اور شوہر سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ چونکیں تو تب جب اچانک فیصل اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر، اڑے رنگ کے ساتھ باہر کی طرف بھاگا۔ فریحہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھیں۔
"کیا ہوا فیصل؟"
"آپی وہ رانیہ کی طبیعت۔" فیصل نے ہاتھ سے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں رجو سہارا دے کر رانیہ کو کمرے سے باہر لا رہی تھی۔ رانیہ کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ فریحہ بھی تیزی سے

آگے بڑھیں۔ رانیہ کو بمشکل سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا۔

"میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔" فریحہ نے کہا تو فیصل نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ بچوں کے پاس گھر میں رہیں۔ رجو ہے ہمارے ساتھ۔"

فیصل نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے فوراً گیٹ کھولا اور فیصل زن سے گاڑی بھگا کر لے گیا۔ پورچ میں فریحہ دل میں خیر کی دعائیں مانگتی کھڑی رہ گئیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ اندر کی طرف بڑھیں۔ لاؤنج میں بے چین پھرتی، ادھر سے ادھر چکر لگاتی وہ مسلسل دعائیں مانگ رہی تھیں۔ کہ جب فیصل کا فون آگیا۔ فریحہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ ہیلو کہا۔

"آپی! بیٹا تھا۔" فیصل رو رہا تھا۔ فریحہ کے ہاتھ سے موبائل چھوٹتے رہ گیا۔

"او مائی گاڈ۔" فریحہ کو جھٹکا لگا۔ کافی دیر دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بات کرتے رہے۔

فریحہ نے اسے بہت تسلی دی۔ پھر فیصل نے فون بند کر دیا۔

"بے چاری رانیہ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کتنی خوش تھی وہ۔" فریحہ نے دکھی دل کے ساتھ سوچا۔

☆☆☆

نیلوفر عمر میں چالیس کے قریب، سانولا رنگ، مناسب قد کی مالک ایک چالاک اور مکار عورت تھی۔ اس کے تین بچے تھے۔ جو اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ شوہر اسے عقل سے پیدل ملا تھا، اس لیے نیلوفر کی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ نیلوفر کا شوہر کویت میں تھا۔ جو سال میں ایک بار پاکستان آتا تھا۔

سلمٰی کی ماں نیلوفر کی ماں کی دور کی رشتہ دار تھی۔ مگر سلمٰی اور نیلوفر کی دوستی بہت گہری تھی۔ وجہ تھی ایک دوسرے کا ہم مزاج ہونا اور ایک دوسرے کے بہت سے پوشیدہ رازوں کا امین ہونا۔ شادی کے بعد

اگرچہ دونوں کے تعلقات اور ملنے ملانے میں واضح کمی آئی تھی مگر دونوں کے درمیان دوستی اور محبت کا جو رشتہ کئی سال پہلے بنا تھا، وہ گزرتے وقت کے ساتھ بھی اپنی جگہ پر قائم تھا۔

رانی اس کے گھر جب پہنچی تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ سفر کی تھکان، بھوک، پیاس سے نڈھال رانی نے بیل بجائی تو دروازہ ایک تیز و چالاک لڑکی نے کھولا۔ گیٹ پر کھڑے کھڑے رانی کا جائزہ لینے اور مختلف سوالات کرنے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد آئی۔

"اندر آجائیں۔"

اس لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔ اس لڑکی کا حلیہ رانی سے بہت بہتر تھا۔ سلیقے سے سیٹ کیے ہوئے بال، صاف ستھرا لباس اور نخرے سے بولتی وہ رانی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اندر کی طرف چل پڑی۔ رانی آس پاس دیکھتی ہوئی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں اندازہ لگا رہی تھی کہ یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ سلمٰی کی باتوں کے مطابق نیلوفر درمیانی عمر کی تھی۔ پھر اس کی اتنی بڑی بیٹی نہیں ہو سکتی تھی۔

"ہو سکتا ہے اس کی کوئی رشتہ دار یا بیٹی ہو۔" رانی سوچتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئی۔

"تم یہاں رکو۔ نیلو باجی۔ ابھی آتی ہیں۔" وہ لڑکی اسے وہاں کھڑا کر کے چلی گئی۔

رانی نے گہری سانس لی اور آس پاس کا جائزہ لینے لگی۔

گھر مناسب ہی تھا مگر بے تحاشا خریدے گئے سامان کی وجہ سے بہت گھٹا گھٹا سا لگ رہا تھا۔ رانی کھڑے کھڑے تھک گئی۔ جب تیز خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ رانی نے سر اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا تو ایک عورت بہت غرور سے چلتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔ رانی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی سے اس کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر اس نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

رانی جھجکتے ہوئے صوفے کے کونے میں ٹک گئی۔اس وقت وہ لڑکی ٹرے میں جوس کے دو گلاس رکھ کر لے آئی۔ ایک اس نے نیلوفر کو پیش کیا اور دوسرا رانی کو۔

رانی کا پیاس کی شدت سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے غنیمت جانا اور جلدی سے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ٹھنڈا جوس پی کر اسے آسرا ہوا۔تب نیلوفر نے کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔

''سلمیٰ نے مجھے تمہارے بارے میں تھوڑا بہت تو بتایا ہے مگر میں ساری کہانی تم سے سننا چاہوں گی۔''

نیلوفر کے کہنے پر رانی نے گہری سانس لی اور آہستہ آواز میں اسے اپنی بارے میں سب بتانے لگی۔ساری بات سننے کے بعد نیلوفر تمسخرانہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولی۔

''تمہارا سب سے بڑا مسئلہ تمہاری بری قسمت نہیں۔تمہاری سوچ اور خود ساختہ مظلومیت ہے۔تم نے اگر پہلے دن سے اپنے سسرال والوں کو ان کی اوقات میں رکھا ہوتا تو آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا۔خیر جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔اب آؤ اصل بات کی طرف۔''

نیلوفر نے توقف کیا اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''دیکھو رانی۔ میں نے بے سہاروں کو سہارا دینے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے۔سلمیٰ کی بات کی لاج رکھتے ہوئے، میں تمہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ تو دے سکتی ہوں مگر مفت میں ہرگز نہیں۔آج کل مجھے مستقل ملازمہ کی ضرورت ہے۔

کیونکہ ریشم کی اگلے مہینے شادی ہے اور یہ چلی جائے گی۔ اگر تم راضی ہو تو ریشم جانے سے پہلے تمہیں سب کام سمجھا دے گی۔ میں تمہیں مناسب تنخواہ بھی دوں گی اور تمہاری سب بنیادی ضرورتیں بھی پوری کروں گی۔بولو منظور ہے۔''

رانی دل سے راضی نہیں تھی مگر فی الحال اس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو نیلوفر نے کچن میں کام کرتی ریشم کو آواز دی۔

''ریشم۔جب تک تم یہاں ہو، رانی کو سب کام سمجھا اور سکھا دینا۔ ابھی اسے اپنے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں لے جاؤ۔ یہ آج سے تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔'' رانی نے حیرت سے ریشم کی طرف دیکھا۔ جس نے منہ بنا کر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''یہ کام والی ہے؟ اپنے حلیے سے تو نہیں لگتی ہے۔'' رانی اس کے پیچھے چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''آجاؤ۔ یہ چھوٹا سا کمرہ ہے۔آج سے تمہارا ہوا۔ میں تو بس کچھ دنوں کی مہمان ہوں۔ شکر ہے یہاں سے نکلوں گی۔'' ریشم نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر خوشی سے گول گول گھومتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں خوش نہیں تھیں۔''

رانی نے حیرت سے سوال کیا۔ ریشم رک گئی اور پھر اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس کی عقل پر ماتم کر رہی ہو۔

''خوش؟ کیا قید میں کوئی بھی خوش رہتا ہے؟ خیر تمہیں ان باتوں کی سمجھ خود ہی آجائے گی۔ابھی اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔ یہ سنگل بیڈ میرا ہے۔ اس طرف والا سارا سامان اور چیزیں میری ہیں۔ان کی طرف دیکھنا بھی منع ہے اور استعمال کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ باہر صحن میں ایک چارپائی پڑی ہوئی ہے۔ وہ تم اس کونے میں ڈال لو۔ بستر تمہیں مل جائے گا۔باقی سب کچھ بھی! اور ایک بات۔

اپنے کام سے کام رکھنا۔میرے معمولات میں مداخلت مت کرنا۔آئی سمجھ میں۔''

ریشم اس سے عمر میں دو تین سال ہی چھوٹی تھی مگر رعب ایسے جما رہی تھی جیسے رانی کوئی ناسمجھ بچی ہو۔ رانی نے اسے کوئی بھی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سر ہلا کر رہ گئی۔

''ویسے اگر تم اسی طرح خاموش رہو گی تو ہماری اچھی دوستی بھی ہو سکتی ہے۔''

ریشم نے مسکراتے ہوئے کہا تو رانی گہری

سانس لے کر رہ گئی۔
وہ ریشم کو کیا کہتی کہ وہ ابھی جس حالت اور مقام پر کھڑی ہے وہاں پر سب کی بات سن کر خاموش رہنا اس کی مجبوری ہے، عادت نہیں۔

☆☆☆

"اٹھو جانو۔ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہوئی ہے۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔" فیصل نے اجاڑ حلیے میں لیٹی رانیہ کو محبت سے پکارا، رانیہ نے بے زاری سے نفی میں سر ہلا دیا۔
"میرا دل نہیں کر رہا۔" رانیہ نے اپنے بکھرے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹ کر جوڑا بنایا اور بستر سے اٹھ گئی۔
"رانیہ۔" فیصل نے اس کا ہاتھ پکڑا تو رانیہ رک گئی مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔
"کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟" فیصل نے پوچھا تو رانیہ نے پلٹ کر تیز نظروں سے اسے گھورا۔
"نہیں۔ آپ کا کیا قصور۔ ساری غلطی تو میری تھی۔ مجھے ہی سوچنا چاہیے تھا کہ یہاں میرے بچے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں پہلے سے ہی آپ کے بچے موجود ہیں۔" رانیہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا تو فیصل شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گیا۔
"رانیہ۔ میں سچ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں عادل کے ساتھ بہت بری طرح پیش آیا مگر فریحہ آپی درمیان میں آ گئیں۔ نہیں تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" فیصل نے افسردگی سے کہا۔ اسے یہ بھی دکھ تھا کہ زندگی میں پہلی بار اس نے عادل کو اتنی بری طرح مارا تھا۔
"آپ کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میری قسمت۔" رانیہ نے رخ پھیر کر کہا۔ فیصل نے اسے واپس بیڈ پر بٹھاتے ہوئے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"تمہارا اور میرا دکھ الگ نہیں ہے رانیہ۔ وہ میرا بھی بچہ تھا۔ تمہاری طرح مجھے بھی اس کی آمد کا بہت بے چینی سے انتظار تھا۔ مگر جو رب کی مرضی۔"

فیصل کے کہنے پر رانیہ تڑپ کر بولی۔
"عادل کی غلطی کو رب کی مرضی کا نام مت دیں۔ اس نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اس نے مجھے ماں کے طور پر قبول نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کرے گا۔ اس کا مطلب میں تو کبھی بھی۔" رانیہ نے کہتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔
"نہیں رانیہ۔ تم ایسا مت سوچو۔ میں نے اس مسئلے کا حل سوچ لیا ہے۔"
فیصل جو کافی دنوں سے ایک فیصلہ کرنا چاہ رہا تھا مگر ہر بار اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر رہ جاتا۔ ایک دم سے ہی اس فیصلے پر عمل درآمد کا ارادہ کر لیا۔
"وہ کیا؟" رانیہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ فیصل نے ایک نظر اس کے کمزور چہرے پر ڈالی اور دھیرے دھیرے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے لگا۔ فیصل کی بات سن کر رانیہ نے بظاہر کچھ ظاہر نہیں کیا اور بس اثبات میں سر ہلا کر اتنا کہا۔
"جیسے آپ کی مرضی۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" رانیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈریسنگ روم کی طرف چل گئی۔ فیصل نے سکون کی سانس لی۔
آج اتنے دنوں کے بعد دل سے تیار ہوتی رانیہ خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔
"یہ ہی تو میں چاہتی تھی فیصل۔ چاہے کسی طرح ہی سہی مگر آپ نے اس بارے میں سوچا تو سہی۔"
رانیہ نے اپنی چالاکی پر خود کو داد دی اور ڈریسنگ روم سے باہر نکل آئی۔
"اب لگ رہی ہو ناں میری رانیہ۔" فیصل نے اسے سراہتے ہوئے کہا تو رانیہ دھیرے سے مسکرا دی۔
فیصل اور رانیہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھر سے نکل گئے۔ یہ دیکھے بغیر کہ کوئی اور بھی پچھلے کئی دنوں سے بہت اداس اور پریشان پھر رہا تھا۔ عادل کا معصوم چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی

مجرم ٹھہرایا گیا۔ اسے اپنے باپ کی مار اور نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ باپ جو ان کی چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ جاتا تھا۔ اب اپنے بچے کی اذیت اور تکلیف سے لاپروا، صرف اپنی بیوی کو منانے اور خوش کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ عادل کے آنسو، اس کی پریشانی، اس کی تکلیف، جو سب کو نظر آرہی تھی مگر اس کے باپ کو نہیں۔

فریحہ اس بگڑتی صورت حال سے سخت پریشان تھیں۔ ان کے لیے فیصل کا اتنا سخت رویہ بہت تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔ فیصل باپ تھا۔ اسے رانیہ اور بچوں میں توازن رکھنا چاہیے تھا مگر اس کا جھکاؤ صرف اور صرف رانیہ کی طرف تھا۔ فریحہ جو بات سمجھ گئی تھیں وہ فیصل کو نہیں سمجھا پارہی تھیں۔ جن بچوں کو فیصل اتنی محبت اور توجہ سے پال رہا تھا، ان سے ایک دم سے ہی لاپروا ہونا ان کی شخصیت کو توڑنے کے مترادف تھا۔

فریحہ عادل اور رمشا کو بٹھا کر بھی بار بار سمجھا چکی تھیں مگر وہ دونوں بچے جب ان سے سوال کرتے کہ......

''پھپھو۔ پاپا پہلے تو ایسے نہیں تھے۔''

تو فریحہ لاجواب ہو کر چپ ہو جاتیں۔ بچوں کے لیے اس بات کو سمجھنا بہت مشکل تھا کہ ایک عورت کے آنے سے ان کا باپ اس حد تک بدل جائے گا۔

''عادل بیٹا۔ مما آئیں گی تو آپ ان سے سوری کہہ دینا۔ جو بھی ہے آپ کی وجہ سے انھیں تکلیف تو پہنچی ہے ناں۔'' فریحہ نے نرمی سے اسے سمجھایا تو عادل کچھ کہتے کہتے چپ کر گیا۔

''جی پھپھو۔'' عادل نے سر جھکا کر کہا تو فریحہ نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما۔ رات کو جب رانیہ اور فیصل واپس آئے تو لاؤنج میں بیٹھے عادل نے رانیہ کو سوری کہا تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ فیصل نے ایک سرد نگاہ عادل پر ڈالی اور اس کے پیچھے حیرت زدہ کھڑی فریحہ کی طرف دیکھا۔

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے آپی۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔'' فیصل نے کہا۔

''کیسا فیصلہ؟'' فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں عادل کو ہاسٹل میں داخل کروا رہا ہوں۔'' فیصل نے کہا تو فریحہ کے ساتھ ساتھ عادل بھی چونک گیا۔

''میں ہاسٹل نہیں جاؤں گا۔'' عادل نے غصے سے کہا۔

''دیکھتا ہوں تم کیسے ہاسٹل نہیں جاؤ گے۔'' فیصل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''فیصل میری بات سنو۔ میرے خیال سے تم جلد بازی میں غلط فیصلہ لے رہے ہو۔'' فریحہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

''نہیں آپی۔ مجھے یہ فیصلہ بہت پہلے ہی لے لینا چاہیے تھا۔ عادل نے رانیہ کو قبول نہیں کیا۔ اس وجہ سے نہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ دے پا رہا ہے اور نہ گھر میں سکون۔ اس کے اچھے مستقبل کے لیے مجھے یہ قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔'' فیصل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''عادل بیٹا! جاؤ اپنے کمرے میں۔''

فریحہ نے نرمی سے کہا تو عادل غصے سے پاؤں مارتا وہاں سے چلا گیا۔ فیصل تھک ہار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''فیصل میرے بھائی۔ تم جلد بازی میں ایک غلط فیصلہ لے رہے ہو۔ عادل ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اسے خود سے دور مت کرو۔'' فریحہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا۔ فیصل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''فریحہ آپی۔ آپ نہیں سمجھ رہیں۔ عادل سوتیلی ماں کے تصور سے باہر نہیں نکل رہا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا ہے اور آپی۔ آپ فکر کیوں کر رہی ہیں۔ میرا بیٹا ہے وہ۔ اپنی جان سے پیارا۔ میں اسے اسی شہر کے ہاسٹل میں کرواؤں گا۔ میری

نظروں کے سامنے ہی رہے گا وہ۔ ہر ویک اینڈ پر گھر لے کر آیا کروں گا۔ مگر یہ تھوڑا سا فاصلہ پیدا ہونا بہت ضروری ہے۔ تاکہ اسے بھی رشتوں کی اہمیت اور قدر ہو۔ یہ نہ ہو کہ اس کی دیکھا دیکھی کہیں رمشا بھی اس کے نقش قدم پر چلنا شروع کردے۔"

فیصل نے تفصیل سے بتایا تو فریحہ سوچ میں پڑ گئیں اور پھر کچھ دیر کے بعد بولی۔

"پھر بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا فیصل۔ بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ بچپن کی باتوں اور فیصلوں کو ساری زندگی نہیں بھولتے ہیں۔"

"آپی میں نے سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ بس دعا کریں کہ سب ٹھیک ہوجائے!" فیصل نے یقین سے کہا تو فریحہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

آنے والے وقت کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا مگر ماضی میں کیے اکثر فیصلوں کی دھمک، مستقبل میں بہت دور اور بہت دیر تک ضرور سنائی دیتی ہے۔

☆☆☆

رانی کو یہاں آئے ہوئے ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے مگر اب کی بار وہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں اور قابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے حالات کا تجزیہ کررہی تھی۔ اسے بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ نیلوفر نہایت تیز اور مطلبی عورت ہے۔ اگر رانی اس سے بنا کر رکھتی تو اسے بہت سے فائدے ہونے تھے مگر رانی ساری زندگی اس تھوڑے سے فائدے کے ساتھ نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ نیلوفر خوش تھی کہ اسے رانی کی صورت میں ایک سیدھی سادی اور کم گو لڑکی مل گئی ہے۔ وہ رانی سے زیادہ سے زیادہ کام لینے لگی۔ ریشم شہر کی پلی بڑھی اور بہت تیز لڑکی تھی۔ وہ اضافی کام کے پیسے مانگتی تھی۔ اکثر تو اپنے کام میں بھی ڈنڈی مار جاتی مگر رانی اپنی ذمہ داریوں سے بھی زیادہ کام کرتی تھی۔ ایک دن نیلوفر اپنی کسی سہیلی کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہوئی تھی۔ بچے کھیل میں مگن تھے۔ ریشم نے ٹھنڈے ٹینگ کا جگ بنایا اور رانی کو آواز دے کر چھوٹے سے لان میں بلالیا۔

"نیلوفر باجی کو پتا چلا تو بہت برا مانے گی۔" رانی نے ٹینگ کے جگ کی طرف اشارہ کیا۔

"چھوڑ اپنی باجی کو۔ کبھی تو بھی مزے کرلیا کر۔ آجا دیکھ موسم کتنا سہانا ہے۔ ہم کیوں کمروں میں بند رہیں! ہمارا بھی حق ہے زندگی پر۔ یہ لے ٹھنڈا ٹینگ پی اور دعا دے مجھے۔ کیسی عیاشی کروائی تجھے۔"

ریشم نے گلاس بھر کے رانی کی طرف بڑھایا۔ جسے رانی نے مسکراتے ہوئے تھام لیا۔ وہ دونوں ہری بھری گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے کتنا ہی وقت گزر گیا۔ رانی کو بھی یہ نئی تبدیلی اچھی لگ رہی تھی۔

"ویسے ایک بات تو بتا۔" ریشم نے آگے ہوکر رازداری سے پوچھا۔ رانی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو نے آگے کا کیا سوچا ہے؟ کیا ساری عمر اس عیار عورت کی غلامی ہی کرے گی یا۔" ریشم نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ رانی گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"ابھی تو میرے پاس اس چھت کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" رانی نے افسردگی سے کہا۔

"یعنی کہ تیرا بھی یہاں رکنے کا ارادہ نہیں ہے۔" ریشم نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو رانی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ریشم اس کی شکل دیکھ کر ہنس پڑی۔ رانی کا چہرہ ایسا بن گیا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"دیکھ رانی۔ عمر میں، میں بھلے تجھ سے چھوٹی ہوں مگر عقل میں تجھ سے کئی سال آگے۔ دنیا دیکھی ہوئی ہے میں نے۔ خیر ایک بات پلے سے باندھ لے کہ تو چاہے یہاں کتنی بھی جان مار لے، تب بھی تجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نیلوفر باجی کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ بہت کنجوس عورت ہے۔ اپنی مرضی

سے ہزاروں روپے اڑا دے گی مگر کسی کو فالتو میں ایک روپیہ بھی نہیں دیتی ہے۔

کھانا چاہے فریج میں پڑا پڑا سڑ جائے، ڈسٹ بن میں پھینک دے گی مگر کسی کو دے گی نہیں۔ اس لیے یہاں رہنا ہے تو اپنی آنکھیں اور عقل استعمال کر کے رہنا۔ بس تو مجھے دیکھتی جا۔ میں تجھے ہر چیز میں ماہر بنا دوں گی۔" ریشم نے فخریہ انداز میں کہا تو رانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر آنے والے دنوں میں ایسا ہی ہوا۔ کچھ ہی ہفتوں میں ریشم نے رانی کو ہر چیز میں طاق کر دیا۔ رانی فطرتاً ہوشیار تھی۔ اس میں سیکھنے سے زیادہ کاپی کرنے کی صلاحیت تھی۔ وہ ہر چیز کو بہت غور سے دیکھتی اور پھر اس کی ہو بہو کاپی کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ ایک کمزور شخصیت کی مالک تھی اس لیے اپنے آس پاس موجود سب لوگوں کے اثر کو فوراً قبول کر لیتی۔

ریشم کے ساتھ رہنے سے اسے بہت سے فائدے ہوئے۔ وہ آس پاس کے سب گھرانوں سے واقف ہو گئی۔ جہاں جہاں ریشم کی اچھی سلام دعا تھی، وہاں اب رانی بھی جانی پہچانی جاتی تھی۔ ریشم نے اسے آس پاس کی مارکیٹ اور بازار سے بھی متعارف کروا دیا تھا۔ رانی یہاں آ کر خوش تو نہیں مگر مطمئن ضرور تھی۔

ایک دن نیلوفر کی بڑی بیٹی سات سالہ زینب نے اسکول کا کام کرنا تھا مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ اکیڈمی نہیں جا سکی۔ اب وہ ماں کے پیچھے پیچھے کاپی لے کر پھر رہی تھی کہ اسے کام کروا دیں، نہیں تو کل اسکول میں مس سے ڈانٹ پڑے گی۔ نیلوفر کی تعلیم اتنی نہیں تھی۔ اس لیے وہ مسلسل اپنی بیٹی کو ٹال رہی تھی۔ جب کام سے فارغ ہو کر رانی نے اسے پاس بٹھا کر ہوم ورک کروایا تو نیلوفر کے ساتھ ساتھ ریشم بھی چونک گئی۔

"تم پڑھی لکھی ہو رانی۔" نیلوفر نے حیرت سے سوال کیا۔

"جی میں نے میٹرک کیا تھا۔ جب ابا نے میری شادی کر دی تھی۔" رانی نے فخریہ لہجے میں بتایا تو نیلوفر حسد کا شکار ہو گئی۔

"اونہہ۔ گاؤں کی تعلیم کیا ہونی ہے۔ میں نے بھی ایف۔اے کیا تھا جب میری شادی ہوئی۔ پہلے اپنے بچوں کو میں ہی پڑھاتی تھی۔ وہ تو اب وقت ہی نہیں ملتا۔ اس لیے اکیڈمی بھیج دیتی ہوں۔"

نیلوفر نے حاسدانہ انداز میں کہا اور پھر کچھ سوچ کر سر ہلانے لگی۔

"ایسا کرو رانی۔ کل سے تم ہی اس کو گھر میں پڑھا دیا کرنا۔ میں تمہیں اس کے بدلے چھ سو زیادہ دے دیا کروں گی۔ اچھا ہے ناں بچے آرام سے گھر میں ہی پڑھ لیا کریں گے اور تمہاری بھی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔" نیلوفر نے ایسے کہا، جیسے اس پر احسان کر رہی ہو اور رانی کی بات سنے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ رات کو وہ دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو ریشم بولی۔

"تم بہت بڑی بے وقوف ہو۔ اگر تم پڑھی لکھی تھیں تو جاہل عورتوں والے کام کیوں کر رہی تھیں۔ تم کوئی اور کام بھی تو کر سکتی ہو۔ اب نیلوفر باجی کی چالاکی دیکھی۔ تمہیں چھ سو میں ٹرخا دیں گی اور اکیڈمی کی ہزاروں روپے کی فیس بچا کر، تمہارے سر احسان بھی چڑھا لیا۔ حد ہے یار۔"

"میٹرک پاس کو کس نے کیا کام دینا تھا؟ اور ویسے بھی میں جس طرح کے حالات میں آئی تھی، اس وقت تو جو بھی کام ملتا، غنیمت ہی تھا۔"

رانی نے اپنی کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ریشم بھی لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ گرمیاں اپنے اختتام پر تھیں۔ اس لیے پنکھے کی ہوا میں بھی ایک سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔

"ویسے اگر تم اپنی تعلیم جاری رکھ سکو تو بہت اچھا ہو جائے گا۔ میں ایک باجی کو جانتی ہوں۔ وہ ہی جن کے گھر میں تمہیں لے کر گئی تھی۔ راضیہ باجی۔"

ریشم نے اس کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کچھ یاد دلایا۔

"وہ جو پارلر چلاتی ہیں۔" رانی نے کہا تو ریشم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ان کے بچے نہیں ہیں۔ بے چاری اپنا وقت کاٹنے کے لیے گھر میں ہی پارلر چلاتی ہیں اور ساتھ ہی محلے کی لڑکیوں کو پڑھا بھی دیتی ہیں۔ کل ہم چلیں گے۔ ان سے بات کرنے۔"

ریشم نے امید کی ایک نئی کرن اس کے ہاتھوں میں تھمائی تھی۔ پھر ریشم تو سو گئی مگر رانی رات دیر تک یہ ہی سوچتی رہی کہ اسے اگر اس مشکل وقت سے نکلنا ہے تو محنت کرنی ہی پڑے گی۔ نہیں تو وہ ساری زندگی نیلوفر کی غلامی کرتی رہ جائے گی۔

رانی کے دل کو یہ بات بہت چبھتی تھی کہ نیلوفر نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہے اور اسے پناہ دینے کے بہانے اپنا غلام بنالیا۔

"مجھے اب کسی کی غلامی نہیں کرنی ہے۔" رانی نے خود سے ایک عہد کیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

"پاپا۔ پلیز بھائی کو مت لے کر جائیں۔ میں بھائی کے بغیر کیسے رہوں گی۔" رمشا تیزی سے بھاگ کر باہر پورچ میں آئی تھی۔ اس کا معصوم چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے ٹیڈی بیئر کو تھامے اور ایک ہاتھ سے عادل کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ فریحہ نے لاؤنج کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس منظر کو دیکھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے کوئی ان کے وجود کو کئی حصوں میں تقسیم کر رہا ہو۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دونوں بچوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں مگر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

"رمشا۔ بھائی آپ سے ملنے آتا رہے گا۔ ابھی آپ اندر جاؤ۔" فیصل نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو رمشا نے نفی میں سر ہلایا۔

جبکہ عادل سپاٹ چہرہ لیے ہر چیز سے لاتعلق کھڑا تھا۔

"بھائی مت جاؤ۔" رمشا نے اس کا باوز پکڑ کر کھینچا تو عادل کا سکتہ ٹوٹا اور وہ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نرمی سے اس کے گال پر پھیلے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"رمشا گڑیا۔ آپ رو مت۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس ہی رہوں گا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ میں آجاؤں گا۔ آپ کسی سے ڈرنا مت۔" عادل نے اسے سمجھایا۔ رمشا نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"بھائی مجھے آپ کے بغیر بہت ڈر لگے گا۔ میں اکیلی کیا کروں گی۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں پلیز بھائی۔" رمشا نے بے چارگی سے کہا تو عادل اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر باپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"آپ جو بھی کہیں گے میں کروں گا۔ مگر مجھے میری بہن سے دور مت کریں۔"

عادل کا لہجہ پست ضرور تھا مگر انداز نہیں! فیصل نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی اور پھر کچھ فاصلے پر کھڑی رانیہ پر۔ جس نے آگے بڑھ کر روتی ہوئے رمشا کو خود سے لگالیا۔ فیصل کو تسلی ہوئی اور وہ بولا۔

"فیصلہ ہو چکا ہے۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

عادل نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ رانیہ کو دیکھ کر اس کا چہرہ تن گیا اور وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

"چھوڑو میری بہن کو۔"

عادل نے رمشا کا باوز پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ رانیہ طنزیہ مسکراہٹ سے فیصل کی طرف دیکھتی، پیچھے ہٹ گئی۔ فیصل لب بھینچے آگے بڑھا۔

"تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔" فیصل نے کہتے ہوئے عادل کا بازو کھینچا۔

"نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی بہن کو اس عورت کے پاس نہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔ یہ مار دے گی میری بہن کو۔"

عادل پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ فیصل اسے گھسیٹتے ہوئے گاڑی تک لایا۔ اتنی دیر میں فریحہ بھی ان تک پہنچ گئیں۔ فیصل نے ایک جھٹکے سے رمشا اور

عادل کا ہاتھ چھڑوایا اور کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکا دیا اور زور سے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔

''آپی! آپ رمشا کو سنبھالیں۔ میں اسے ہاسٹل چھوڑ کر آتا ہوں۔''

فیصل نے فرنٹ سیٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''فیصل پلیز ایک بار ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔''

فریحہ نے روتی بلکتی رمشا کو خود سے لگاتے ہوئے التجا کی مگر فیصل کچھ بھی کہے بغیر گاڑی میں بیٹھا اور تیزی سے گھما کر گاڑی کھلے گیٹ سے باہر نکالنے لگا۔

گاڑی کے بیک شیشے سے چپکے عادل نے روتے ہوئے رمشا کو ہاتھ ہلایا۔ فیصل چلا گیا اور پیچھے پورچ میں فریحہ اور رمشا ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ رانیہ نے گہری سانس لی اور انہیں روتا ہوا چھوڑ کر اندر کی طرف چلی گئی۔

''رجو۔ میرے لیے فریش اورنج جوس لاؤ۔''

''جی اچھا۔'' رجو نے تیزی سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کیں اور پلٹ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

ریشم جب یہاں سے گئی۔ رانی سب کچھ سیکھ چکی تھی۔ اب وہ بھی شہر کی چال بازیوں میں طاق تھی۔ ریشم کی شادی میں رانی نے بھی شرکت کی اور اسے بہت اچھا سوٹ تحفے میں دیا۔ ریشم اس کے آنے سے بہت خوش ہوئی۔

دن اپنی مخصوص رفتار میں گزر رہے تھے۔ رانی نے دوپہر کا وقت اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب گھر کے سب افراد آرام کر رہے ہوتے۔ رانی اس وقت راضیہ باجی کے گھر چلی جاتی جو گلی کی نکڑ پر تھا۔ وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ، پارلر کا کام بھی سیکھ رہی تھی۔ راضیہ بھی تنہائی کی ماری ہوئی عورت تھی۔ رانی کی صورت میں اسے بھی ایک ہمدرد مل گیا۔ شام کے وقت وہاں محلے کی اور بھی لڑکیاں کام سیکھنے آجاتیں مگر تب تک رانی واپس گھر چلی جاتی۔ اس لیے اس کی کسی اور سے زیادہ دوستی نہیں ہو سکی۔

نیلوفر کو رانی کی تھوڑی دیر کی آزادی بھی بری لگتی تھی۔ وہ اکثر رانی کو کسی نہ کسی بہانے روکنے کی کوشش کرتی۔ کبھی اسے فون کر کے واپس بلا لیتی۔ پہلے پہل تو رانی مروّت میں مان جاتی مگر پھر اس نے بھی جھوٹ کا سہارا لے کر کوئی نہ کوئی بہانہ کرنا سیکھ لیا۔ کچھ مہینے پہلے اس نے سستا سا موبائل لیا تھا۔ نیلوفر کا نمبر دیکھ کر وہ فون ہی نہیں اٹھاتی۔ نیلوفر اس کی حرکت پر تلملاتی مگر وہ رانی پر زیادہ سختی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ اتنے سستے میں اسے کوئی اور اچھی اور ایمان دار کام والی کا ملنا مشکل تھا۔ رانی رات کو سونے سے پہلے پڑھتی رہتی۔ وہ اپنی زندگی میں پوری طرح مگن تھی جب اس کی پرسکون زندگی میں اچانک ہلچل مچی۔

نیلوفر کو اطلاع ملی کہ اس کا شوہر اسد تین ماہ کی لمبی چھٹی پر گھر آرہا ہے۔ یہ سنتے ہی نیلوفر نے تیاریاں شروع کر دیں۔ روز وہ شاپنگ پر نکل جاتی۔ نئے نئے کپڑوں کے ڈھیر لگاتی۔ کبھی نئے پردے خرید کر لا رہی ہوتی کبھی کوئی اور سجاوٹ کی چیز۔ رانی کو جان بوجھ کر وہ مختلف کاموں میں الجھائے رکھتی تاکہ وہ یکسوئی سے نہ پڑھ سکے اور نہ ہی راضیہ کے پاس جا سکے۔

رانی اکثر جھنجلا جاتی مگر اپنی مجبوری کا سوچ کر چپ رہتی۔ اللہ اللہ کر کے اسد کی آمد کا دن آیا۔ اسد کی عمر پینتالیس سال تھی۔ چھوٹا قد اور معمولی شکل و صورت کا مالک شخص! جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر چیز کا بہت تفصیلی جائزہ لیتی تھیں یا شاید صرف رانی کا ہی۔

پہلے رانی کو یہ اپنا وہم لگا کہ وہ جہاں بھی جاتی تھی دو آنکھیں اس کے تعاقب میں رہتیں مگر بہت

جلد ہی وہ جان گئی کہ اسد اسے کن اکھیوں سے دیکھتا رہتا ہے اور اکثر تنہائی میں موقع ملتے ہی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتا۔ رانی نے تو سنا تھا کہ اسد کاٹھ کا الو ہے مگر وہ تو بہت تیز اور چالاک مرد تھا۔ نیلوفر کی تعریفیں کر کر کے اسے آسمان پر چڑھائے رکھتا اور ساتھ ساتھ رانی پر بھی پوری نظر رکھتا۔ رانی کو آنے والا وقت بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔

وہ رات کو بار بار اٹھ کر کنڈی چیک کرتی۔ کئی بار اسے یوں لگا جیسے کمرے کے باہر کوئی موجود ہے۔ وہ خوف سے اپنے بستر میں دبک جاتی اور اللہ سے مدد مانگتی۔ یہ اعصاب شکن صورت حال اسے کمزور کر رہی تھی۔ نہ اس کا کام سیکھنے میں دل لگ رہا تھا اور نہ ہی پڑھنے میں۔ پڑھنے میں وہ پہلے ہی بہت واجبی سی تھی۔ ابھی بھی اسے لگتا تھا کہ وہ بامشکل ہی پاس ہو سکے گی۔ مگر پھر بھی وہ کوشش کرنا چاہتی تھی۔ شاید یہ کوشش اس کی زندگی کا رخ بدل دیتی۔

☆☆☆

''آ گئے آپ۔'' مہکتی ہوئی رانیہ نے بہت ادا سے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ فیصل کے سامنے میز پر رکھا۔ فیصل جو لاؤنج کے صوفے پر بے دم سا آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ رانیہ کے پکارنے پر فوراً متوجہ ہوا اور چائے کا کپ دیکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہاں فریحہ آپی کی فلائٹ لیٹ تھی۔ اس لیے ائیر پورٹ پر انتظار کرنا پڑا۔''

فیصل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ خود بھی اپنی حالت کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ایک بلاوجہ کی اداسی اسے گھیر رہی تھی۔

''آپ اداس ہیں۔'' رانیہ نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔ فیصل نے کپ لبوں سے لگا لیا۔

''دراصل ایک دم سے سارا گھر خالی ہو گیا ہے ناں۔ پہلے عادل ہاسٹل گیا اور اب فریحہ آپی۔ مگر آپ فکر مت کریں۔ کچھ دنوں میں سب معمول پر آ جائے گا۔'' رانیہ نے اسے تسلی دی۔ فیصل اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''امید تو ہے۔'' فیصل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کہاں چلے۔'' رانیہ نے فوراً پوچھا۔

''ایک نظر رمشا کو دیکھ لوں۔ اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ کہیں ڈر ہی نہ جائے۔'' فیصل نے فکر مندی سے کہا اور رانیہ کا جواب سنے بغیر تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ رانیہ نے ناگواری سے منہ بنایا اور پھر اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''سب سے بڑا کانٹا تو وہ عادل تھا۔ جو بہت آسانی سے نکل گیا۔ اس ننھی کلی کو بھی دیکھ لوں گی۔''

رانیہ نے سوچا اور ریموٹ اٹھا کر بٹن دبایا۔ اسکرین روشن ہوتے ہی وہ مگن سی ہو کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ جب رمشا کو گود میں اٹھائے، تیزی سے فیصل نیچے اترا۔

''رانیہ۔ حد ہے لاپروائی کی۔ رمشا اپنے کمرے میں بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور تمہیں کوئی خبر ہی نہیں!''

فیصل نے تلخ لہجے میں کہا اور رانیہ کی بات سنے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔

''فیصل رکیں میری بات تو سنیں۔'' رانیہ اسے پکارتی رہ گئی مگر فیصل تب تک جا چکا تھا۔

''افوہ! کیا مصیبت ہے۔ زندگی میں تھوڑا سا سکون آتا ہے کہ پھر کوئی نہ کوئی مسئلہ سر اٹھانے لگتا ہے۔'' رانیہ بے چینی سے لاؤنج کے چکر کاٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ فیصل کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ رانیہ اس کی گاڑی کی آواز سن کر تیزی سے باہر نکلی۔

''کیسی ہے رمشا۔ توبہ میری تو جان ہی نکل گئی۔'' رانیہ نے آگے بڑھ کر فیصل کی گود میں سوئی رمشا کو پیار کیا۔

''ہوں۔ اب بہتر ہے۔ آپی کے جانے کا بہت صدمہ ہوا ہے اسے۔ تیز بخار کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔''

فیصل کہتے ہوئے آگے بڑھا اور رمشا کو اوپر

لے جانے کے بجائے اپنے کمرے میں لے گیا۔
رانیہ بل کھا کر رہ گئی مگر ابھی کچھ اور کہہ کر وہ اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔
''فیصل میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ بس میں بھی اپنے ساتھ ہوئے حادثے میں اس طرح گم ہوگئی ہوں کہ اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں رہی مگر میرا وعدہ رہا۔ اگلی بار آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔''
رانیہ کے کہنے پر فیصل کا کچھ دیر پہلے کا غصہ ایک دم سے غائب ہوگیا اور وہ نرمی سے بولا۔
''ہاں میں سمجھ سکتا ہوں۔''
''ایسا کریں کہ آپ سو جائیں۔ آپ نے صبح آفس جانا ہے۔ میں رمشا کو دیکھ لوں گی۔'' رانیہ نے ہمدردی سے کہا تو فیصل کا دل اطمینان سے بھر گیا۔
''تم میری فکر مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم جا کر دوسرے کمرے میں سو جاؤ۔ میں رمشا کے پاس ہی رہوں گا۔ اسے ابھی میری ضرورت ہے۔ آئی ہوپ یو انڈر اسٹینڈ۔'' فیصل کے کہنے پر رانیہ پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجائے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

رانی اپنے خیالوں میں گم گھر میں داخل ہوئی۔ جب اس کا سامنا اسد سے ہوگیا۔ وہ جو کسی کام سے گھر سے باہر جا رہا تھا۔ رانی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی جبکہ رانی اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔
''سلام اسد بھائی۔'' رانی نے جھٹ سے کہا اور اس کے پاس سے گزرنے لگی۔ جب اسد نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روکا۔ رانی نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جس پر عجیب سی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔
''بھائی کہہ کر دل توڑ دیتی ہو تم۔'' اسد نے چھچھورے پن سے کہا۔
''جی؟'' رانی حیرت سے اتنا ہی کہہ سکی۔
''اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ تم ہامی تو بھرو۔ میں تمہیں سچ میں اس گھر کی رانی بنا دوں گا۔''
''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں۔'' نیلوفر کی تیز آواز پر اسد بوکھلا کر پلٹا۔ رانی کے چہرے کا بھی رنگ اڑ گیا۔
''کچھ نہیں۔ میں تو باہر جا رہا تھا۔ رانی ابھی واپس آئی ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔'' اسد نے بے ترتیب جملے بولے اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔
نیلوفر کمر پر ہاتھ رکھے رانی کو گھور رہی تھی۔ رانی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس سے گزر گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر نیلوفر وہاں کھڑی کسی سوچ میں گم رہی۔
اس کے اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسد حسن پرست ہے۔ یہ تو نیلوفر جانتی تھی اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ رانی اچھی شکل و صورت کی مالک تھی۔ اب تو اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی آگیا تھا۔ نیلوفر جانتی تھی کہ رانی مجبوری کی وجہ سے اس کے سب کام کرنے پر مجبور ہے۔ اور وہ کہیں سے بھی کام والی نہیں لگتی تھی۔
''جب تک اسد واپس چلا نہیں جاتا مجھے رانی پر کڑی نظر رکھنی ہوگی۔'' نیلوفر نے سوچا اور مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔

☆☆☆

''پاپا مجھے بھائی سے ملنا ہے۔ بھائی کب آئے گا!''
رمشا نے روز کی طرح اپنا مطالبہ دہرایا تو فیصل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ کچھ دیر پہلے آفس سے لوٹا تھا اور ابھی فریش ہو کر لاؤنج میں بیٹھا ہی تھا جب رمشا اپنے ٹیڈی بیئر کو سینے سے لگائے وہاں چلی آئی۔ فیصل نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں امید اور ناامیدی کے کئی رنگ ایک دوسرے میں مل کر عجیب سا تاثر پیدا کر رہے تھے۔
''بہت جلد۔'' فیصل کے پاس اس سے زیادہ

کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔
"یہ بہت جلد کب آئے گا؟" رمشا نے بے چینی سے سوال کیا۔
"جب آپ اچھے بچوں کی طرح اپنے پاپا کی بات مانو گی اور انہیں تنگ نہیں کروں گی۔"
رانیہ نے پاس آتے ہوئے نرمی سے کہا تو رمشا اسے دیکھ کر ڈر کر پیچھے ہٹی۔ جب سے عادل گیا تھا۔ وہ رانیہ کو دیکھ کر اسی طرح ڈر جاتی تھی۔
"میں کسی کو تنگ نہیں کرتی۔ کسی کو بھی۔" رمشا خوف زدہ سے انداز میں کہتی ہوئی الٹے قدموں سے پیچھے ہٹتی گئی اور پھر وہاں سے بھاگ گئی۔
"رمشا۔" فیصل کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، رانیہ نے اسے باتوں میں لگا لیا۔
"آپ کی عادل سے بات نہیں ہوئی؟" رانیہ نے بظاہر ہمدردی سے پوچھا۔
"میں نے بہت بار اسے کال کی مگر اس نے ہر بار بات کرنے سے انکار کر دیا۔ ابھی تک غصے میں ہے۔ اس لیے ضد میں آکر ویک اینڈ پر بھی گھر نہیں آرہا۔ میری بات ہوئی ہے ہاسٹل کے وارڈن سے۔ اس نے بہت تسلی دی ہے کہ ابھی نیا نیا آیا ہے۔ اس لیے ایسا کر رہا ہے۔ کچھ دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ تب آپ بچے کو گھر لے جانا۔"
فیصل نے اصل پریشانی سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تو رانیہ سر ہلانے لگی۔
"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں وہ۔ آخر اتنا بڑا اور مشہور اسکول ہے۔ وہ اپنے طالب علموں کا بہت خیال رکھتے ہوں گے۔ آپ نے پہلے ہی اتنی مشکل سے کئی لوگوں سے سفارش کروا کر اس کا داخلہ کروایا ہے۔"
رانیہ نے تسلی دی تو فیصل کہنے لگا۔
"دراصل یہ ہاسٹل تو دور سے یا دوسرے شہر سے آنے والوں کے لیے ہوتے ہیں۔ پرنسپل کو یہ ہی اعتراض تھا کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اتنے چھوٹے سے بچے کو ہاسٹل میں کروانے کی کیا ضرورت ہے؟ بڑی مشکل سے عادل کو ہاسٹل میں جگہ ملی ہے مگر سچ پوچھو تو میرا دل اب بھی نہیں مان رہا کہ...... خود ہی تو سوچو۔ اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ نو سال کا ہو گا ہو وہ۔"
فیصل نے اپنے اندر کا پچھتاوا بیان کیا تو رانیہ کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔ جھکے ہوئے سر کی وجہ سے فیصل دیکھ نہیں سکا۔
"اگر آپ اس طرح سوچیں گے تو بہت جلد کمزور پڑ جائیں گے۔ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے والدین کو قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ عادل گھر میں رہتے ہوئے ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار ہو جائے۔ اس کی شخصیت میں کوئی کمی رہ جائے؟ نہیں ناں ---۔ تو بس اپنے دل کو مضبوط کریں آپ اور ویسے بھی عادل کون سا ہم سے دور ہے۔ جب دل کرے گا اس سے مل آیا کریں گے بلکہ میں اسے روز کھانا بنا کر بھی بھیج دیا کروں گی اور......"
رانیہ کے کہنے پر فیصل کے ذہن پر دھرا بوجھ کم ہوا، تو وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔
"تم کتنی اچھی ہو رانیہ ---۔ کتنی فکر کرتی ہو بچوں کی۔ ہاسٹل میں ہر چیز کا بہت اچھا انتظام ہے۔ کسی چیز کی پریشانی نہیں۔ بس عادل کو دیکھنے کے لیے دل بے چین ہو رہا ہے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے اسے دیکھے ہوئے۔"
فیصل کے لہجے میں ایک باپ کی محبت اور تڑپ جھلک رہی تھی۔ جو رانیہ کے خون میں حسد کی لہر بن کر دوڑنے لگی۔ پتا نہیں کیوں وہ بلاوجہ ہی دونوں بچوں سے خار کھانے لگی یا شاید وہ اپنی محرومی کا بدلہ اس طرح لے رہی تھی۔
"ایک حل ہے میرے پاس۔" رانیہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔
"اچھا وہ کیا؟" فیصل نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔
"عادل ہم سے ناراض ہے ناں۔ اس لیے

ملنے نہیں آ رہا۔ وہ نہیں آ سکتا تو کیا ہوا۔ ہم سب اس سے ملنے چلتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رمشا کو دیکھ کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے؟"

رانیہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ پوچھا تو فیصل نے داد بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت زبردست۔"

"پھر میں تیاری کروں۔" رانیہ نے کہا۔

"کیسی تیاری؟" فیصل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں عادل کی پسند کی سب چیزیں بنا کر لے جاؤں گی۔ ہم سب سارا دن اس کے ساتھ گزاریں گے اور کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں گے۔" رانیہ نے کہا تو فیصل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"رانیہ تم کتنی اچھی اور فراخ دل کی مالک ہو۔ تم نے عادل کی سب غلطیوں کو کتنی آسانی سے معاف کر دیا ہے۔ آج مجھے فخر ہے اپنے انتخاب پر۔" فیصل کے اعتراف نے رانیہ کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

"سب آپ کی محبت کے صدقے۔" رانیہ نے کہا تو فیصل کا دل خوشی سے بھر گیا۔

"یہ میری خوش نصیبی ہے۔" فیصل نے بھی جواب دیا۔

☆☆☆

"رانی۔" وہ جو کپڑے دھونے میں مگن تھی۔ اپنے قریب کسی کی سرگوشی سن کر اچھل ہی پڑی۔ پلٹ کر دیکھا تو اسد اسے ایسے گھور رہا تھا جیسے کبھی عورت کو دیکھا ہی نہیں۔ رانی نے جلدی سے پاس پڑا دوپٹا اٹھا کر اوڑھا۔ پچھلے صحن کی طرف کوئی نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ بہت آرام سے کپڑے دھو رہی تھی مگر اب اسے لگنے لگا کہ اسد کے ہوتے ہوئے اس کی اتنی لاپراوئی، اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسے بہت محتاط رویہ اپنانا ہوگا۔

"کیا ہے اسد بھائی؟" رانی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ تو اسد لوفرانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ رانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دل کیا کہ کوئی چیز اٹھا کر اسے مار دے مگر اپنے غصے کو ضبط کرتی رخ پھیر گئی۔

"کبھی ہم سے پیار سے بھی بات کر لیا کرو۔" اسد نے کہا تو رانی نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔

"یہ فرمائش نیلوفر باجی کے سامنے کرنا۔" رانی کے انداز پر اسد ٹھٹک گیا۔ آج اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے جناب! آج مزاج کیوں گرم ہے۔" اسد کے پوچھنے پر رانی پلٹی۔ اسی وقت اسد نے اس کی کلائی تھام لی۔ رانی نے زور لگا کر اپنی کلائی چھڑوانے کی کوشش کی مگر اسد کی گرفت مضبوط تھی۔

"پیار سے کہو گی تو فوراً چھوڑ دوں گا۔" اسد نے اس کا مذاق اڑایا۔

"پیار سے تو میں کہتی ہوں۔ ٹھہرو ذرا۔" اسی وقت پیچھے سے نیلوفر کی تیز آواز گونجی۔ اسد نے بوکھلا کر رانی کا ہاتھ چھوڑا۔ نیلوفر نہانے کے لیے واش روم گئی تو اسد کو یہ موقع غنیمت لگا اور وہ رانی کو تنگ کرنے کے لیے صحن میں پہنچ گیا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ نیلوفر پہلے ہی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے نہانے کا ارادہ ترک کر کے جلدی سے واش روم سے نکل آئی اور اسد کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے وہاں پہنچ گئی۔ اب کمر پر ہاتھ رکھے اسے غصے سے گھور رہی تھی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ رانی ہی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ بار بار مجھے اپنے پاس بلاتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

اسد نے جلدی سے کہانی بناتے ہوئے کہا تو رانی اس کے جھوٹ پر دیکھتی ہی رہ گئی۔

"جاؤ یہاں سے۔" نیلوفر نے اسد کی طرف انگلی اٹھا کر کہا تو وہ فوراً وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" رانی نے اس کے جانے کے بعد کہا تو نیلوفر تیزی سے آگے بڑھی۔

"جھوٹ ہے یا سچ مگر میں اب مزید تمہیں

اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکتی۔ میرے شوہر کی فطرت کا کمینہ پن میں دیکھ چکی ہوں۔ مگر میری مجبوری ہے کہ میں اپنے بچوں کی وجہ سے اس شخص کو نہیں چھوڑ سکتی! بہتر ہے کہ تم ہی یہاں سے چلی جاؤ۔" نیلوفر نے کہا تو رانی پریشان ہوگئی۔

"مگر میں کہاں جاؤں گی۔ اس شہر میں اجنبی ہوں میں تو۔" رانی نے کہا تو نیلوفر نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اس شہر میں اجنبی نہ بھی ہوتیں تو تمہیں پہلے ہی اپنے والدین کے گھر جانا چاہیے تھا۔ جہاں بھی جاؤ گی۔ اسد جیسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا کیونکہ تم جیسی لاوارث لڑکیاں ہر مرد کے لیے تر نوالہ ثابت ہوتی ہیں اور ضروری نہیں کہ تم ہر بار بچ بھی جاؤ۔" نیلوفر نے حقارت سے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ رانی کام ادھورا چھوڑ کر پریشانی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔

وہ چلتی ہوئی گھر کے اگلے حصے کی طرف آگئی۔ امرود کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنی بدقسمتی پر روتی رہی۔ اسی وقت گیٹ زور سے بجا اور ساتھ ہی کسی نے بیل بجائی۔ رانی قریب ہونے کی وجہ سے اٹھی اور گیٹ کی کھڑکی میں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کون ہے۔" سامنے کھڑے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی۔

"رانی۔" خدابخش نے پکارا۔ تو رانی بے اختیار گیٹ کھول کر دوڑتے ہوئے اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی۔

"ابا۔ آپ نے مجھے ڈھونڈ لیا۔" رانی کا سارا غصہ، ساری ناراضی، اسی پل ختم ہوگئی۔ خدابخش کا دل بھی موم ہوا اور وہ مدھم لہجے میں بولا۔

"جھلی۔ تجھے در در کی ٹھوکر کھانے کے بجائے، اپنے گھر آنا چاہیے تھا۔ چل آ۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔"

"یہ کون ہے رانی۔" اسی وقت نیلوفر اور اسد بھی باہر آگئے۔ ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر وہ دونوں بھی چونک گئے۔

"میرے ابا۔ مجھے لینے آئے ہیں۔" رانی نے فخریہ انداز میں کہا۔

"تیرے ابا۔" نیلوفر نے حیرت سے دہرایا۔ اسد وہاں سے رفو چکر ہوگیا۔ رانی نے ابا کو لان میں بٹھا کر جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان باندھا۔

"ابا ایک منٹ۔ میں راضیہ باجی سے مل لوں۔" رانی نے کہا تو خدابخش سر ہلا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ خدابخش نے رانی کی دوست سلمٰی سے کسی نہ کسی طرح معلومات حاصل کرلی تھیں۔ راضیہ بہت محبت اور خوش دلی سے ملی۔ خدابخش کو عزت کے ساتھ بٹھا کر چائے کے ساتھ کئی لوازمات پیش کیے کہ وہ اس کی مہمان نوازی کے دل سے گرویدہ ہو گئے۔

"رانی بہت ذہین لڑکی ہے۔ کچھ مہینوں میں اس کے امتحان ہونے والے ہیں۔ جب داخلے جائیں گے تو میں فون پر تمہیں بتادوں گی جب بھی بھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو مجھے اپنی بڑی بہن سمجھ کر آواز دینا۔" راضیہ کے کہنے پر رانی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اب تک سب سے مخلص رشتہ اسے راضیہ کی صورت میں ہی ملا تھا۔ خدابخش بھی راضیہ کی بے لوث محبت سے متاثر نظر آرہا تھا۔

"اچھا۔ اب ہم چلتے ہیں۔ رب راکھا۔" خدابخش نے کہا اور راضیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل گیا۔ رانی بھی راضیہ سے مل کر دکھی دل کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئی۔ رانی نے وہاں تقریباً آٹھ ماہ کا وقت گزارا تھا۔ وہ جب اپنے گاؤں سے اکرم کے سنگ رخصت ہوئی تھی، تو ایک ڈری سہمی، دنیا سے انجان لڑکی تھی۔

چار سال بعد جب اکرم نے اسے طلاق دے کر گھر سے نکالا، تو وہ سسرال کے ظلم و ستم کا شکار ایک مظلوم عورت تھی مگر اب جب وہ شہر سے واپس گاؤں کا سفر کر رہی تھی تو وہ زمانے کو پرکھ کر اور زمانے کی سازشوں میں طاق، ایک چالاک عورت کا روپ

دھار چکی تھی جس نے اپنی آنے والی زندگی کو اپنی مرضی اور طریقے سے گزارنے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

بڑے سے گراؤنڈ میں وہ ایک سنگی بینچ پر خاموش بیٹھا آس پاس کھیلتے بھاگتے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت رش معمول سے بہت کم تھا کیونکہ ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر بچے اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ عادل جب سے یہاں آیا تھا، اسی طرح اداس اور الگ تھلگ رہتا۔ اسے اپنی ماں اور رمشا بہت یاد آتے تھے۔ رمشا کی فکر اسے بے چین رکھتی مگر وہ اپنی بہن کے لیے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

"میں تھوڑا سا بڑا ہو جاؤں تو رمشا کو اپنے ساتھ کہیں دور لے جاؤں گا۔" روز کی طرح عادل نے خود کو ایک عہد سے باندھا۔

"بھائی۔" اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ عادل نے چونک کر دیکھا۔ رمشا کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑا اور فوراً اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔

"رمشا میری بہن۔" عادل اسے گول گول گھماتے ہوئے ہنس رہا تھا۔ رمشا کی کھلکھلاتی ہوئی ہنسی بھی اس میں شامل تھی۔ کچھ دور کھڑے فیصل نے بہت محبت سے اس منظر کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے رانیہ کے دل کو بھی کچھ ہوا۔

"میں نے ان بچوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"

اس کے ضمیر نے پہلی کروٹ لی اور بہت غلط وقت پر لی۔ ابھی تو اس نے ابتدا کی تھی۔ ابھی تو اس نے اس راہ پر بہت آگے تک جانا تھا۔

عادل کی نظر فیصل اور نک سک سے تیار رانیہ پر پڑی تو وہ رک گیا۔ رمشا کو گود سے اتار کر اس نے رخ پھیر لیا۔ فیصل تیزی سے آگے بڑھا۔

"عادل بیٹا۔ تم اب تک مجھ سے ناراض ہو۔" فیصل کے پوچھنے پر بھی وہ خاموش کھڑا رہا۔

"اچھا سوری۔ میں اپنی غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔" فیصل نے صلح کا پرچم لہرایا۔

"عادل بری بات بیٹا۔ پاپا سوری کہہ تو رہے ہیں۔" رانیہ نے درمیان میں لقمہ دیا تو عادل نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اس دن پاپا سے بھی تو میں نے سوری کیا تھا مگر انہوں نے تو مجھے معاف نہیں کیا تھا۔" عادل کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ وہ دونوں ساکت رہ گئے۔ فیصل کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے جلد بازی میں بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ اپنی اولاد کو خود سے ہی بدظن کر کے۔

"بھائی پلیز۔ اب اور نہیں لڑنا۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ بھائی وعدہ کرو کہ آپ مجھ سے ملنے گھر آؤ گے۔ نہیں تو میں بھی امی کی طرح مر جاؤں گی۔ ان کے پاس چلی جاؤں گی۔"

رمشا روتے ہوئے عادل سے لپٹ گئی۔ رانیہ اور فیصل اس کے الفاظ پر لرز کر رہ گئے۔

"میرے بچے۔" فیصل نے دونوں کو گلے سے لگا لیا۔ رانیہ نے رخ پھیر لیا۔ وہ اس وقت خود بھی اپنے اندر کی حالت کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"میں تمہارے پرنسپل سے بات کروں گا اور بہت جلد تمہیں واپس گھر لے جاؤں گا۔"

فیصل کے کہنے پر عادل نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ فیصل نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ رمشا نے عادل کا بازو اتنی زور سے پکڑا ہوا تھا جیسے وہ کہیں بھاگ جائے گا۔ ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے چادر بچھا کر وہ چاروں بیٹھ گئے۔ رانیہ نے اپنے ساتھ لائے ہوئے سامان کو کھول کر ہر چیز ترتیب سے سامنے سجا دی۔

"آج میں اپنے بیٹے کو، اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں گا۔"

فیصل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عادل کو خود میں چھپا لے۔ فیصل نے ایک پلیٹ میں اس کی ساری من پسند چیزیں ڈالیں اور بہت محبت سے ایک

ایک نوالہ بنا کر عادل اور رمشا کو کھلانے لگا۔ رانیہ کے اندر کی سوتیلی ماں سوئی ہوئی تھی اس لیے اسے اس منظر کو دیکھ کر تکلیف نہیں ہوئی۔ رمشا کا چہرہ تھوڑی دیر میں ہی کھل اٹھا تھا۔

کافی سارا وقت وہاں گزار کر واپسی پر آتے ہوئے عادل کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ چار دن اس نے رمشا کے ساتھ مستی کرتے ہوئے گزارے تھے۔ فیصل ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا۔

''فریحہ آپی۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا میں نے جلد بازی میں فیصلہ کیا تھا مگر شکر ہے کہ مجھے بہت جلد سمجھ آ گئی۔ میں عادل کو واپس گھر لے آؤں گا۔''

فیصل نے فریحہ کو فون پر اطلاع دی تو وہ بھی خوشی سے کھل اٹھیں۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' فریحہ نے کہا۔

''بس میرے بھائی۔ بہت سوچ سمجھ کر اور توازن کے ساتھ دونوں رشتوں کو لے کر چلنا۔ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہوگا۔''

فریحہ کے کہنے پر فیصل ان شاءاللہ کہہ کر رہ گیا۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو فیصل عادل کو چھوڑنے ہاسٹل گیا۔

''پاپا میں آپ کا انتظار کروں گا۔ جلدی آنا۔'' عادل نے کہا تو فیصل نے پورے یقین سے وعدہ کیا۔

عادل امید کی ڈور تھامے پہلی بار خوشی خوشی ہاسٹل گیا۔

☆☆☆

''رانیہ! مجھے ایک ضروری کام کی وجہ سے تین دن کے لیے شہر سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ میری عادل کے پرنسپل سے بات ہوگئی ہے۔ تھوڑی سی فارمیلیٹی ہے۔ وہ تم دیکھ لینا اور عادل کو کل گھر واپس لے آنا۔ بہت مشکل سے پرنسپل صاحب مانے ہیں۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ یہ سیشن مکمل ہونے دوں مگر میں نہیں مانا۔''

فیصل نے اپنا بیگ پیک کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا تو میگزین کے ورق پلٹتی رانیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اگلے دن فیصل چلا گیا۔ رانیہ نے وہ سارا دن گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے میں گزارا۔ شام ڈھلے وہ گھر لوٹی تو رانیہ نے اپنی سینڈل اتاری اور دونوں پاؤں اوپر کر کے ہلکے ہاتھوں سے اپنے پیروں کو دبانے لگی۔

''اف فیصل نے بھی کیا ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔'' عادل کو ہاسٹل سے واپس لانے والی بات یاد آئی تو منہ بنا کر رہ گئی۔

''آج تو دن گزر گیا۔ کل ہی جاؤں گی۔'' رانیہ نے کہتے ہوئے رجو کو آواز دی اور گرم چائے لانے کا کہا۔ عادل اور رمشا پر اس کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ اس لیے اب اسے کوئی فکر نہیں تھی کہ واپس آ کر عادل اس سے لڑائی مول لے گا۔ وہ عادل اور رمشا کے ذہن پر اپنا گہرا نقش بنا کر مطمئن تھی۔

''اب ان بچوں کو کنٹرول کرنا آسان ہوگا اور جب میرا بچہ ہو جائے گا تو سب ساری گیم ہی میرے ہاتھ میں آ جائے گی۔'' رانیہ نے مطمئن ہو کر سوچا۔

☆☆☆

''کیا کہہ رہے ہیں آپ۔'' فیصل ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھا۔ ساتھ بیٹھی رانیہ کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو گیا۔

''دیکھیے فیصل صاحب۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا بچہ پہلے ہی ہاسٹل آنے پر رضامند نہیں تھا۔ اب جیسے ہی اسے موقع ملا وہ ہاسٹل سے بھاگ گیا۔ ہم اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر پلیز یہ بات یہاں سے باہر نہ نکلے۔ ہمارے ادارے کی بدنامی ہوگی۔'' پرنسپل نے التجائیہ انداز میں کہا تو فیصل بھڑک اٹھا۔

''واٹ ربش! میرا بچہ لاپتا ہے اور آپ کو اپنے ادارے کے نام کی پڑی ہوئی ہے۔ اتنی سیکیورٹی کے ہوتے ہوئے بچہ باہر کیسے چلا گیا۔ مجھے میرا بچہ ہر حال میں چاہیے۔ نہیں تو میں اس ادارے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔'' فیصل نے غصے سے بھر کر

کہا۔ کل جب رانیہ عادل کو لینے ہاسٹل گئی تو اسے خبر ملی کہ عادل ہاسٹل سے فرار ہو گیا۔ رانیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے فوراً فیصل کو فون کیا۔ فیصل پہلی دستیاب فلائٹ سے وہاں پہنچا اور اب مسلسل پرنسپل اور وارڈن کے ساتھ ساتھ باقی اسٹاف سے بھی باز پرس کر رہا تھا۔

بچے کی گم شدگی نے وہاں ایک بھونچال مچا دیا۔ جسے دبانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بچہ غائب کیسے ہو گیا۔ وارڈن کے کہنے پر پرنسپل نے بھی سارا ملبہ بچے پر ہی ڈال دیا کہ وہ وہاں رہنا ہی نہیں چاہتا تھا اس لیے بھاگ گیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے واپس لے جاؤں گا پھر وہ کیوں بھاگے گا۔'' فیصل چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

''فیصل حوصلہ کریں۔ ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ پولیس میں رپورٹ کریں۔''

رانیہ کے کہنے پر فیصل نے اثبات میں سر ہلایا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا پرنسپل کے آفس سے باہر نکلا۔ رانیہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

☆☆☆

''ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ میرا عادل۔'' فیصل نے روتے ہوئے کہا۔ فریحہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ عادل کی گم شدگی کی خبر سنتے ہی وہ پہلی فلائٹ سے پاکستان آگئی تھیں۔ فیصل اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لا کر بیٹے کی تلاش کر رہا تھا۔ پولیس کے اعلا افسران سے لے کر میڈیا تک اس کیس میں شامل ہو چکا تھا۔ ہر پل امید اور نا امیدی کے درمیان جھولتے ہوئے ان سب کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ فیصل کچھ دنوں میں ہی صدیوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ رمشا خوف زدہ ہو کر سب کے چہرے دیکھتی۔ بار بار فریحہ سے پوچھتی۔

''پھپھو۔ بھائی کہاں ہے؟'' فریحہ اسے دعا کرنے کا کہتے ہوئے خود بھی رو پڑتیں۔ رانیہ بھی دل میں عادل کے ملنے کی دعا کرتی۔ وہ عادل اور رمشا کو اپنے کنٹرول میں ضرور رکھنا چاہتی تھی مگر وہ انھیں کوئی نقصان پہنچا کر، اپنا گھر خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فیصل کا حال پاگلوں والا ہو گیا۔ نہ اسے اپنے کام کی فکر رہی اور نہ اپنی حالت کی۔ وہ بس دن رات اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔

''عادل نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں جلدی اسے لینے آؤں گا مگر دیکھیں آپی۔ کتنی دیر ہو گئی ہے!''

فیصل کی باتیں فریحہ کا دل چیر دیتیں۔

☆☆☆

وہ صبح سویرے گھر سے نکلی۔ ایک طویل سفر، جو بہت تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے وہ اپنے ماضی کے ورق پلٹتی گئی۔ جہاں کسی صفحے پر وہ مظلوم تھی اور کسی صفحے پر ظالم۔ اسے یاد تھا کہ وہ ابا کے ساتھ جب نیلوفر کے گھر سے نکل کر واپس گھر گئی تو بالکل ایک نئی رانی کے روپ میں گئی تھی۔ اب وہ ابا سے ڈرتی نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے جینا جان گئی جب ابا نے اس کی شادی کی بات کی تو رانی نے اپنے باپ سے لڑنے کے بجائے بہت محبت اور سمجھ داری سے اپنا مقدمہ لڑا۔ اس نے اپنے باپ کو یقین دلایا کہ وہ پڑھ لکھ کر شہر میں بہت اچھی نوکری کرے گی اور اپنے باپ کا سہارا بنے گی۔ خدا بخش تھوڑی کشش ویچ کے بعد مان گیا۔ اگر رانی اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی تھی تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

رانی نے راضیہ باجی کی مدد سے جیسے تیسے ایف۔ اے کر ہی لیا۔ پھر وہ ضد کر کے لاہور آگئی اور راضیہ باجی کے پارلر میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے کوئی اور نوکری بھی تلاش کرنے لگی۔ اس دوران وہ گاؤں کی سیدھی سادھی عام سی رانی سے، شہر کی ماڈرن اور فیشن ایبل رانیہ میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے اپنے اٹھنے بیٹھنے سے لے کر بول چال تک بہت محنت کی۔ وہ راضیہ باجی یا دوسری لڑکیوں کی منہ سے انگلش کے جو بھی لفظ یا جملے سنتی، تھوڑی سی محنت اور پریکٹس کے بعد وہ بھی ویسے ہی بولنا شروع

کردیتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ رانی کی شخصیت بہت نکھر گئی اور راضیہ باجی کے جاننے والے ایک رشتے دار کے ذریعے ہی رانی کو فیصل کے آفس میں ریسپشنسٹ کی جاب ملی۔

رانی نے بہت پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اب کی بار وہ شادی اپنی مرضی اور پسند سے کرے گی۔ فیصل اپنی شان دار شخصیت کی وجہ سے اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا اور وہ آفس میں فیصل کے آگے پیچھے رہنے لگی مگر اس طریقے سے کہ اس کا امیج خراب نہ ہو اور فیصل اس کی موجودگی کا نوٹس بھی لے لے۔ فیصل اپنی بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کرنا تو چاہتا تھا مگر وہ تو جانتا تھا کہ کوئی بھی عورت اس کے بچوں کو بہت آسانی سے قبول نہیں کرے گی۔ رانیہ کا عام سا بیک گراؤنڈ جانتے ہوئے بھی اسے رانیہ اپنے بچوں کے حق میں بہتر لگی۔ رانیہ اس کے بچوں کے بارے میں جس طرح فکر مند ہوتی، اسے مختلف مشورے دیتی۔ فیصل کو لگا کہ رانیہ اس کے بچوں کے لیے بہت اچھی ماں ثابت ہوگی مگر اس سوچ کے باوجود، فیصل نے پہلے اپنے بچوں اور رانیہ کو ایک دوسرے سے مانوس کروایا۔ وہ ویک اینڈ پر کوئی نہ کوئی آؤٹنگ کا پروگرام بنالیتا۔

رانیہ سب سمجھ گئی۔ اس کی انا ہرٹ تو ضرور ہوئی مگر فیصل اسے ایک مضبوط پناہ دے سکتا تھا۔ رانیہ نے مختصر لفظوں میں اسے اپنی پہلی شادی کے بارے میں بتایا۔ اکرم ایک آوارہ اور برا شخص تھا یہ کہہ کر اس نے فیصل کی ہمدردی بھی حاصل کرلی۔

رانیہ نے جیسا سوچا، اسے ویسا مل ہی گیا۔ اس شادی سے پہلے ہی اس نے سب پرانے رشتے توڑ دیئے۔ حتیٰ کہ اپنے والدین سے بھی ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

فیصل سے نکاح کرتے ہوئے اس نے یہ ہی کہا کہ میرے والدین اس شادی کے لیے نہیں مان رہے ہیں۔ فیصل کو اس کے ماضی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس لیے اس نے زیادہ باز پرس نہیں کی۔ یوں وہ رانیہ فیصل بن کر اپنی قسمت پر نازاں، شطرنج کی نئی بساط بچھا کر بیٹھ گئی۔

عادل باپ کا رویہ بدل جانے پر بے حد خوش تھا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ وہ اب پھر سے پہلے کی طرح اپنے گھر میں اپنے باپ اور بہن کے ساتھ خوشی خوشی رہ سکے گا۔ لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

وہ جب سے ہاسٹل آیا تھا، وارڈن کی ضرورت سے زیادہ عجیب سی نظروں کا شکار رہتا۔ وہ کوئی نہ کوئی وجہ بنا کر اسے اپنے آفس میں بلالیتا۔ کرسی پر بٹھا کر باتیں کرتا اور اس کا ہاتھ تھام کر دلاسے کے انداز میں تھپکتا رہتا۔

پہلے پہل تو وہ اسے وارڈن کی شفقت سمجھتا رہا لیکن بڑھتی عمر کا باشعور بچہ تھا۔ وارڈن کے رویے میں کچھ تو ایسا تھا کہ وہ اب اس سے خوف زدہ رہنے لگا۔

عادل کو باپ یاد آنے لگا اور گھر کی چار دیواری بھی۔ جہاں وارڈن جیسا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ آیا وہ اس انسان کی نظروں سے اوجھل کیوں ہونا چاہتا تھا، کیوں اس سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔

پھر ایک روز فیصل، رمشا اور رانیہ اس سے ملنے آگئے۔ تب فیصل نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ واپس لے جائے گا۔ اسی رات وارڈن نے پلان بنایا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ عادل گھر والوں سے یا کسی بھی دوسرے انسان سے کسی بھی قسم کی بات شیئر نہیں کرسکے گا اور یہی ایک وجہ تھی کہ وارڈن عادل جیسے مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ رکھنے والے بچے کے ساتھ بھی ایسی حرکت کرنے سے نہیں چوکا۔

عادل وارڈن کے بلاوے پر بغیر کوئی سوال جواب کیے اس کے ساتھ چل پڑا۔ وارڈن اس ہاسٹل میں بنے گودام کی جانب لے جانے لگا۔ تب ہی وارڈن کا شریک جرم اس ہاسٹل کا چوکیدار بھی وہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں کی گفتگو کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ سمجھتے ہوئے بری طرح

خوف زدہ ہوا اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔

عادل میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ ان دو مردوں کے چنگل سے نکل کر بھاگ گیا۔

☆☆☆

گم شدگی کے بعد کہیں عادل کے ملنے کی نوید سنائی دی تو وہ دونوں میاں بیوی جیسے خوشی سے پاگل ہو گئے۔ رانیہ عادل کی گم شدگی کے بعد سے اپنی خالی کوکھ کا غم بھی بھول گئی تھی۔ اسے یاد تھا تو صرف اتنا کہ ایک بچہ اس کے حسد اور نفرت کی وجہ سے آج اپنے گھر والوں سے دور نہ جانے کس حالت میں ہے۔ وہ اب اپنے بچے کے لیے نہیں بلکہ عادل کے لیے دعائیں مانگ کرتی تھی اور یہ اس کی نیک نیتی ہی تھی کہ اس گھر میں پھر سے عادل چلتے پھرتے، ہنستے بولتے دکھائی دینے لگا۔

ہاسٹل سے بھاگنے کے بعد وہ ایک گاڑی سے ٹکر کھا کر حادثے کا شکار ہوا لیکن گاڑی والا اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ایک خدا ترس بزرگ اسے نہ صرف ہسپتال لے کر گئے بلکہ اس کا علاج بھی کروایا۔ عادل ذہنی دھچکے کا شکار، نہ بولتا تھا اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیتا۔ وہ بزرگ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔

یہ آٹھ ماہ عادل نے ان کے ساتھ گزارے، یہ تو اس کا نصیب اچھا تھا کہ وہ ہر مصیبت سے بچ کر محفوظ پناہ گاہ میں جا پہنچا۔

جب عادل کے زخم مکمل مندمل ہو گئے اور وہ اتنی محبت اور توجہ کے بعد بہتر محسوس کرنے لگا تب اس نے ان بزرگ کو ساری کہانی بتائی۔ ساتھ ہی اپنے گھر کا نمبر بھی دیا اور تب عادل واپس اپنے والدین کے پاس پہنچا۔

☆☆☆

”رمشا! جلدی سے پونی بنوالو۔ پھر وین آ جائے گی تو تمہارا ناشتا بھی رہ جائے گا۔“ رانیہ مسلسل رمشا کو آواز دے رہی تھی لیکن وہ واکر میں بیٹھے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے کھیل رہی تھی

فیصل اور عادل ناشتا کی میز پر بیٹھے مسکراتے ہوئے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

اسی وقت رمشا کی وین کا ہارن بجا اور وہ شور مچاتی، خدا حافظ کہہ کر عادل کے پیچھے باہر کی طرف بھاگی۔ اس کے کچھ دیر کے بعد فیصل بھی آفس چلا گیا۔ رانیہ رجو کو ناشتہ کا کہہ کر دونوں بچوں کو لے کر لان میں آ گئی۔ رانیہ نے سکون کے ساتھ لان چیئر کی پشت سے ٹیک لگائی اور اپنے خوب صورت گھر کو دیکھتے ہوئے اس کے دل میں خیال آیا۔

”میرے رب تُو کتنا مہربان ہے۔ کتنی جلدی تُو نے میری توبہ سنی۔ مجھے زندگی سنوارنے کا ایک موقع اور دیا۔ میں جب اپنے سفر پر چلی تو میرے کاسۂ ذات میں نیت کے کھوٹے سکوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ٹھیک کہا تھا کسی نے کہ......“

رانیہ کو کئی سال پہلے درگاہ میں، کالی چادر میں لپٹی وہ عورت یاد آئی تھی۔

”اس کی بارگاہ میں اپنی ذات کا کاسہ جب بھی پھیلاؤ، اس میں کبھی جھوٹ، منافقت مت شامل کرنا۔ خاص کر کسی کی بھی دل آزاری کے کھوٹے سکے لے کر اپنے دکھوں کا سودا مت کرنا۔“

اور اتنے امتحانوں کے بعد بالآخر رانیہ عرف رانی نے اپنے کاسۂ ذات میں نیت کے خالص سکے ڈالنا سیکھ لیا تھا اور اسے امید تھی کہ اس بار اس کی اولاد اس کی بدنیتی کا شکار نہیں ہو گی۔

☆

عطیہ خالد

چلگی ہے شادی

جب سے عاقب کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی، خالہ کی بے چینی عروج پر تھی۔ راتوں کو متوقع خرچوں سے پریشان ہو کر اٹھ بیٹھتیں اور پرانے جوڑ توڑ کر کے نئے سرے سے حساب لگانے لگتیں۔ روزمرہ کے خرچوں میں کمی تو پہلے سے بھی بڑھ کر شروع کر دی تھی۔ دو دو دن کا پرانا باسی سالن دسترخوان پر دیکھ کر بچے جھنجلاتے مگر وہ پرواہ نہ کرتیں۔ اب تو عاقب کے ساتھ نومی کی بھی جاب شروع ہو گئی تھی۔

لیکن خالہ کو جو کنجوسی کی عادت پڑی تھی، وہ کم ہونے والی نہیں تھی۔

شادی میں ایک مہینہ باقی تھا کہ عروسہ کی سالگرہ آ گئی۔ عاقب شوق کا مارا بڑا خوب صورت فینسی جوڑا اور چوڑیاں لے آیا۔

"ارے ہئے تیری تو مت ماری گئی بچے۔ مہینے بعد شادی ہے۔ ایسی سالگرہ پر مار کون تحفہ دیتا ہے۔ بس خاموشی سے اٹھا کر رکھ دے بری کے بکسے میں اور ایک کپ چائے بنا لا میرے لیے۔"

"امی! پہلی سالگرہ ہے منگنی کے بعد۔" عاقب منمنایا۔

"ارے ساری زندگی سالگراہوں سے بھری پڑی ہے۔ ساری عمر کا دینا دلانا ہی ہے اب میاں۔" خالہ نے شدید فکرمندی کا انداز اپنایا۔

"امی، یہ جوڑا تو دے دیں اس کو۔ بری کے جوڑے تو آپ خرید ہی چکی ہیں۔"

"ارے نومی! دو پکوڑے تو رکھ دے ساتھ۔" انہوں نے پکوڑے تلتے ہوئے نومی کو آواز دی۔

"ایک تو امی پہلے ہی چھٹانک بھر بیسن دیا آپ نے۔ اب اس میں سے بھی پکوڑے مانگ رہی ہیں۔" نومی نے کچن سے ہی جواب دیا اور پلیٹ اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔

"ارے بچے نچ مرک دیکھنے کو مانگ رہی ہوں۔"

"بالکل صحیح ہے نچ مرک۔" وہ ہنستا ہوا اندر سے ہی بولا۔

"عاقب بھائی! جوڑا تو بہت پیارا ہے۔ کوئی میچنگ سینڈل بھی لاتے۔" منا اور نومی ایک ساتھ بول اٹھے۔

"یک نہ شد، تین تین شد۔" خالہ کے غصے کا گراف ہائی ہونے لگا۔

"سینڈل کے لیے صحیح ناپ مجھے معلوم نہیں تھا۔ پیسے دے دیں گے، وہ اپنی مرضی سے لے لے گی۔" عاقب مسکرایا۔

خالہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی جوتی اٹھا کر عاقب کے دے ماری۔

"اس کا نمبر چلے گا۔" دانت کچکچا کر پوچھا۔

"یہ تو بڑی زہریلی جوتی ہے امی! عروسہ کو ایسی جوتیاں مت لے دیجیے گا۔" شادی کے دن قریب تھے تو جوتی کھا کے بھی ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

بیٹی تو خالہ کی کوئی نہیں تھی جو بری کا سامان بنوانے میں مدد کرتی۔ لڑکوں سے کچھ پوچھتیں تو وہ ٹال جاتے یا الٹے سیدھے مذاق میں پڑ جاتے۔ ایسے میں خالہ کو اپنی بھتیجی ثریا کا خیال آ گیا جو گاؤں میں رہتی تھی اور عادت و اطوار میں بالکل اپنی پھوپی

پر پڑی تھی۔

سارے خاندان میں سب سے زیادہ خالہ کی ثریا سے ہی بنتی تھی۔ بس خالہ کو خیال آنے کی دیر تھی کہ انہوں نے گاؤں ثریا کو ٹیلی فون کر دیا اور جلدی آنے کی تاکید کردی۔ ثریا تو جیسے سندیسے کے انتظار میں تھی۔ لپک جھپک تیاری کر کے شام میں خالہ کے پاس پہنچ گئی۔

"السلام وعلیکم پھوپھو!" ثریا نے خالہ کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ جیتی رہو۔" خالہ نے بڑی گرم جوشی سے کہہ کر استقبال کیا۔

"اخاہ! آپا ثریا ہیں۔" عاقب بولا۔

"ارے خوش آمدید۔ خوش آمدید۔" منے اور نومی نے بھی شرارت بھری آواز میں کہا۔

ثریا آپا خوشی اور جوش میں لال ٹماٹر بنی ہوئی سب سے ملنے ملانے لگیں۔ رات تو کھانا کھاتے خوش گپیاں کرتے بڑی اچھی گزری۔ صبح جلدی کھانا پکانا نپٹا کر پھوپی بھتیجی نے بری کے بکسے کھول لیے اور جوڑے نکال کر دیکھنے لگیں۔

"اے پھوپھو! جوڑے تو سب ہی پھیکے رنگوں کے ہیں۔" ثریا بولی۔

"ارے ہمیں تو ایسے ہی رنگ پسند ہیں۔ مار چیختے چلاتے رنگ ہمیں نہیں بھاتے۔"

"پھوپھو! لیکن بری میں تو کھلتے ہوئے رنگوں کے کپڑے اچھے لگتے ہیں۔" جوڑے الٹ پلٹ کرتے ہوئے ثریا نے منہ بنایا۔

"ایک سے ایک قیمتی ہے کپڑا۔ تم تو جانتی ہو، میری پسند نہایت ہی اعلا ہے۔" خالہ جذباتی ہو چلی تھیں۔ ثریا نے قیمتی کپڑوں کو بھڑک کر دیکھا۔ اس کی شاید نظر کمزور تھی جو اسے ایسے اعلا کپڑے، نا قابل ذکر اور بڑے نالائق سے لگ رہے تھے۔

"یہ دیکھو گلابی جوڑا۔ کیسا ملاکھن (ملائی۔ مکھن) سا کپڑا ہے۔"

"ہاں یہ جوڑا بہتر ہے۔" ثریا کو بہت دیر لگی تعریف کرنے میں۔

"اور یہ دیکھو، دھاڑی سانی (دھانی ساڑھی) کیسی پیاری ہے۔" خالہ نے دھانی ساڑھی پھیلائی۔

"پھوپھو! یہ تو بالکل پھیکا رنگ ہے اور کام بھی



پرانا معلوم پڑتا ہے۔" ثریا نے صاف صاف کہنے کی ٹھان ہی لی۔ خالہ کا ڈر تو تھا پر اب ہمت تو دکھانی ہی تھی۔ بے چاری دلہن کو کچھ اچھا تو نصیب ہو۔

"پھوپھو ایک دو کے سوا یہ جوڑے کسی کام کے نہیں ہیں۔ نیوتوں میں بھی رکھے تو بڑی بھد اڑے گی۔"

"ارے کوئی بھد اڑا کے تو دیکھے۔ میں علاج نہ کردوں گی۔" خالہ تڑپ کر بولیں۔

"اڑے گی پھوپھو! اڑے گی بہت بھد۔ جگ ہنسائی الگ ہوگی۔ خاندان والوں کی باتیں الگ سننا پڑیں گی پھوپھو۔" ثریا کی زبان بھی چلی۔

"ارے تمہیں اس لیے نہیں بلایا تھا میں نے کہ میرے جہیز میں کیڑے نکالو۔ تم ان میں سے اکیس جوڑے الگ کرو۔ باقی کے نیوتوں میں کام آجائیں گے۔ بارات اور ولیمے کا جوڑا کل جا کر خرید لیں گے۔"

ثریا نئے سرے سے کپڑے الٹانے پلٹانے لگی۔ اس کو سمجھ میں آ گیا تھا کہ خالہ نہیں سنیں گی۔ ان ہی میں سے جوڑے چھانٹنے پڑیں گے جو خالہ نے نہ جانے کن وقتوں سے سینت سینت کر رکھے ہوئے تھے۔ بھلا اب مقیش کا کام پہنتا ہی کون ہے۔ چاندی سا گوٹے کا کام بھی کیسا زنگ آلود ہو گیا تھا۔ پر خالہ کو کون سمجھاتا۔ وہ تو خود ایسی ذہین فطین تھیں کہ سب کو جھاڑ کر، لتاڑ کر، غازی بن کر بیٹھ جاتی تھیں۔

اکیس جوڑے تو ثریا کو اسی جہیز میں سے نکالنے پڑے، البتہ ولیمے اور بارات کے جوڑوں کے لیے خالہ نے بارہ ہزار روپے اس کے اور رابعہ کے حوالے کیے کہ سمجھ داری سے جوڑے خرید لائیں۔

"یہ کیا پھوپھو بارہ ہزار روپے؟ اور بارات اور ولیمے دونوں کے جوڑے؟" ثریا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ٹھیک ہے وہ گاؤں سے آئی تھی لیکن اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ بارات ولیموں کے کپڑوں کا کیا ریٹ چل رہا ہے آج کل۔ شہر میں تو پھر لڑکیاں بڑے اونچے دماغ والی ہوتی ہیں۔ اتنے پیسوں میں تو دولہا کی بہنیں بارات کا جوڑا بنواتی ہیں۔ کجا دلہن......

"ارے اپنی ہی دوکان ہے۔ بارہ ہزار میں سے بھی کچھ بچا کر لاؤ تو میں مانوں رشتے داری کو۔" خالہ نے رابعہ کے بھائی کی دوکان کو اپنا جتایا۔ رابعہ اس موقع پر خاموش تھی۔ اسے عاقب نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ خالہ جتنے بھی روپے دیں خاموشی سے لے لیے جائیں۔ زائد رقم وہ خود ادا کردے گا۔

اپنی طرف سے خالہ نے نہایت سمجھ داری سے رابعہ کے حوالے بارہ ہزار کر کے اپنی جان بازار کی سر کھپائی سے بھی بچالی اور رشتہ داری کا حوالہ دے کر ساری ذمہ داری رابعہ اور اس کے بھائی کے سر ڈال دی۔ شام تک ثریا اور رابعہ خوب صورت جوڑوں کے ساتھ لوٹ آئیں۔ خالہ بے حد خوش تھیں کہ ان کی ترکیب کارگر رہی اور صرف بارہ ہزار میں جوڑے آگئے۔ یہ الگ بات تھی کہ عاقب نے نو ہزار روپیہ اپنی طرف سے ادا کیا تھا اور خالہ کو اس بات سے لاعلم رکھ کر سب نے اپنی اپنی جان و عزت بچالی تھی۔

بری کے جوڑے سل کر آئے تو ثریا نے ساتھ کے ساتھ ٹانک کر سوٹ کیس میں جما دیے۔ سلیقے میں تو ثریا، خالہ سے بھی چار ہاتھ آگے تھی۔ بارات کی لسٹ بن گئی۔ کارڈ چھپ کر آ گئے تو نیوتے دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ کام نومی اور منے نے سنبھال لیا۔ موٹر سائیکل پر جا جا کر کارڈ بانٹ دیے۔ دوسرے شہر والوں کو کارڈ پوسٹ کرنے کے علاوہ خالہ نے تاکید کے لیے ٹیلی فون بھی کر ڈالے۔ پہلی پہلی شادی تھی، خالہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی کمی رہ جائے۔

شادی سے تین دن پہلے ہی قریبی رشتہ دار پہنچ گئے۔ خالہ ہزار خرچوں سے پریشان ہو کر بھی رشتہ داروں کی رونق سے خوش تھیں۔ آخر کو بیٹے کی شادی تھی۔ خالہ کا دل تھا کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری پر رنگ

چوکھا آجائے۔ شادی ایسی شان دار ہو کہ خاندان بھر میں یادگار رہے۔ کنجوسی ایسی کہ ہر خرچا جان کو آئے۔ کیا دودھ، کیا دہی۔

عاقب نے بڑی ہوشیاری سے کام سنبھالے ہوئے تھے۔ سمجھ دار کام والیوں کو ہفتہ پہلے ہی گاؤں سے لے آیا تھا اور سارا کام سمجھا دیا تھا۔ دودھ، گھی کے کنستر، انڈوں کے کریٹ اس نے لاکر رکھ دیے تھے۔ خالہ سے یہی کہا تھا کہ ایک دوست نے شادی کا تحفہ دیا ہے۔ خالہ کو تحفہ تو بہت پسند آیا پر یہ پسند نہ آیا کہ یہ تحفہ گھر بیٹھے مہمان ہڑپ کر جائیں۔

☆☆☆

''اے بھابھی! بری کے جوڑے تو دکھا دو ہم سب کو۔'' چھوٹی چچی نے بڑے شوق سے خالہ سے فرمائش کی۔

''بس رات کا کھانا نپٹ جائے میں یہی کام کروں گی۔''

خالہ مسکرا کر بولیں اور کھانا نکلوانے چل دیں۔ ثریا نے آگے بڑھ کر فوراً دسترخوان بچھا دیا۔ کھانا اور چائے کا دور ختم ہوا تو خالہ نے نومی سے بری کے سوٹ کیس منگوا کر بیڈ پر رکھے اور ثریا کو اشارہ کیا کہ جوڑے نکال کر دکھائے۔

''یہ دیکھیے بارات کا لہنگا۔'' ثریا نے سرخ و سفید کنٹراسٹ کا خوب صورت لہنگا دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر لہرایا۔

''واہ! واہ! بہت خوب۔ کیا رنگ ہے۔''

''اور کیسا عمدہ کام ہے۔'' سب طرف سے داد و تحسین بلند ہوئی۔

ویسے کا جامنی فراک بھی سب کو بے حد پسند آیا۔

''ماشاء اللہ! آپا دونوں جوڑے اپنی عروسہ پر خوب جچیں گے۔ کیسی گوری رنگت ہے اس کی۔ آپ نے بہت اچھے رنگ لیے۔'' چھوٹی خالہ نے سراہا۔

''ہاں! ہاں! اس کے دھیان کو رنگتے ہوئے میں نے کہہ دیا تھا رابعہ اور ثریا سے کہ گہرے رنگ لینا۔''

ہنسی ہنسی میں ثریا نے دھانی ساڑھی لہرائی۔ کسی طرف سے کوئی بھی آواز نہ آئی۔ ثریا نے پلو سامنے کر دیا جو کام سے بھرا ہوا تھا۔

''خالہ یہ کیسا پھیکا رنگ لے لیا۔'' چھوٹی خالہ کی چھوٹی بہو کا صرف قد چھوٹا تھا ورنہ زبان کے اعتبار سے وہ بہتوں سے لمبی تھی۔

''کیسا نفیس رنگ تو ہے۔'' خالہ کے نتھنے پھول گئے۔ ثریا نے جلدی سے سلور کام کا گلابی جوڑا لہرا دیا۔

''یہ جوڑا اچھا ہے۔'' رابعہ جلدی سے بولی تو تائید میں کئی آوازیں آئیں۔ پیلے جوڑے پر تو سب نے مشترکہ ناپسندیدگی کا ٹھپہ لگا دیا۔

سنہری ساڑھی نکلی تو رابعہ اور لمبی زبان والی بہو یک زبان بول اٹھیں۔ ''خالہ اس ساڑھی کو بری سے نکال دیں۔''

''ارے دماغ تو صحیح ہے تم لوگوں کا پورے پنتھیس سو...... پچاس...... پنٹھ سو کا کام ہے اس پر۔''

''پینتیس سو یا پینسٹھ سو؟'' چھوٹی چچی نے ہنسی دباتے ہوئے پوچھا۔

''پینسٹھ سو کا۔'' ثریا نے خالہ کی مشکل آسان کی۔

''مارہو گا پینسٹھ سو کا مگر نہ رنگ کسی کام کا ہے نہ کپڑا۔'' چھوٹی بہو نے جلدی سے زبان کی لمبائی دکھائی اور ناظرین کو پھر سے قہقہہ لگانے پر مجبور کیا۔

''سیدھی طرح سے رکھو سوٹ کیس میں۔'' خالہ نے ساڑھی سائڈ پر رکھتی ہوئی ثریا کو کہنی چبھوئی۔

اگلے چار پانچ سوٹ جو دکھائے تو سب نے ہی اعتراض اٹھانے شروع کر دیے۔ کسی کو کپڑا نا پسند تھا تو اکثر کو رنگ اور کام پر اعتراض تھا۔ خالہ کا پارہ سوا

نیزے پر جا پہنچا تھا۔ چہرہ لال بھبھوکا اور نتھنے پھول رہے تھے۔اب کہ جوجوگیا رنگ کا جوڑا ثریا نے فضا میں لہرایا اور چھوٹی بہو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''خالہ! یہ جوڑا تو آپ کی بارات کا لگتا ہے۔''

بس پھر غضب ہوگیا۔

''ارے تم جانٹ رہی تھیں میری بارات میں بانٹے۔'' غصے میں سیدھے سے جملے کا کیا سے کیا ہوگیا چھوٹی بہو سیدھی ہو کر بیٹھیں۔ ذرا ڈر گئی تھی وہ بے چاری۔

''نہ تمہیں نہ سکھائی کسی نے تمیز بات کرنے کی۔''

خالہ کے غصے کا تو کسی پر خاک اثر ہونا تھا۔ سب جملے کے پھیر پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ اسی ہنسی میں بات ٹل گئی اور سب نے جوڑے دیکھ داکھ کر سمیٹ دیے۔ لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی اور فضا میں مایوں کے گیت گونجنے لگے۔ آج کی رات تو عاقب کے صحن میں روشنیاں، قہقہے اور خوشبو کے ساتھ آپہنچی تھی۔ آج مہندی تھی اور سب ہی بروقت تیار ہو کر صحن میں جمع ہو چکے تھے۔ لڑکیاں بالیاں گانے بجانے میں مصروف تھیں۔ مہمان کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد ثریا اور رابعہ دوسری بھابیوں کے ساتھ سبز کامدار دوپٹے کے سائے تلے رسم کے لیے عاقب کو زنانے میں لے آئیں۔ سفید کرتا شلوار میں عاقب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جبکہ آج منے اور نومی اور دیگر کزنز نے سفید شلواروں پر کاہی سبز کرتے پہنے ہوئے تھے۔

عاقب کو رسم کے لیے سجی ہوئی کرسی پر بٹھایا گیا۔ خالہ نے عاقب کے ہاتھ پر ٹشو رکھ کر سب سے پہلے آپا کو بلایا کہ وہ رسم کی شروعات کریں۔ آپا نے مہندی عاقب کے ہاتھ پر رکھی۔ سر پر ہاتھ پھیر کر مٹھائی کھلائی اور دعائیں دیتی ہوئی پلٹیں۔ ان کے پلٹتے ہی خالہ بولیں۔

''ارے آپا! میرے بچے کے بوتھے پر ماسا تو دیں۔'' خالہ کا اتنا کہنا تھا کہ محفل زعفران زار ہوگئی۔

''ماراس میں ہنس ہنس کر پاگل ہونے کی بات کیا ہے بھلا، سب ہی بزرگ بوتھی پے ماسا دیتے ہی ہیں۔''

ہنس ہنس کر حاضرین کے منہ دکھ گئے۔ اب تو جو خالہ، چچی، ممانی مہندی لگانے آتیں رابعہ ہانک لگاتی۔

''بوتھے پر ماسا بھی دیں۔''

اور سب کے ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ گئے بارات تیار کھڑی تھی۔ عاقب کو ہار پہنائے جا رہے تھے اور تصویریں اتاری جا رہی تھیں کہ منے نے سامنے پڑا میز ہٹانے کی کوشش کی تو دوسری طرف سے عاقب نے اٹھالیا تو خالہ چلائیں۔

''ارے میرے بچے تم کیوں اٹھا رہے ہو، یہ بچے اٹھالیں گے۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ آج تمہاری پگلی ہے شادے۔'' (تمہاری شادی ہے پگلے)

اتنا سننا تھا کہ جو جو جہاں جہاں تھا وہیں پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر ساری بارات کی بس میں کوئی نہ کوئی (پگلی ہے شادے) کی پھلجھڑی چھوڑتا رہا اور باراتی ہنس ہنس کر دیوانے ہوتے رہے۔

بارات کا استقبال بہت عمدگی سے کیا گیا۔ عروسہ اور عاقب کی جوڑی تو چاند سورج کی جوڑی معلوم ہوتی تھی۔ جب دونوں کو آرسی مصحف کے لیے ساتھ بٹھایا گیا تو رابعہ نے آہستہ سے پھر......

''آج تم دونوں کی پگلی ہے شادے۔'' کا چٹکلا چھوڑ دیا اور محفل گل و گلزار ہوگئی۔

عروسہ کی اپنی بہن تو کوئی نہیں تھی لیکن رشتہ دار بہنوں نے رونق لگا رکھی تھی۔ اب کے جو رابعہ نے ان کے کان میں تازہ پھلجھڑی چھوڑ دی تو عاقب کا بولنا محال ہوگیا۔ جہاں وہ کوئی بات کرتا کوئی سالی بول اٹھتی۔

''آپ کیوں بولے بھائی جان! آپ کی تو آج پگلی ہے شادے۔'' اور سب کھلکھلا اٹھتے۔ اسی طرح ہنستے ہنساتے دلہن رخصت ہو کر گھر آ گئی۔ ☆

جن دنوں جنگِ عظیم دوم اپنے عروج پر تھی ان دنوں اباجی کی بیٹھک کی رونق دوگنی ہوگئی تھی۔ محلے بھر میں واحد ریڈیو ہمارے گھر میں تھا۔ چراغ جلنے کے بعد اباجی کے دوست اکثر آجایا کرتے اور خبرنامہ سنتے۔ کبھی کوئی زیادہ بڑا واقعہ پیش آجاتا تو وہ

سنعیہ عمیر

وائسرے کے پھول



عورتوں کو بھی رسوئیوں سے کھینچ کر باہر لے آتا۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے ایسے خاموش مجمعوں کی کچھ سمجھ نہ تھی۔ مجھے تو وہی محفلیں اچھی لگتی تھیں جن میں قہقہے ہوں، ڈھولک بجے۔ یہ عجیب ماجرا تھا سب ہو کے عالم میں بیٹھے مشین سے نکلی آوازیں سنتے رہتے اور ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کرتے۔

ایک دن ایسی ہی محفل کے برخاست ہونے کے بعد میں نے اباجی سے پوچھ ہی لیا۔

''یہ ہٹلر ہمارا کون ہے؟ آپ سارا دن اس کی باتیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟'' میرے تجسس میں بلا کی معصومیت تھی۔ اباجی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی۔

''چچا لگتا ہے ہمارا۔'' انہوں نے ہنس کر مجھے ڈپٹا۔ میں نے بھی زیادہ پرواہ نہ کی۔

ہمارے تو اردگرد خوب امن و امان تھا۔ ہمارے شہر جالندھر میں سکھ، ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ ایک طرف ہندوؤں کا بھیرو والا بازار تھا۔ جس کے بیچ و بیچ ان کے ایک بھیرو بھگوان کی مورتی نصب تھی۔ ہندو عورتیں مورتی کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں حلوہ پوری کے چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔

مسلمانوں کا بازار قریب واقع ایک پنج پیر مزار (پانچ پیر بازار) کے نام پر رکھا گیا۔ ایک روز دادا ابا بازار جاتے ہوئے مجھے بھی پکڑ کر ساتھ لے گئے۔ وہاں ایسا ہجوم تھا گویا مفت منڈی لگی ہو۔ مجھ ننھی سی جان کے لیے یہ رش ہی بہت تھا۔

نہ جانے کس لمحے میری انگلی چھوٹ گئی۔ میرا دھیان بھٹکا اور میں دادا ابا سے دور ہو گئی۔ مجھے آج بھی دکانوں کے درمیان بنے ایک گھر کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنا زار و زار رونا یاد ہے۔

وہ گھر ہندوؤں کا تھا جو مجھے روتا دیکھ کر اندر لے گئے۔ میں اندر جا کر سڑک کے رخ کھلنے والی کھڑکی سے چپک کر بیٹھ گئی۔ میری میزبان تانبے کی تھالی میں مٹھائیاں سجا کر لے آئیں۔

''کڑیے چپ کر جا...... کج کھا لے۔'' (لڑکی چپ کر جاؤ کچھ کھا لو) میری رونی صورت دیکھ کر وہ سارا کنبہ میرے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ مگر مجھے نہ شیرا ٹپکاتی مٹھائیوں میں دلچسپی رہی تھی نہ ہی خستہ کراری کچوریاں مجھے گلی میں کھلتی کھڑکی سے دور کر سکیں۔

دادا ابا مجھے ڈھونڈ نہ سکے۔ بڑی دیر کوشش کر کے وہ واپس چلے گئے اور اباجی کو بھیجا۔ اباجی بازار کے بے ہنگم ہجوم میں گردن اٹھا اٹھا کر فکرمندی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ جب مجھے کھڑکی سے وہ نظر آئے۔

''وہ میرے اباجی ہیں۔ میرے اباجی آ گئے۔''

میں نے خوشی سے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ میں دوڑتے ہوئے اباجی کی طرف لپکی۔ اباجی نے میرے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور مجھے گھر واپس لائے۔

جس گھر میں، میں نے پناہ لی تھی وہ چھوٹا سا تھا۔ جبکہ ہمارا گھر اتنا بڑا تھا کہ تین چار نسلیں آباد تھیں۔ ان دنوں تمام محلّہ برادری والوں کا ہی ہوتا تھا اور گھر کا ماجرا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اباجی کے چچا تایا ان کے بچے سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ سب کے کمروں کے دروازے صحن میں کھلتے تھے۔ کس نے کیا ہانڈی پکائی، صحن میں موجود خوشبوؤں سے معلوم ہو جاتا تھا۔

دروازے کے قریب کونے والے کمرے میں عابدہ باجی رہتی تھیں۔ ان کے اباجی پولیس میں سپاہی تھے اور میرے ابا کی چچی نے انہیں منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔

عابدہ باجی ننھی سی تھیں کہ ماں باپ کی کسی بات پر ان بن ہو گئی۔ ماں ناراض ہو کر اپنے میکے ہوشیار پور چلی گئی۔ نو سال ان کے ابا نے اپنے کونے والے کمرے میں تنہا گزار دیے پھر کہیں جا کر صلح ہوئی اور بیوی بچی واپس گھر آئیں۔

عابدہ باجی تو بے حد حسین اور خوش مزاج تھیں۔ ہمارے ساتھ مل کر تاش کھیلا کرتیں تو ان کی ماں ڈانٹتیں کہ کیا اپنی ٹانگ جتنی لڑکیوں کے ساتھ شغل میلہ کرتی رہتی ہو۔ مگر عابدہ باجی ہماری پکی سہیلی تھیں۔ کسی کو بھی خاطر میں لائے بغیر ہمارے ساتھ خوب مستی کرتیں۔

☆☆☆

ایک روز میں گلی میں کھیل رہی تھی تو آٹا چکی والوں کی لڑکیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ چار لڑکیاں ٹولہ بنا کر کہیں جا رہی تھیں۔

''ہم بڑی کوٹھی سے پھول توڑنے جا رہے ہیں۔'' ایک لڑکی نے بتایا تو میں بھی ساتھ چل دی۔

ہم جالندھر کے مسلمانوں کے پاس جتنا بھی پیسہ ہو ہم سادہ رہن سہن ہی اپناتے تھے۔ اس لیے بڑی کوٹھی کے ٹھاٹھ میرے لیے بھی دیکھنے لائق تھے۔ کوٹھی کی مالکن کے بیٹا بہو انگلستان میں رہتے تھے۔ ان کے لان میں کرسی میز لگی تھی۔ باتھ روم میں پلاسٹک کے اسٹول نما کموڈ میں نے پہلی بار دیکھے۔ جس کو مہترانی صاف کر رہی تھی۔

ان کے لان میں لگے پودوں کی قطاروں میں مولسری کا درخت سب سے حسین لگ رہا تھا۔ وہ چھتری نما درخت ننھے پیلے سفید پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ ان پھولوں کی خوشبو بہت تیز تھی۔

اب بھی جو میں تنہا بیٹھ کر زندگی کی اس پہلی دہائی کو یاد کرتی ہوں تو لگتا ہے ہوا کے دوش پر جالندھر سے مولسری کے پھولوں کی خوشبو ایک بار پھر مجھے سلام کرنے آ پہنچی ہے۔

میں دوپٹے کا پلو پھولوں سے بھر کر گھر آ گئی اور گجرا پرونے لگی۔ ہر پھول ڈال کر عابدہ باجی کا اجلا چہرہ ذہن میں ابھرتا۔ مولسری کے پھولوں کا گجرا بالوں میں سجا کر ان کا معصوم چہرہ کتنا دمکے گا۔ یہ سوچ سوچ کر ہی میں خوش ہوتی جا رہی تھی۔ گجرا مکمل کر کے میں دونوں ہاتھوں پر سجائے عابدہ باجی کے کمرے کی طرف چلی تو صحن میں اباجی کی کوئی رشتہ دار آئی بیٹھی تھیں۔ اباجی نے وہیں روک کر کہا کہ گجرا مہمان کو دے دوں۔ مولسری کے پھول جیسے لمحہ بھر میں میرے ہاتھوں میں ہی مرجھا گئے۔ بڑی بے دلی سے میں نے گجرا مہمان خاتون کو دیا اور ادھر ہی منہ پھلا کر کونے میں پڑے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

وہ خاتون اپنے بیٹے کے لیے کوئی اچھا جوڑ ڈھونڈ رہی تھیں۔ میرا دل مچلا میں نے امی کے کان میں سرگوشی کی۔

''امی! ان سے کہیں عابدہ باجی دیکھ لیں۔''

''چل وہ سپاہی کی لڑکی کو کیوں بہو بنانے لگیں۔'' امی نے اتنی حقیقت شناسی سے کہا کہ میں حیران رہ گئی۔

طبقاتی فرق کا بھید پہلی بار مجھ پر کھلا تھا۔ میرا منہ کچھ مزید پھول گیا۔ مجھے تو لگا تھا کہ اتنی حسین عابدہ باجی کے لیے قطاریں لگیں گی۔ اس خیال میں کچھ سچ بھی تھا۔ عابدہ باجی کے ابھی سے بہت سے سوالی تھے۔

اگلے روز میں پھر بڑی کوٹھی گئی۔ اس بار مولسری کے پھولوں کا گجرا خاموشی سے بنا کر سیدھا عابدہ باجی کے پاس گئی۔

''ارے واہ تم نے۔ تو ستاروں کو بھی مات دے دی۔'' عابدہ باجی نے مٹھی میں پھولوں کو بھر کر خوشبو سونگھی۔

''ان کی قیمت ہی کیا ہے۔'' میں تعریف بٹورتے ہوئے شرمائی۔

''تم نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے پھول توڑے پھر میرے لیے پروئے۔ اس سے قیمتی اور کیا ہوگا۔'' وہ ایسی ہی تھیں۔ بولتیں تو دل خوش کر دیتی تھیں۔

''گھر کے ان کپڑوں میں تمہارا تحفہ ماند پڑ جائے گا۔'' انہوں نے بالوں میں گجرا لگا کر خود کو آئینے میں دیکھا اور بجھے ہوئے انداز میں کہا۔ میرا

دل بھی ڈوبا کہ ساری محنت اکارت گئی۔

''تم آٹا گوندھو، میں کپڑے بدل لیتی ہوں۔''

ایک نئے خیال سے ان کی آنکھیں روشن ہوئیں۔ چند منٹ بعد ہی وہ اپنی اماں کا پرانا سرخ جوڑا پہن کر ہنستی مسکراتی آئیں۔ عابدہ باجی کے کمرے کے ایک کونے میں ہی چولہا تھا۔ میں چولہے کے پاس بیٹھی آٹا گوندھتی رہی اور عابدہ باجی کی مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ انہوں نے دوبارہ بال کھول کر سنوارے اور چٹیا بنا کے گجرا سجایا۔ میرا سیروں خون بڑھ گیا اور میرے ہاتھ مزید تیزی سے چلتے رہے۔

''کیسی لگ رہی ہوں۔'' سرخی پاؤڈر کے بغیر ہی ان پر ڈھیروں روپ آیا تھا۔ میں تعریفیں کرنے لگی۔

''ارے تم نے تو لگتا ہے آٹے کا سارا ڈبہ ہی گوندھ ڈالا۔'' عابدہ باجی کی نظر پرات پر پڑی اور وہ ہنس دیں۔

''اتنا بڑا تو ہمارے گھر کوئی پیالہ بھی نہیں ہو گا۔'' ہنستے ہنستے ہی انہوں نے پرات پر کپڑا ڈال دیا۔ ''اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔'' انہوں نے مجھے غیر ضروری شرمندہ نہیں کیا۔

''لگتا ہے امی آ گئیں۔'' دروازے پر دستک ہوئی تو عابدہ باجی اپنے سنگھار سے بے خبر دروازہ کھولنے چلی گئیں۔

عابدہ باجی کی امی میری تائی کے ساتھ بازار تک گئی تھیں۔ ساتھ تائی جی کا بیٹا اجمل عرف اجی سامان اٹھائے آ رہا تھا۔ تائی جی کا مزاج عابدہ کے سرخ جوڑے کو دیکھتے ہی انگارہ ہو گیا۔

''تہمینہ! تمہاری بیٹی تو کنواری ہو کر ریشمی جوڑا پہنے بیٹھی ہے۔ اس کی شادی پر تو تمہیں بنارس سے کمخواب کے تھان منگوانے پڑیں گے۔'' کنواری لڑکیوں کا بننا سنورنا اس دور میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔

''وہ ایسے ہی پہن لیا تھا۔'' عابدہ باجی کے منہ سے باریک سی آواز نکلی۔

''ابھی سے اتنی چھوٹ دو گی تو آگے سوتی کپڑا اسے راس نہیں آئے گا۔ لگام ڈلواؤ اسے اگلے گھر جانا ہے۔ جب دیکھو بچیوں کی طرح قہقہے لگاتی پھرتی ہے۔'' وہ عابدہ باجی کے سامنے ہی بولنے لگیں۔

''ارے بھابھی! وہ کھیل کھیل میں پہن لیا ہو گا۔ میری عابدہ بہت صابر ہے۔''

''نظر آ رہا ہے، بالوں میں مہکتا گجرا اور لال ریشمی جوڑا۔ اسے صبر نہیں پر لگ جانا کہتے ہیں۔'' تائی امی کی کاٹ دار تنقید سن کر عابدہ باجی آہستہ سے وہاں سے پلٹ گئیں۔ کہیں ان کے سامنے آنسو چھلک کر ایک اور بے ادبی نہ کر دیں۔

میں عابدہ باجی کا اترا چہرا دیکھ کر رو دینے کو تھی۔ تائی امی اور خالہ تہمینہ اپنی باتوں میں لگے تھے۔ کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ اجی سامان کے تھیلے پکڑے جیسے آیا تھا ویسے ہی کھڑا تھا۔ اس نے ایک جملہ نہیں سنا تھا۔ اس کا ذہن تو عابدہ باجی کے سراپے سے ہٹا تک نہ تھا۔ یہ تو جب عابدہ باجی اپنے کمرے میں چلی گئیں تو اس کا طلسم ٹوٹا...... مگر جیسے آنکھ بھر کر دیدار وہ کر چکا تھا۔ اب اسے یہ منظر بھولنے والا نہیں تھا۔

''میری بچی کیوں دل برا کرتی ہو۔ بڑوں کی عادت ہوتی ہے یہ سب کہنے کی۔'' تہمینہ خالہ باہر کی محفل برخاست ہونے کے بعد اندر آئیں۔

عابدہ باجی نے گجرا ایسے کھینچ کر اتارا کہ مولسری کے پھول ان کی انگلیوں میں مسلے گئے تھے۔

''چل رونا بند کر، تیرے ابا دلی کے پاس لائے ہیں۔ کل تیری خالہ کے جانا ہے۔ خوش ہو جا۔'' عابدہ باجی کے ابا کی بطور سپاہی ان دنوں ریلوے میں ڈیوٹی تھی۔ اس لیے مفت پاس ملتے تھے۔

''میں نہیں جاؤں گی کہیں سب دوبارہ باتیں سنائیں گے۔'' بات بھی صحیح تھی۔ لڑکیوں کو ہر حال میں خوش رہنا بھی سکھاتے ہیں اور ان کی خوشی کسی

سے برداشت بھی نہیں ہوتی۔ مجھ سے عابدہ باجی کا اترا چہرہ مزید دیکھا نہ گیا اور میں وہیں پھوٹ پھوٹ کر کے رونے لگی۔

''اس کو لے جائیں امی دلی دیکھ لے گی۔ اس بے چاری کا دل ایسے ہی اچاٹ کیا۔'' عابدہ باجی میرے آنسو پونچھنے لگیں۔ میں کبھی روؤں کبھی آنکھیں پٹپٹاؤں۔ بس فیصلہ ہو گیا اور انہوں نے میرے ابا جی سے بھی اجازت لے لی۔ عابدہ باجی کی خالہ کا پچھلے دنوں مردہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ وہ پرانی دلی میں رہتی تھیں۔ میری بھی رشتے کی ایک ماسی نئی دلی میں تھیں۔

ابا جی نے کہا مجھے دو دن ماسی کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ ہم آج کے زمانے کے بچے نہ تھے کہ ماں کی گود سے ہی نہ اتریں۔ ہمارے وقتوں میں ہم چلنا سیکھتے تھے تو اماں کی گود میں اگلا بچہ آ جاتا تھا۔ ہم اپنا آپ خود سنبھالتے تھے۔

میں بھی خوشی خوشی ٹرین میں سوار ہوئی۔ بہت اچھا سفر گزرا۔ تہمینہ خالہ نے مجھے بھٹے لے دیے۔ میں سارا وقت ٹرین کی کھڑکی سے چلتی پھرتی ہریالی دیکھتی رہی۔ جیسے ہی ہم عابدہ باجی کی خالہ کی گلی میں پہنچے تہمینہ خالہ کو نہ جانے کیا ہو گیا۔

''ہائے میری بہن بے چاری، چھوٹی سی عمر میں اولاد کا غم آ گیا۔'' گلی میں قدم رکھتے ہی انہوں نے اونچی آواز میں بین کرنا شروع کر دیا۔ میں ڈر گئی۔ اچھی بھلی تو سفر سے آئی تھیں اب کیا ہو گیا۔ شاید وہ چاہتی تھیں پورے محلے کو معلوم ہو جائے کہ جالندھر سے بہن افسوس کرنے دلی آئی ہے۔

''خدایا! جب واپس لے لینا تھا تو آس کیوں بندھائی۔'' ہر جملے کے بعد وہ ایک ہی ٹون میں بین کی طرح روتیں تاکہ رونے اور جملوں میں توازن رہے۔

ہم فاصلے پر ہی تھے کہ خالہ جی کے گھر کے دروازے سے لوگ نکل کر استقبال کو پہنچ گئے۔ ساتھ ہی کئی محلے والے بھی نکل کر دیکھنے لگے کہ کس کو غم کھائے جا رہا ہے۔

میرا پوتا بتاتا ہے کہ آج کل لوگ فیس بک پر غم اور خوشی کا اعلان کرتے ہیں تاکہ سب دوست احباب جان لیں۔ مجھے سن کر تہمینہ خالہ یاد آ گئیں۔ میں مسکرائی۔ بے چارے بچے سمجھتے ہیں یہ تشہیر کا رواج ان کا ایجاد کردہ طریقہ ہے۔

☆☆☆

شام تک فارغ ہو کر ہم نیو دلی میری خالہ جی کی طرف گئے۔ خالو جیلر پولیس تھے۔ انہیں جیل کے ساتھ ہی گھر ملا ہوا تھا۔ صحن میں بیڑیوں میں جکڑے دو قیدی کیاریوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ قیدیوں کو کام کے ساتھ کھانے کے لیے چنے ملتے تھے۔ ان کے گھر میں چنوں کے ڈھیر لگے تھے۔ وہ دو دن میں نے خوب مٹھی بھر بھر کے چنے پھانکے۔ ہماری تو سیر تھی۔ ہم تفریح کرتے رہے۔

ہمارے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ پیچھے اجی عابدہ، باجی کے لیے کیسے جذبات رکھنے لگا ہے۔ اجی چھٹی فیل مگر برسر روزگار تھا۔ ریلوے اسٹیشن میں انجن صاف کرنے کی ڈیوٹی دیتا تھا۔ جب کام سے گھر آتا تو ہاتھ اور کپڑے تیل سے کالے چکنے ہوتے تھے۔ آتے ہی غسل خانے میں گھس کر صاف ہو کر نکلتا۔

عابدہ اپنی محدود حیثیت کے باوجود اس کی دسترس سے دور ہی تھی اور اسے اپنی ماں سے بھی کوئی امید نہ تھی کہ اس کی راہ ہموار کر دے گی۔ اس لیے اس نے انگلی ٹیڑھی کی اور خود ہی ایک عشق معشوقی سے بھرا خط لکھ کر عابدہ کے دروازے کے نیچے کھسکا دیا۔

یہ اس گھر کا واقعہ ہے جہاں رات کو سب مرد سانجھے صحن میں چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ وہاں اپنی ہی چار دیواری سے ایسا خط آنا عابدہ باجی کے لیے اپنا ہی گھر حد درجہ غیر محفوظ بنا گیا تھا۔ اجی قبولیت اور دھتکار دونوں صورتوں کے لیے تیار تھا، اس لیے خط ڈالتے ہی ایک نوکری کے لیے قسمت آزمانے دوستوں کے ساتھ میاں والی چلا گیا۔

عابدہ باجی ڈرتی ڈرتی میری امی کے پاس آئیں۔

"دیکھو خاموش رہنے میں ہزار بھلائیاں ہیں۔ چپ رہ کر دیکھو، یہ بلا خود بخود ٹل جائے گی۔" میری امی مصلحت پسند تھیں۔ عابدہ ان کی مان کر چپ کر کے بیٹھ گئیں۔

عابدہ کی امی کا مزاج میں پہلے بیان کر چکی ہوں۔ دلی سے واپس آ کر ان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو انہیں تربیت کے گر سکھانے والی تائی جی سے حساب برابر کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ الٹے قدموں ہی اپنے کمرے سے باہر آئیں اور صحن میں طوفان کھڑا کر دیا۔

"گھر کی بچیوں کو غلط نظر سے دیکھتا ہے۔ خدا کرے اس کو موت آئے۔" پہلا جملہ ہی سنگین بددعا سے شروع کیا تھا۔

"ارے میری معصوم بچی کے لیے تمہارا انجن دھونے والا لڑکا ہی رہ گیا تھا۔ میں تو علی گڑھ یونیورسٹی والوں کے بھی جوتے گھسواؤں گی۔" ان کا واویلا سن کر تائی جی بھی صحن میں آ گئیں۔

"ایسا کیا ہو گیا ہے؟" تائی جی کی اب تک ماجرا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"خط لکھا ہے تمہارے لڑکے نے کہ مولسری کے پھولوں سے مہکتا تمہارا چہرہ میری نظروں سے نہیں ہٹتا۔" خط بطور ثبوت تائی جی کو پکڑا کر انہوں نے پھر جھولی اٹھالی۔

"خدا غارت کرے اجی کو، جن غلط نگاہوں سے میری بچی کو دیکھا ہے، خدا کرے انہیں اجالا دیکھنا نصیب نہ ہو۔"

عابدہ باجی اور اجمل عرف اجی یہ دو نام آج سے پہلے کسی کے ذہن میں بھی ایک ساتھ نہیں ابھرتے تھے۔ مگر تہمینہ خالہ کے واویلے نے گھر کے مردوں کو بھی اکٹھا کر لیا۔ اپنی بے وقوفی میں انہوں نے یہ دو نام خود ہی ساتھ جوڑ دیے تھے۔ مردوں نے بیچ بچاؤ کروایا۔ ورنہ تہمینہ خالہ چپ ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔

جیسے تیسے وہ دن ٹلا۔ ٹھیک تین دن بعد ہمارے گھر رئیسہ بی بی کا آنا ہوا۔

☆☆☆

جنگ عظیم دوم کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اب تو ہمارے ہندوستان میں جنگ کی فضا تھی اور یہ جنگ فوجوں کی نہیں ہمسائیوں کی ہوتی تھی۔ سکھوں کے نکڑ والے کریانہ اسٹور سے ہم سالوں سے سودا لیتے آئے تھے۔ مگر اب ان سے خوف آتا تھا۔

محلے کی سمجھ دار لڑکیاں گلی میں کھڑی ہو کر عورتوں کے حوصلے بندھواتی تھیں کہ مرد نہ بھی ہوں تو ہم عورتیں اپنا دفاع کریں گی۔ اینٹیں مار مار کر حملہ آوروں کو بھگا دیں گی۔ میں بہت جوش سے تمام تعریفیں سنتی اور گھر آ کر بتاتی۔

"تمہیں اتنا شوق ہے تو اپنا زیور تھیلے میں ڈال کر پاکستان بھیج دو۔ حکومتیں تو آتی جاتی ہیں۔ کوئی اپنا گھر نہیں چھوڑتا۔"

ابا جی کی بھی وہی سوچ تھی جو لاکھوں مسلمانوں کی تھی۔ اول تو وہ اس خوش فہمی میں تھے کہ جالندھر پاکستان میں ہوگا۔ بصورت دیگر وہ اقلیت بن کر یہیں رہنے پر آمادہ تھے۔ اپنا گھر چھوڑنے کا خیال ہی جان نکال دیتا ہے اور ایسے خیال کو کوئی خوشی سے نہیں سوچتا۔ لیکن پھر اسی جان کے لالے پڑ جائیں تو اپنے گھر چھوڑنے بھی پڑتے ہیں۔

خط والے واقعہ کے چوتھے دن دور کی ایک جاننے والی رئیسہ بیگم کا گھر آنا ہوا۔ ان کے ہاتھ میں پوسٹ کارڈ تھا۔ ان کا بیٹا بھی اجی کے ساتھ ہی میانوالی گیا تھا۔ وہاں سے وہ لوگ تفریح کے لیے قریب کسی نہر میں نہانے چلے گئے تھے۔ پوسٹ کارڈ میں لکھا تھا کہ نہاتے ہوئے اجی ڈوب کر مر گیا ہے۔

"تمہاری زبان ٹوٹے میرے بچے کے بارے میں ایسی بات کرتی ہو۔" تائی جی سنتے ہی آپے سے باہر ہونے لگیں۔

"بہن میں تو پیغام لائی ہوں۔ نہ جانے کس جتن سے میرے بیٹے نے چار سطریں بھجوائی ہیں کہ تم لوگوں تک خبر پہنچ جائے۔" رئیسہ بیگم برا مان گئیں۔

تائی جی کو غشی آنے لگی۔ گھر کے مرد ریلوے کے بڑے افسر کے گھر دوڑے۔ جب تک خبر کی تصدیق نہ ہوئی سب عورتیں سر لپیٹے دعا کرتی رہیں کہ

خبر غلط ہو مگر خبر سچی تھی۔ نہ جانے کون سا لمحہ قبولیت کا ہوتا ہے۔ منہ سے لفظ نکالنے سے پہلے لمحہ بھر کو سوچ لینا چاہیے۔ تہمینہ خالہ کی بد دعا نے بھی اپنا اثر دکھا دیا تھا۔

☆☆☆

سارے گھر میں ماتم کی فضا تھی۔ والدین بیٹے کا چہرہ دیکھ کر لحد میں اتارتے تو شاید صبر کی کوئی صورت حال بن جاتی۔ اب تو بے قراری اور بے یقینی تھی۔ صحن میں چادریں بچھ گئیں۔ محلے کی عورتیں افسوس کرنے آنے لگیں۔ خالہ تہمینہ کی ہمت نہ ہوئی کہ اپنے کمرے سے قدم نکالیں۔ اپنی دی ہوئی ایک ایک بد دعا انہیں یاد آ رہی تھی۔

کیا لفظوں کی یوں بھی پکڑ ہوتی ہے، وہ خود ہی دہل گئیں۔ بڑی ہمت کر کے دروازہ کھولا اور صحن کے تھڑے پر دور آ بیٹھیں۔ تائی جی تو غم میں تھیں۔ مگر باقی زبانیں کھلی تھیں جن کو مواد تہمینہ خالہ نے خود ہی دیا تھا۔

''یہ سب تہمینہ خالہ کی بد دعا کا اثر ہے۔ ان کی عابدہ کو خط کیا لکھ دیا انہوں نے ایسی بد دعائیں دیں۔ ہماری اجی کو نگل ہی گئیں۔'' دوپٹے میں سسکتی ہوئی اجی کی بھابھی بولیں۔

''ارے کیسا خط؟'' کسی محلے دارنی نے پوچھا۔ اس کے بعد خط کے متن کے چرچے ہونے لگے۔

''ارے سن رہی ہو عابدہ اور اجی کی خط و کتابت چل رہی تھی۔'' ایک اونچا سننے والی خاتون نے صحن کے ایک کونے سے کچھ سنا، سمجھا کچھ اور دوسرے کونے میں آ کر کچھ اور ہی قصہ نشر کر دیا۔

''لگتی تو بڑی سیدھی سادی ہے۔ اچھی صورت مل جائے تو ہتھے سے اکھڑ جاتی ہیں۔'' سننے والیوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''مولسری کے پھول لا لا کر دیتا تھا اور وہ گجرے بنا بنا کر پہنتی تھی۔'' زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ وہ چلتی رہیں اور ایک خط کی داستان بنا گئیں۔

''بات صرف خط تک نہیں ہو گی جو ماں نے جھولی اٹھا اٹھا کر مرنے کی بد دعائیں دے ڈالیں۔ کیا خبر اجی نے محبت میں آ کر خود ہی جان دی ہو۔'' جنازہ تو تھا نہیں جس کے احترام میں سب چپ رہتے، اس لیے سورج ڈھلتے تک بولنے والے بولتے رہے اور سننے والے سنتے رہے۔ اس روز بڑھ چڑھ کر بولنے والی تہمینہ خالہ کو چپ لگ گئی تھی۔ ساری برادری کی سرگوشیاں ان تک پہنچ چکی تھیں۔

''سرگوشیاں سننے والوں میں ایک لڑکے کی ماں بھی تھی جو پچھلے رمضان عابدہ کو دوپٹا دے کر گئی تھیں اور چاہتی تھیں کہ عابدہ ان کی بہو بنے۔ ایک محلے کا لڑکا عرفان ہر جمعہ تہمینہ خالہ کو سلام کرنے آتا تھا۔ نیت صاف تھی۔ وہ بھی عابدہ کے رشتے کا خواہش مند تھا۔ اس کی بہن بھی اس محفل میں بیٹھی تھی۔ تہمینہ خالہ چاہتی تھیں کوئی بہتر دو کمروں کا ہی گھر مل جائے۔ تاکہ کچھ عزت سے بیٹی کو رخصت کریں مگر آج کی محفل کے بعد وہ کوٹھی میں بھی چاہتے تو یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اس روز جنازہ نہیں اٹھا تھا مگر کئی لوگوں کو وہ سورج جیتے جی مار گیا تھا۔

☆☆☆

اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ کتنے دن گزرے تھے۔ بس یونہی لگتا ہے کہ اجی کی موت اور عابدہ باجی کی بدنامی کے فوراً بعد پاکستان کا اعلان ہو گیا۔ قتل و غارت شروع ہو گئی۔ گھروں سے نکلنا بند ہو گیا۔ مسلمانوں کی دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔

خدا کا احسان تھا کہ میرے دو بڑے تایا پولیس میں تھے۔ پھر عابدہ کے ابا جی بھی سپاہی تھے۔ ہمارے گھر کی دھاک تھی کہ ان کے پاس اسلحہ ہوتا ہے۔ اس لیے کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ ہماری دہلیز پار کرتا۔ مگر جہاں عزت اور جان محفوظ نہ ہو وہ دہلیز اپنی نہیں رہتی۔

ہم بھی راتوں رات گھروں سے نکلے۔ مولسری کے درخت والی کوٹھی کے تمام مکین انگلستان گئے ہوئے تھے۔ وہ گھر سونا پڑا تھا۔ ہم سب نے رات ادھر پناہ لی۔ ساری رات لاشوں کی بدبو اور مولسری کے پھولوں کی مہک کی جنگ ہوتی رہی۔

اجالے سے کچھ پہلے ہم نکلے تو مولسری کے پھول

درخت سے جھڑنے لگے۔ یوں لگا جیسے فرش پر سفید قالین بچھ رہا ہو۔ اپنے تمام حسن کے باوجود وہ دیس پرایا ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم سب چھوڑ چھاڑ پاکستان چلے گئے۔ لیکن سب پیچھے نہیں رہتا، بدقسمتی سے عابدہ باجی کی بدنامی ان کے ساتھ ہی سرحد پار کر گئی تھی۔

☆☆☆

پاکستان آ کر جن لوگوں کی قسمت چمکی ان میں ایک عابدہ باجی کے ابو بھی تھے۔ انہیں کلیم میں تین کمرے کا اچھا مکان مل گیا۔ انہوں نے پولیس کی نوکری چھوڑ کر کاروبار کر لیا۔ بیٹے اچھے اسکول میں جانے لگے۔ بس لوگوں کی یادداشت پر اثر نہیں ہوا۔ عابدہ باجی کو سترہواں سال لگ گیا خاندان سے کوئی رشتہ نہیں آیا۔ اب وہ بات بات پر ہنسنا بھول گئی تھیں۔

سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتیں۔ انہوں نے محفلوں میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کو لگتا تھا انہوں نے جوگ پال لیا ہے۔ ان کی وہ شوخی مولسری کے پھولوں کی طرح قصہ پارینہ ہو گئی تھی۔

تہمینہ خالہ ہر ملنے ملانے والے کے سامنے دکھڑا روتیں۔ نئے محلے والوں کو کھانے پکا کر بھجواتیں تاکہ تعلقات بنیں۔ وہ قصہ جس کا کبھی وجود ہی نہیں تھا، زبانوں کی مسافت میں ایسا مشہور ہوا کہ پتھر کی لکیر بن گیا۔

کئی سوالی جھولی پھیلائے آئے مگر بات بننے سے پہلے ہی انہیں خط والے واقعہ کا علم ہو جاتا اور وہ ایسے رفوچکر ہوتے کہ پھر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے۔ ایک تماشہ تہمینہ خالہ نے ذاتی وجوہات کی بنا پر اس روز لگایا تھا۔ جواب تک نہ چاہتے ہوئے بھی لگا ہوا تھا اور تماشائی تالیاں پیٹ رہے تھے۔

☆☆☆

امی کی بڑی بہن محمودہ بہت تیز تھی اور دوسری مجیدہ اتنی سیدھی گویا مٹی کا بت ہو۔ ایک روز مجیدہ کو ماں نے آٹا دے کر تندور بھیجا۔ وہ رش سے گھبرا کر وہیں کونے میں بیٹھی رہی۔ جب گھنٹے تک واپس نہ ہوئی تو ماں نے لڑکے کو پیچھے دوڑایا۔ کیا دیکھتا ہے بہن گھنٹہ بھر سے کونے میں خاموش بیٹھی ہے۔ آگے ہو کر کسی کو کہتی تو روٹی لگاتا۔

محمودہ کے بعد اس مٹی کے بت مجیدہ کی بھی ڈولی اٹھ گئی۔ وہ شادی کے بعد بھی نہ بدلی۔ ننھی بھولی بچیوں کی طرح زندگی گزارنے لگی۔ ایک روز سسرال میں کوئی مہمان آ گیا تو مجیدہ کے شوہر نے مہمان کے ساتھ صحن میں بستر ڈال لیا تاکہ میزبانی کا فرض ادا ہوتا رہے۔ مجیدہ کمرے کے دروازے میں کھڑی زار و زار رونے لگی۔ جیسے شوہر سرحد پار جا رہا ہو۔ ننھی دلہن چپ نہ ہو سکی تو شوہر مہمان سے معذرت کرتے ہوئے چارپائی واپس کمرے میں لے گیا۔ مہمان ساری رات لحاف میں منہ دیے ہنستا رہا۔

جو بھی اونچ نیچ تھی۔ دونوں بیٹیاں اپنے گھروں میں بس رہی تھیں۔ تائی امی کے دل کو قرار تھا۔ اس لیے ایک روز ملاقات ہونے پر میری امی نے سمجھایا۔

"اب تہمینہ سے بھی دل صاف کر لو۔ ہیرا بیٹی ہے اس کی جو باپ کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے کوئلہ ہو رہی ہے۔ بچوں کے غم سانجھے ہی ہوتے ہیں۔"

"میں نے تو کوئی فساد نہیں کیا۔ اس کی اپنی کرنی آگے آئی ہے۔ سالوں سے ایک چوکھٹ تھی۔ ہماری بچے نے غلطی کی تھی تو چپل اتار کر بے شک سر گنجا کر دیتی مگر اس نے تو ایسی بڑی بڑی بددعائیں دیں کہ میں اس کی زبان تک نہ پکڑ سکی۔ میں تو اس حیرت میں رہ گئی کہ تہمینہ میرے بچے کے لیے دل میں اتنا کینہ بھی رکھ سکتی ہے۔" نہر امی کی لاش اگل دیتی تو پانی سے پھولا جسم دیکھ کر ماں کا خود دل چاہتا کہ بچے کو قبر میں اتار دے تاکہ اسے سکون آئے۔ مگر یہاں ماں کو جب بھی یاد آتی تھی تصور میں بچے کا اجلا چہرہ ابھرتا تھا اور ہر بار آنکھیں بھگو جاتا تھا۔

"بہت بھگت لیا اس نے اپنے لفظوں کا انجام اس کی ہر بددعا نے پلٹ کر اس کو بھی حصار میں لے لیا ہے۔ امی تو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے کے پاس ہے۔ یہ ہی سوچ کر اس کو معاف کر دو۔"

امی جیسا مصلحت پسند میں نے بہت کم دیکھا تھا۔

"کہہ تو رہی ہوں۔ میرے دل میں اپنے بچے کے غم کے سوا کچھ نہیں ہے۔" تائی جی نے دوٹوک کہا۔

یہاں معاملہ دل صاف کرنے کا تھا جس میں دل کی اپنی بھی نہیں چلتی اس لیے امی خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

جالندھر کی سادگی وہ دال تھی جو لاہور میں نہیں گلتی تھی۔ جالندھر میں تو راشن کارڈ پر ملے کپڑے ہی پہن کر دعوتیں بھگتا لی جاتی تھیں۔ مگر اس دور کے لاہور میں آج کل کی طرح ہر فنکشن پر نیا جوڑا اپنانے کا رواج بھی نہیں تھا۔ اس لیے ایک جوڑا جب تک ناپ آتا رہتا چلتا رہتا۔

برادری میں ایک شادی تھی۔ تہمینہ خالہ اپنا ویلوٹ کا ایک سوٹ نکال کر ادھیڑنے لگیں۔ عابدہ باجی بھی ماں کا ہاتھ بٹانے آ گئیں تو قمیص کا ناکافی دباؤ دیکھا۔

"امی یہ تو کھل کر بھی آپ کے ناپ نہیں آئے گا۔"

"بچی میں اپنے لیے تھوڑی کھول رہی ہوں۔ اس کی تو میں تمہارے لیے کوئی (shrug) بناؤں گی۔ نیا فیشن آیا ہے۔" ماں کی آنکھوں میں آس کی جوت تھی۔ عابدہ باجی مرجھا کر رہ گئیں۔

"میں کسی شادی پر نہیں جاؤں گی۔ سب مجھے اجی کی بیوہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔" وہ پلٹ کر بولیں۔

"کھال ادھیڑ دوں گی جو زبان چلائی۔" خالہ نے عابدہ باجی کی کمر پر تھپڑ جڑ دیا۔

"تمہاری روتی صورت دیکھ کر ہی لوگوں کو باتوں کا موقع ملتا ہے۔ کان سے پکڑ کر لے جاؤں گی تمہیں اور خبردار تمہارے چہرے پر لوگوں کی باتوں کی پرچھائی بھی آئی تو کسی بھی لولے لنگڑے کے ساتھ پکڑ کر چلتا کر دوں گی۔" عابدہ باجی ماں کے لفظوں پر منہ بسور کر بیٹھ گئیں۔ مگر اب ضبط دونوں کا ختم ہو گیا تھا۔

کچھ دیر کو تہمینہ خالہ بازار تک گئیں تو عابدہ باجی نے سارا انتقام ویلوٹ کی قمیص سے لینے کی ٹھانی اور دیا سلائی اٹھا لائی۔ ایک دو تیلیاں جلائیں مگر قمیص کو آگ دکھانے کی ہمت نہ پڑی۔ تیسری تیلی پورے ارادے سے جلائی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ انہیں لگا خالہ واپس آ گئی ہیں۔ جلدی سے دیا سلائی چارپائی کے سرہانے میں چھپا دی۔ دروازہ اس بار زور سے بجا تو عابدہ باجی ایسے ہی گھبرائی گھبرائی دروازے تک پہنچیں اور بنا پوچھے ہی دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک روشن ماتھے والا نوجوان کھڑا تھا۔

"کون؟" باجی نے اوڑھنی لیتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں بابر! آپ کی والدہ ہیں؟" وہ ان کے گھر پہلی بار آیا تھا۔ کسی کا نام تک نہیں جانتا تھا۔

"بازار تک گئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آئیں گی۔ معافی چاہتی ہوں گھر میں کوئی نہیں ہے ورنہ آپ کو ضرور بٹھاتی۔" عابدہ باجی نے ثبوت کے طور پر اندر چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور مڑ کر دیکھا۔

"ہائے میں مر گئی۔" چارپائی پر آگ لگی ہوئی تھی۔ شاید انہوں نے جلتی تیلی ہی چھپا دی تھی۔

وہ سرپٹ اندر کی طرف دوڑیں اور کچن سے پیالا بھر کر لائیں۔ ہنگامی صورت حال دیکھ کر بابر بھی اندر کی طرف لپکا۔

"اتنے سے پانی سے نہیں ہو گا۔ زیادہ لائیے۔" اس نے چارپائی کھینچی اور صحن کے وسط میں کی۔ غسل خانے میں بھری بالٹی موجود تھی۔ عابدہ باجی نزاکت سے لا رہی تھیں تو بابر خود ہی ان تک پہنچا اور طاقت ور بازوؤں سے بھری بالٹی چارپائی پر الٹ دی۔ عابدہ باجی منہ پر ہاتھ رکھے بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ چارپائی کا سرہانے والا حصہ ستیاناس ہو چکا تھا۔ پانی اور راکھ فرش پر گری تھی۔ مگر ویلوٹ کا وہ سوٹ چارپائی کی پائنتی پر غسل کے بعد آرام سے موجود تھا۔ عابدہ باجی نے سر پکڑا۔

"امی میری جان نکال دیں گی۔" بے ساختگی میں ان کے منہ سے نکلا۔ بابر انہیں دیکھنے لگا۔

"شکریہ آپ کا اب آپ جا سکتے ہیں۔" انہوں نے کچھ بگڑ کر مہمان کو حکم دیا۔

"جی میرا کام تو ہو ہی گیا۔" بابر مسکراتے ہوئے جانے لگا۔ عابدہ باجی کو یہ انداز کچھ عجیب لگا۔

''امی آئیں تو کیا کہوں، کون آیا تھا؟'' سوال کے در پردہ ان کا اپنا تجسس تھا۔

''انہیں کہیے گا۔ پچھلی گلی والی رخسانہ نے اپنے بھتیجے کو بھیجا تھا۔ لڑکا ٹکسال میں بہت اچھی نوکری پر ہے۔ وہ آپ کی امی کی بیٹی کو کسی دن دیکھنے کے لیے آنا چاہتی ہیں۔'' اس نے بغیر مڑے کہا اور عابدہ باجی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

''ویسے اگر ہو سکے تو یہ پیغام چارپائی ٹھیک ہونے کے بعد دیجیے گا۔ چارپائی جلنے کا قصہ ممکن ہے میری امی کو پسند نہ آئے۔'' وہ تو ہنسی دبا کر نکل گیا۔ عابدہ باجی کو کتنی دیر ہوش ہی نہ آیا کہ کنڈا ہی لگا لیں۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے بابر کی آمد کا عابدہ باجی نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ جب کشتی کے بیچ منجدھار میں ڈوب جانے کا یقین ہو تو دریا میں نہیں اترا جاتا۔ مگر ان کا مقابل بابر تھا جو طوفانوں سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس نے ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا۔

''بیٹی دیتے ہوئے انسان سو جگہ سے تسلی کرتا ہے تو بہو لاتے ہوئے بھی ہزار لوگوں سے پوچھنا چاہیے۔ کیونکہ اس لڑکی سے نسل چلنی ہوتی ہے۔'' رخسانہ نے جیسے ہی معلومات کروائیں تو کئی قصے ابھرے۔ انہوں نے عقل کی اور سیدھا میری تائی کے پاس ہی آ گئیں۔

''ادھر ادھر والوں کی میں نے بہت سن لیں۔ لیکن یقین اس پر کروں گی جو آپ کہیں گی۔'' وہ ان عورتوں میں سے تھیں جو چار دیواری میں رہ کر زمانہ پرکھنا سیکھ لیتی ہیں۔

تائی جی کو عرصے بعد بیٹے کی موت پر دل ٹھنڈا کرنے کا موقع ملا تھا۔ انہیں جالندھر میں واویلا کرتی تہمینہ یاد آئی جو جھولی اٹھا اٹھا کر ان کے اجی کی موت مانگ رہی تھی۔

''لڑکا بہت اچھا نیک شریف ہے، اس کی ماں میرے گھر آئی بیٹھی ہے۔ بیٹے کی بات پکی کر کے ہی گاؤں جائے گی اور اگلی بار بارات لے کر آئے گی۔ بہت سادہ عورت ہے جو میں کہوں گی وہ مان لے گی۔

اس لیے میری بھی ذمہ داری ہے، میں کوئی ایسا مشورہ نہیں دے سکتی جو مجھے ان سے بعد میں شرمندہ رکھے۔''

قسمت کے بھی اپنے ہی کھیل تھے۔ وہ چال جس سے ساری بازی پلٹنی تھی تائی جی کے حصے میں آئی تھی اور وہ ہوشیاری سے اپنے مہرے گن رہی تھیں۔

''اس بچی کی پاک دامنی کی میں گواہ ہوں۔ آپ بسم اللہ کریں۔'' انہوں نے رخسانہ کی خوب تسلی کروا دی۔ وہ دل جس میں تہمینہ کے لیے شکوہ تھا۔ اس دل میں آج عابدہ کو خوشیوں کی دعا دے کر ٹھنڈی سی چڑ گئی۔ جب کسی دوسرے کو دعا دی جاتی ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ یہ عمل عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

''تہمینہ ایک بددعا تم نے دی تھی جس کی تاثیر ہم سب نے دیکھی۔ آج بدلے میں ایک دعا میں دوں گی۔ اس کا اثر بھی دنیا دیکھے گی۔'' تائی جی کی اس ہی دعا نے عابدہ باجی کی قسمت پھر سے جگا دی۔

☆☆☆

عابدہ باجی نے دونوں ہتھیلیوں پر پاؤڈر ڈال کر مسلا اور منہ پر لگا لیا۔ سرخی کاجل بھی سجایا۔ مگر ان کا اصل سنگھار تو ان کی مسکراہٹ تھی جس نے ان کے شوہر کو ان کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ وہ سارے سنگھار جو شادی سے پہلے انہیں منع تھے اب ٹکسال کے افسر کی بیوی کے طور پر باقاعدگی سے کرتی تھیں۔ بابر بھائی کو سرکاری گھر ملا ہوا تھا۔ جہاں گاؤں سے ان کے عزیز آتے رہتے تھے۔ عابدہ باجی ویسے ہی رونق پسند تھیں۔ خوب آؤ بھگت کرتیں۔

خوش باش لوگوں کی باتیں کر کے لوگوں کے جگر ٹھنڈے نہیں ہوتے۔ اس لیے عابدہ باجی کے پرانے قصے بھی لوگوں کی یادوں سے فنا ہونے لگے۔ تہمینہ خالہ اور تائی جی نے بھی دوبارہ ملنا شروع کر دیا۔ وہ دوریاں جو سرحد پار بنی تھیں۔ سرحد عبور کرنے کے بعد نئی آب و ہوا میں پھر سے سمٹ گئیں۔





فرزانہ کھرل

پھول منڈی

مکمل ناول

دس سال کی بچی گہری نیند سو رہی ہے۔ اس کی ماں اس کے پاس آ کر کہتی ہے کہ اس کی نانی تکلیف میں ہے۔ اسے جانا پڑے گا۔ وہ بچی ماں کے جانے کے بعد باہر سے آنے والی آوازوں سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ دو پہری بلا اس کے کمرے میں گھس آئی ہے۔

مصباح علی ایک خفیہ معاملہ حل کرنے کے لیے طلحہ کے ساتھ گھر سے نکلتی ہے۔ اس مزدا کو تلاش کرتی جو پھول سپلائی کرتا ہے اور جس کا مالک اس وقت مزدا میں موجود ہوتا ہے۔ مصباح مزدا میں گھس کر اس سے قاضی کے بارے میں پوچھتی ہے اور اسے دھمکاتی ہے۔ وہ اس کی جانب اپنا کارڈ پھینکتا ہے تاکہ وہ اس سے رابطہ کرے۔

مصباح جس محلے میں رہتی ہے اس کے پچھلی طرف "پھول منڈی" کے نام سے ایک علاقہ آباد ہے جو مصباح کے محلے کے لوگوں کی نظر میں گناہ گار اور جہنمی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے علاقے کے معزز لوگ پھول منڈی کی معصوم بچیوں کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے اور بظاہر بہت مہذب بن کر ان پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ مصباح اس دوغلے پن پر ہر وقت جلتی کلستی رہتی ہے۔



URDU TUBE
www.urdutubes.com

گوشی، جگنو کی ماں ہے، جگنو گھر سے بھاگ چکی ہے اور جگنو کا سوتیلا باپ اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔ ہر روز گوشی کو مار کر گھر سے نکال دیتا ہے اور مصباح کا باپ گوشی پر طنز کے تیر برساتا ہے۔
مصباح، سالم سے اس کے ــــ کیفے ٹیریا میں ملتی ہے۔ پہلی بار کے بعد وہ اسے دیکھتے ہی وہاں سے غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنے دوست کے کہنے پر وہ اس سے ملتا ہے۔
طلحہ اور فارہ ایک دوسرے کی خاموش محبت میں مبتلا ہیں۔ طلحہ کا باپ ایک اچھی نوکری پر فائز تھا لیکن جھوٹے الزام پر اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ گھر کے حالات خراب ہوئے تو طلحہ کی ماں نے صبر کرنے کے بجائے اپنے شوہر کو طعنے دے دے کر گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ طلحہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اپنی پان کی دکان چلاتا ہے۔
ہنی پھول منڈی میں رہتی ہے اور بری طرح طلحہ پر عاشق ہے۔ سالم قاضی اور جگنو کے معاملے میں مصباح کی بات نہیں مانتا۔ ایک روز اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر دھک ــــ رہ جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

دوسری اور آخری قسط

اس نے اخبار کے اندرونی صفحے پہ ایک حاشیہ لگی خبر پڑھی۔ وہ خبر پڑھنے کے بعد اس نے رب نواز کو یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو، کیا اس کا ملازم اسے نہیں جانتا تھا کہ کسی بھی دوسرے تیسرے کے معاملے میں اس کی دلچسپی صفر برابر تھی۔ رب نواز کی نگاہ اپنے صاحب کی تیکھی اور سرد نگاہ سے ملی، وہ صاحب کے چہرے سے کچھ بھی اخذ نہیں کر سکا، یہ تک نہیں کہ وہ خبر پڑھنے کے بعد سالم امین کس بے یقینی یا پھر پریشانی سے دوچار تھا۔ رب نواز کو یہ گمان گزرا کہ ابھی وہ چائے کا کپ میز پہ پٹخ کر اپنے مخصوص غصیلے انداز میں اس کی کلاس لیتا ہوا دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد استہزاء سے ہنستا اس کے الفاظ اس کے منہ پر بمعہ اخبار مارے گا۔

"صاحب! اس لڑکی کے باپ نے کبھی تھانے کچہری کی شکل تک نہیں دیکھی ہوگی پھر کیسی رپورٹ اور کہاں کا کیس۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چند روز قبل تم نے مجھ سے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔ اگر تمہاری معلومات میں جھول نہیں تھا تو پھر اخبار میں یہ اشتہار کس الو کے پٹھے نے دیا ہے۔"

"بارہ دنوں سے گمشدہ جگنو نامی اس لڑکی کے بارے میں کوئی بھی خبر یا اطلاع اپنے قریبی پولیس اسٹیشن یا کسی بھی نیوز چینل پہ دے کر ایک لاکھ وصول کر سکتے ہیں۔"

لیکن رب نواز اس تصوراتی صورت حال کا منتظر ہی رہا...... اور ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی تو صاحب کے چہرے پہ اک گہرا سکوت چھایا دیکھا...... سالم نا چاہتے ہوئے بھی اپنی سوچوں کو اس مسئلے کی حد بندی میں گھسنے سے روک نہیں پایا تو خیالات کو بے لگام چھوڑ دیا۔

ایک طرف وہ مصباح نامی لڑکی نہایت رازداری کے ساتھ ان دونوں کو پاتال کی گہرائیوں سے نکال کر اپنے روبرو لانا چاہتی تھی تو دوسری طرف اس کا سوتیلا باپ چاہتا تھا کہ پورا زمانہ جگنو کو ہانکتا ہوا اس کے روبرو لائے۔ جبکہ سالم، قاضی اور اس لڑکی دونوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس لیے کل رات اس نے مصباح سے نرم الفاظ میں درخواست کی تھی کہ اگر مجھے اس تمام معاملے سے دور رکھا جائے تو تاعمر آپ کا شکر گزار رہوں گا اور اس وقت اپنے پرتعیش لاؤنج میں ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اس نے اپنے سامنے پھیلے اخبار کو یوں پرے کیا کہ

مجھے اس خبر سے کچھ لینا دینا نہیں......اس نے نہایت سکون کے ساتھ چائے کا کپ اٹھایا......اور ساتھ ہی رب نواز پہ ایک ترچھی نگاہ ڈالی۔

"کوئی بات نہیں لاکھوں کی اس آبادی میں یہ نام ہزاروں لڑکیوں کا ہوگا کیونکہ تم ہی نے کہا تھا کہ قاضی کا سسر تھانے کچہری سے تکلف برتتا ہے۔" لاپروائی سے یہ بات کرتا وہ سیدھا ہوا۔ رب نواز کی پیشانی عرق آلود ہوئی کہ صاحب کا ردعمل ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ظاہر ہوا تھا۔ کسی بھی فرد پہ شک وشبے سے بالاتر وہ رپورٹ جگنو کو محض گمشدہ ظاہر کر رہی تھی اور یہی بات سالم کے لیے اطمینان بخش تھی۔

"مجھے سرمد اور شمسو نے بتایا ہے کہ یہی لڑکی قاضی کے ساتھ یہاں کئی بار آ چکی ہے۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد......رب نواز قدرے ہچکچاتے ہوئے، اخبار پہ چھپی جگنو کی تصویر پہ انگلی رکھ کے حد درجہ سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا...... سالم کی گرفت چائے کے کپ پہ ڈھیلی پڑی اور......تڑ......تڑا......تڑ...... کچھ تڑخا......وہ اس بندے کا سکون تھا۔ وہ بھول گیا کہ وہ چائے پی رہا تھا، وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کس قدر مطمئن تھا۔

☆☆☆

آج کے دن کا سورج اس کے ساتھ شرط لگا کے طلوع ہوا تھا کہ اس لڑکی کو وقت غروب تک ہر اچھی خبر سے محروم رکھنا ہے۔ رات سے اس کے چہرے پہ چھایا تناؤ......آج کے اخبار میں چھپنے والی خبر پڑھ کے کچھ اور توانا ہو چکا تھا۔ دوپہر کو فارہ اس

کے گھر آئی تو اس کے پاس بھی کئی خبریں تھیں سو اس کا تمام دن ذہنی اذیت اور اداسی میں ہی گزرا...... اور آج کا سورج ذرا سا سر اٹھاتے چاند کو تاکید کر کے ڈوبا تھا کہ جسے میں نے دن بھر چین سے محروم رکھا ہے بالکل ایسے ہی تم نے اسے رات بھر نیند سے محروم رکھنا ہے۔ اس لیے چاند نے جب اپنی مکمل

ہیئت کے ساتھ مصباح کے آنگن میں جھانکا تو مصباح کی ماں فون پہ اپنی جٹھانی سے راز و نیاز کر رہی تھیں۔

دوسری جانب کی بات سنتے ہوئے ان کے چہرے کے تاثرات پل پل بدل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ فون بند کر کے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئیں اب ان کا رخ اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف تھا۔ اندر کمرے میں بیڈ سائیڈ پہ کھڑی مصباح نے ہلکے سے کھٹکے پہ گھوم کے دیکھا۔ اس کی ماں دروازے میں کھڑی تھی۔ ماں نے اس کے ہاتھ میں موجود اس سیزن کا سب سے قیمتی اور دیدہ زیب سوٹ دیکھا، جو شاید کل رات سے بیڈ پہ پڑا تھا اور اب یقیناً مصباح اسے الماری میں ٹھونسنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے ماں کو اپنے قریب آتے دیکھا، قریب آ کر وہ چند لمحے بیٹی کا مغموم چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر آہستہ سے وہ سوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"میں اسے استری کروا کے ہینگ کروا دوں گی پرسوں یہی سوٹ پہن لینا۔" وہ مسکرائیں تو مصباح نے انہیں غائب دماغی سے دیکھا......اس کی دوسری نگاہ بے ساختہ آئینے کی طرف اٹھی۔ اس نے خود کو دیکھا، بھاری پپوٹے ستا چہرہ۔

"پرسوں ذرا ڈھنگ سے تیار ہونا۔" اس نے چونک کے اپنی ماں کو بیڈ کی چادر درست کرتے دیکھا۔ پھر اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ موجود وہ اشیاء دیکھیں جو اس نے دو دن قبل خریدی تھیں، قیمتی کلچ، نفیس سا کیچر، نازک سی رسٹ واچ، برانڈ کا میک اپ۔ اس نے نگاہ موڑی اور باہر جاتی ماں کی مٹھی میں بھنچا شیفون کا دوپٹا دیکھا۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ دوپٹہ اس کے حال پہ ہنسا تھا اس کے وجود کو ایک بے رحم اضطراب نے چھوا......وہ تمام قیمتی اور برانڈڈ اشیاء کو اچانک سالم امین کی زبان مل گئی تھی اور وہ وہی ایک جملہ دہرا رہی تھیں۔ "اگر مجھے اس تمام معاملے سے دور رکھا

جائے تو میں تاعمر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔" پھر وہ اچانک لہجہ بدل کے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا اور اس کی آنکھیں مصباح پہ ٹک گئی تھیں۔

"اس کے علاوہ آپ چاہیں تو ہم ایک طویل عرصے تک ملتے رہیں گے۔ آپ آزما کر دیکھ لیجیے میں اس کیفے ٹیریا کے علاوہ کسی بھی خوب صورت ماحول میں نہایت سحر انگیز گفتگو بھی کر سکتا ہوں۔" وہ ہمت کے باوجود بھی نہ نگاہ موڑ پائی، نہ اٹھ سکی جبکہ وہ اپنی کرسی سے کھڑا بھی ہو گیا۔ مصباح کے پاؤں کے نیچے کوئی دلدل اگ آئی تھی۔

"آپ اس قسم کی مشکل میں گرفتار ہوئے بنا بھی جب اور جہاں چاہیں، مجھ سے مل سکتی ہیں۔" اس کا کھلا اشارہ معمول سے ہٹ کے اس کی آج کی تیاری کی طرف تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کے شریر تاثر کے ساتھ مسکرایا۔ وہ مسکراہٹ شعلہ نما تھی۔ جس نے کیفے ٹیریا میں بیٹھی لڑکی کا وجود خاک کیا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی...... حتی کہ وہ کیفے ٹیریا کا گلاس ڈور دھکیلتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

وہ بھول چکا تھا کہ اس نے کس قدر لاپروائی سے چائے کا کپ ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ چند لمحے قبل وہ کس قدر مطمئن تھا۔ اسے یاد آنے لگا کہ گزشتہ رات اپنی مغرور معذرت کو...... عاجزانہ غلاف میں لپیٹ کر اس نے کسے پیش کیا تھا، اسے یاد آنے لگا، وہ کسی کی متحیر آنکھوں کے شہر بھگو کے اپنی آخری چال چل کے اپنی سپر کیفے ٹیریا کو بے حد عجلت میں چھوڑ آیا تھا اور اب اپنے شان دار لاؤنج میں اس شخص کے چہرے پہ اتری حیرت کا تاثر بہت عجیب تھا۔ وہ جیسے بات سمجھنے کے عمل میں تھا پھر

حیرت کی جگہ پریشانی نے گھیر لی کہ بات سمجھ میں آ چکی تھی یعنی فارم ہاؤس کے تمام ملازمین پہ قاضی کی غیر موجودگی کا بھید کھل چکا تھا، وہ قاضی جو کئی سالوں سے اس کے لیے کام کر رہا تھا، وہ سمجھ سکتا تھا کہ مفت کا ایک لاکھ کسی بھی غریب کے لیے ایک بڑی رقم تھی، یہاں کا کوئی بھی ملازم بھانڈا پھوڑ دیتا، تو پولیس اور الیکٹرانک میڈیا اس کے پیچھے پڑ جاتا تھا کہ بھئی آپ کا بندہ غائب ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی ہو۔

سالم امین نے سوچوں میں الجھ کے ایک گہرا سانس لیا پھر چہرہ موڑ کے رب نواز پہ پرسوچ نگاہ ڈالی۔ ساتھ ہی سوال کیا گو کہ وہ ہمیشہ اندرونی کیفیات کے برعکس بات کیا کرتا تھا مگر آج اس کا لہجہ تشویش سے بھرپور تھا۔

"یہ بات سرمد اور شمسو کے علاوہ یہاں اور کون جانتا ہے کہ یہ لڑکی یہاں آتی تھی؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا، تاہم ایک عجب سا ماتم دیتا احساس اس کے مضبوط وجود کو استہزا اسے چھو رہا تھا۔

"جی تقریباً سبھی......" رب نواز کے اس جواب نے وہ آندھی برپا کی کہ اس کا رہا سہا سکون دھول مٹی کی مانند ہی منتشر ہوا۔

سالم نہیں جانتا تھا کہ ایک بے بس انسان کی امید جب نقطے کی صورت رہ جاتی ہے تو پھر اس کا اچھا وقت شروع ہو جاتا ہے جس کی آس دم آخر پہ ہوتی ہے۔

"یہ کام کتنا آسان ہے یا کتنا مشکل، میں نہیں جانتا لیکن میں ان دونوں کو جلد اپنے روبرو دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس کی آواز میں تحکم اور تیزی کا عنصر تھا۔ وہ خاموش ہوا اور لمبے ڈگ بھرتا زینے کی جانب بڑھا۔ زینہ طے کرتے ہوئے اس کا دھیان ان متحیر آنکھوں کے نم شہر میں بھٹکا جو دنیا کے نقشے میں کہیں نہیں تھا۔

☆☆☆

اس کا چہرہ دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا، نہ اسے

آسمان پہ چمکتے اکا دکا ستاروں سے لگاؤ ہے نہ ہی اسے آسمان کنارے اڑتے پرندوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ اس کی دلچسپی کا محور وہ گملاں ہیں جہاں وہ اپنے

سنگی ساتھیوں سے کھیلتی تھی۔ تو اب بچپن ہاتھ چھڑا کے ذرا سا پیچھے رہ گیا تھا لیکن اس کی آہٹیں ابھی ان گلیوں میں تازہ تھیں۔ اب وہ ماں سے چھپ چھپ کر دروازے تک جاتی بھی تو اسے ماں کی روک ٹوک اور کانوں میں انڈیلی سرگوشیاں یاد آجاتیں اور قدم اپنی دہلیز کے اس پار ہی رک جاتے۔

"شام تمہاری، رات ہماری ایک ستارہ میرا......"

وہ ہمیشہ کی طرح ان آوازوں کو سن کے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہے۔ وہ نیچے گلی میں جھانکتی ہے اور کھل کے مسکراتی ہے کہ ان کے گیت ان کے کھیل کھلونے اک اور نسل نے چرا لیے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ پرچون کی دکان تک پھسلتی اس کے بوڑھے مالک پہ جاتی ہے...... بوڑھے بھٹی کی جوان آنکھوں نے اک اور نسل کو تاکنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے اعصاب بے چینی کا شکار ہوتے ہیں وہ تلملا کے دوسری طرف دیکھتی ہے۔

وہ میاں صاحب کو اپنی قیمتی گاڑی سے باہر آتا دیکھتی ہے جو ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنی قیمتی گاڑی سے ٹیک لگا کر اندھیرے اور اجالے کے سنگم میں بچیوں کی کمسن گھیری کو دلچسپی سے دیکھتا ہے۔ منڈیر سے تکی لڑکی کا سانس تھم جاتا ہے، گلی میں کچھ بے رحم دستکوں کا شور گونجتا ہے، ان حریص آنکھوں سے پھوٹتی گرد اس کمسن گھیری پہ چھا جانا چاہتی ہے، وہ اسے نفرت سے گھورتی ہے۔

گلی کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اس شخص کی عقابی نگاہیں منڈیر سے جھانکتی اس لڑکی پہ ٹکیں جو اس کی بیٹی کی ہجولی تھی اور ملگجے اندھیرے میں ہر بار وہ بیٹی کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کرتا تھا۔ اسے یک ٹک اپنی جانب دیکھتا پا کر لڑکی کا ہاتھ ہلکی گرم منڈیر سے سرک سا گیا۔ اس کے کان میں آواز آتی ہے۔

"اپنے چچا میاں کے لیے چائے لے کر آؤ۔"

یہ آواز اس کے باپ کی ہے۔

"یہ تمہارے چچا میاں، یہ دکانوں والے تمام

انکل...... برف والا رمضو بھائی اور دودھ والے بابا۔
ان تمام نامحرم رشتوں کی نیت سے جب ان قائم کردہ دنیاوی رشتوں کی چھاؤں معدوم ہو جاتی ہے تو ان کے وجود میں اک آگ برساتا سورج اگ آتا ہے جن کی تپش جسموں کو مردہ کر دیتی ہے۔" یہ آواز اس کی ماں کی ہے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ ماں کی یہ قیمتی سرگوشیاں آسماں پہ چمکتے اولین ستاروں سے زیادہ نایاب ہیں۔ وہ اسے کانٹے دار نگاہوں سے گھورتی دوسری منڈیر کی طرف آتی ہے۔
جگنو کے گھر کا صحن چھوٹا ضرور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ وہاں دوسری چارپائی کی گنجائش نہ ہو پھر اس کا سوتیلا باپ جگنو کی چارپائی پہ کیوں لیٹا تھا۔ اس کے ذہن پہ بوجھ پڑا۔ اس آدمی کی آنکھ میں ایک آگ برساتا سورج ابھرا ہوا تھا۔ وہ کانپ کے رہ گئی۔
اس لڑکی کی سوچ جہاں تک کام کرتی تھی وہاں تک بہت کچھ غلط تھا۔
"غضب خدا کا اب پھول منڈی کے بچے بھی ہم شرفا کی گلیوں میں کھیلیں گے۔" میاں صاحب کی اس دھاڑ پہ اک خوش رو گھبرا اٹھتا ہے۔
نگی، شاہو...... رانی، پارو...... ایک دوسرے پہ گرتے پڑتے ان شرفا کی گلیوں سے بھاگ جاتے ہیں۔ وہ آواز گونج دار تھی کہ ملحقہ گھروں کے مرد بھی گلیوں میں نکل آئے۔ کچھ یوں ہوتا تھا کہ موسم برسات میں پھول منڈی اور اس محلے کی مشترکہ دیوار کا کچھ حصہ گر جاتا تھا بچوں کو کیا خبر کہ دیوار کے آر...... پار کیسی تفریق تھی۔ کون گنہگار تھا اور کون بے گناہ۔
☆☆☆
وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پچھلے دو دنوں سے پریشانی کا شکار تھا کہ کیفے ٹیریا میں آکر بھی نگاہ کارنر ٹیبل پہ ٹک جاتی۔ وہ ایک ایسی جگہ کو بار، بار دیکھتا تھا جہاں سے کوئی ہمیشہ کے لیے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ قاضی سے سامنا یا اس کا دستیاب ہونا ممکن تھا...... مگر وہ لڑکی...... اس سے دوبارہ ملنے کے آثار ناپید تھے جو حکم دے کر التجا پہ اتر آتی تھی اور اس کی التجا حکم سے زیادہ معتبر تھی۔
اس وقت بھی وہ اپنے بیڈروم میں جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا کہ "اس قدر خود سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس معمولی سے واقعے کو ہینڈل کرنا رب نواز کے لیے کچھ مشکل نہیں لہذا...... ٹہلنے کے بجائے بیٹھ جاؤ...... اور اگر اب بیٹھ ہی چکے ہو تو پرسکون ہو جاؤ۔" اس نے اپنے اس مشورے پہ سنجیدگی کے ساتھ عمل کیا۔
کچھ دیر بعد اس کے ذاتی کاموں پہ مامور ملازم کمرے میں آیا۔ جس کی ڈیوٹی رات پونے گیارہ بجے صاحب کو دودھ کا گلاس پیش کرنے کے بعد ختم ہو جاتی تھی۔
"صاحب میں اب جاؤں۔" مؤدب طور پہ اجازت طلب کرنا، یہ اس کا معمول کا جملہ تھا، وہ لڑکا آج دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھنے کے بعد بھی خاموش تھا۔ وہ موبائل پہ مصروف اپنے صاحب کے سامنے اک تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا۔
"کیا بات ہے سرمد......" اس نے اچانک پوچھا...... کہ ملازم کا عمل خلاف معمول تھا۔ سالم اسے اپنے سامنے جما دیکھ کے چونکا اور یہی سمجھا کہ سرمد گزشتہ خبر کے متعلق کوئی بات کرنا چاہتا ہے جبکہ وہ اس موضوع پر ملازمین سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے سوالیہ انداز میں نولفٹ کا تاثر واضح تھا۔
"صاحب! وہ نیچے میرا مطلب ہے۔" اس نے گردن کھجائی۔
"مطلب......" اس نے اپنے خشک ہونٹوں کو تر کیا۔
"قاضی یہاں آچکا ہے صاحب......" اس نے ہچکچاتے ہوئے جملہ مکمل کیا جبکہ اس کا تمتماتا چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ قاضی اکیلا واپس

نہیں آیا۔ سالم کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اگلے ہی لمحے اس کے حواس پرسکون ہوئے۔ اس نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا، اکیلا ہونے پر اس نے مطمئن ہو کر صوفے کی پشت سے سر ٹکایا۔ اس نے گزشتہ تین دنوں کی پریشانی اور توہمات کو اپنے وجود سے یکلخت غائب ہوتے محسوس کیا، اگر وہ دنیا میں کسی چیز سے خوف کھاتا تھا تو وہ بدنامی کا خوف تھا اور اسے دنیا میں کچھ عزیز تھا تو وہ نیک نامی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

"آپ کو انہیں پاتال سے ڈھونڈ کے بھی میرے روبرو لانا ہوگا۔" اسے غیر ارادی طور پہ یہ جملہ یاد آیا۔ ہماری سوچیں ہماری بے نیازی کی پروا کب کرتی ہیں۔ وہ انہیں پاتال سے نکلوا چکا تھا مگر مصباح کی خاطر نہیں، صرف اپنی خاطر۔ وہ ہمیشہ اپنی پروا کرتا تھا، وہ کسی کو کم ہی خاطر میں لاتا تھا۔ "اس لڑکی کی خواہش پوری کرنے پہ کیوں متامل ہو سالم امین ....!" دل نے مدھم سی تکرار کی۔ وہ ایک حیران کن احساس تھا۔ اس کی پیشانی پہ مبہم سی شکنیں ابھر آئیں۔ ...... قاضی کی اس کہانی میں اگر تیسرا کردار وہ مصباح نامی لڑکی تھی تو وہ اسے اس کہانی سے پہلے ہی الگ کر چکا تھا۔

اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس نے کہانی کا اختتام کیا کرنا ہے۔ اس نے کمرے کی تمام لائٹس بند کر کے نیلگوں لیمپ آن کیا...... اب اس کی خواہش صرف نیند تھی۔ دس، پندرہ، بیس منٹ اسے کروٹیں بدلتے کتنا ہی وقت گزر گیا لیکن وہ نیند کا منتظر ہی رہا، وہ ڈسٹرب ہوا، آخر وجہ کیا ہے۔ معاً اس کی بند آنکھوں کے پیچھے اک دائرہ سا چمکا۔ وہ پورے چاند کی سی گولائی کیا کسی کے کان کی بالی تھی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں وا کیں۔ اس نے اپنے ہر اس دھیان کو جھٹکنا چاہا جو اس لڑکی کو دھیان میں لانے کا موجب تھا۔

"قاضی...... بھاڑ میں جائے اور جگنو! وہ اس دنیا میں کیا کرنے آئی تھی" نیند جیسے ہولے ہولے اس کی اور سرک رہی تھی وہ بے یقین تھا...... متعجب تھا۔ اس نے نرم تکیے سے ذرا سا سر اٹھا کے اپنے درو دیوار کو نیند میں گھورا کہ اسے اس لڑکی کے کان میں پڑی بالیوں کے موتی کیوں یاد آ رہے تھے...... وہ موتی جو بہت مغرور تھے۔ اس پہ کچھ غالب ہو رہا تھا وہ نیند تھی یا پھر......

☆☆☆

ان کے کشادہ آنگن میں تیکھی دھوپ کا غرور ٹوٹ چکا تھا کہ ان کے پختہ درو دیوار سے اب سہ پہر بھی دور ہو چکی تھی۔ ایک مغرور اور طویل دن کی آب و تاب اب اپنا وجود تیزی سے کھو رہی تھی، فارہ نے اسے انتہائی دھیان سے دیکھا، جس کے اندر بہت سے ارادوں کی آب و تاب جیسے ماند پڑ چکی تھی۔ فارہ جو سوچ رہی تھی اس کے مقابل بیٹھی وہ لڑکی سمجھ بھی رہی تھی۔

"میرے ارادے ویسے ہی اٹل ہیں...... ہاں مگر انجانے میں میری انا پہ کاری ضرب پڑی ہے۔ جسے مندمل ہونے میں ایک عرصہ درکار ہوگا۔" اس ساکن ماحول میں گرم اور تازہ چائے کی خوشبو ان دونوں لڑکیوں کو حیرت سے تک رہی تھی کہ کچھ دیر قبل ان کی گفتگو میں جو رونق تھی، ان کے چہروں پہ جو مسکراہٹ تھی وہ کیونکر منجمد ہو چکی تھی ابھی کچھ دیر پہلے طلحہ اس سے فون پہ بات کر رہا تھا اور وہ کافی دیر اس کا ضبط آزماتا رہا تھا۔

"کہاں تو مستقبل کی سی، ایس، ایس آفیسر نے پنجاب میں اپنی افسری کی دھاک بٹھانا تھی اور اس آفیسر کے کافی مشن ابھی پینڈنگ تھے، اس لیے مجھ ناچیز سمیت کسی کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا کہ یہ معجزہ کیونکر ممکن ہوا۔ یعنی تمہارے جیتے جی اس گھر میں ایک لڑکے کا رشتہ آتا ہے۔" اور اس بات پہ طلحہ کا قہقہہ نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پلیٹ کے بے چاری فارہ کو گھورا تھا جو آن لاؤڈر سے تمام گفتگو سن رہی تھی طلحہ نے اگلا قہقہہ حذف کرتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

"اور انہوں نے تمہیں پسند بھی کر لیا، یعنی بالکل پاگل لوگ ہیں یار۔" اس نے یہ بات اس قدر سنجیدگی سے کی تھی کہ فارہ نے فوری سر ہلا کے تصدیق بھی کر دی۔ اور پھر مصباح کا زوردار دھموکا بھی برداشت کیا جس کی ہائے خاصی بلند تھی۔ طلحہ اچانک ہی خاموش ہوا۔

"تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔" مصباح نے فون کو گھورتے ہوئے اسے دانستہ چھیڑا...... جس نے اگلا سانس بھی محتاط سا ہو کر لیا تھا۔ اور شاید دانستہ کال کاٹ دی تھی...... فارہ جانے کیا سننا چاہتی تھی کہ رابطہ ختم ہونے پہ اس کے احساسات شل ہوئے۔ وہاں کئی پل کو ایک خالی گھر کے جیسی خاموشی طاری رہی۔

ان کے چہروں کی مسکراہٹ اور گفتگو کی رونق نے اپنا وجود ایک طویل اور مغرور دن کی آب و تاب کی مانند ہی کھویا تھا۔ سو تازہ چائے کی خوشبو سمیت وہاں ہر چیز فارہ سے مدہم سرگوشیاں کر رہی تھی کہ آخر کار یہ شخص دشمن جان ثابت ہوگا۔

فارہ کی ڈبڈبائی آنکھوں سے ہر چیز کا دھندلا نظر آنا لمحاتی ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ مصباح اس دشمن جاں کا ذکر چھیڑتی، وہ خود کو سنبھالتی گفتگو کا رخ ایک بار پھر آج کے فنکشن کی طرف موڑ چکی تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آنٹی تمہارا رشتہ وغیرہ طے کرنے کے مشن میں فیل ہونے کے بجائے اس قدر شاندار نمبروں سے پاس ہو جائیں گی۔" وہ حیرانی سمیت کے مسکرائی اور فارہ کی حیرت پہ وہ ہنس دی پھر ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو سمیٹ کے عجب تاثر کے ساتھ گویا ہوئی۔

"جب بھی میرے مستقبل کے بارے میں بات چھڑتی تھی تو بات میری ماں کی تربیت پہ آ کے ختم ہو جاتی تھی سو میں نے تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اماں کی جھکی آنکھوں کو اپنے باپ سے آنکھ ملا کے بات کرنے کا موقع دیا ہے۔" وہ اپنی آواز اور لہجے کے برعکس بے حد پرسکون تھی مگر وہ اپنی دوست کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی جسے اب بھی مصباح کا اطمینان چبھ رہا تھا۔

"اور جہاں تک افسر بننے کی بات ہے تو وہ میں ضرور بنوں گی کہ شادی بہت بعد کا معاملہ ہے۔" اس نے حسب عادت کندھوں کو خفیف سا جھٹکا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے اور وہ ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اور جگنو اس کا قصہ کہاں تک پہنچا۔" فارہ کی محتاط سرگوشی نہایت مدہم تھی جس نے مصباح کو بے حال کیا۔

"آپ کو اس مشکل میں گرفتار ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس لہجے کے یاد آتے ہی وہ ایک بار پھر عجیب اذیت سے دوچار ہوئی۔

"بھیس بدل کے چلنے والوں کے عقب میں دکھ اور آوارگی ایک ساتھ چلتے ہیں اور بھیس بدل لینے سے ہیر رانجھے کی نہیں ہو جاتی، بس خیرات ہی رانجھے کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ میں اس قصے کو دفنا چکی ہوں۔" اس کا لہجہ سخت اور سرد تھا۔ اس نے خالی برتن اٹھائے اور وہ کچن کی سمت چل دی......

فارہ نے محسوس کیا کہ اس کی دوست کی نم آنکھوں سے ہر چیز کا دھندلا نظر آنا لمحاتی نہیں تھا کہ اس کے دکھ عجیب تھے۔ وہ اسے نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھتی رہ گئی جو جگنو کی تقدیر بدلنا چاہتی تھی جس نے اپنے مقدر کا زیادہ حصہ ماں سے لے لیا تھا۔

☆☆☆

کبھی تیز...... کبھی ہلکی، کبھی کن من، مسلسل ایک ہفتہ بارش اپنے ہر روپ میں برسی تھی۔ آج بھی دھوپ اور بادلوں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ ان کے گھر کے سامنے اک بھنبھناہٹ نما شور سراپا اس بات کا غماز تھا کہ وہاں اک ہجوم اکٹھا ہوگا۔ ان کے عین سامنے والے گھر فوتگی ہو گئی تھی آج مرنے والے کے قل تھے۔ چند گھنٹے پہلے کھلنے والے کھانے کی مہک بھی اب اس گلی سے اڑ چکی تھی۔ خالی برتنوں کی کھٹ پٹ بھی معدوم ہوئی حتی کہ گلی میں تنا ٹینٹ

بھی اتار لیا گیا تھا مگر وہاں بدستور اہل محلہ اکٹھے تھے۔ اس نے اندازہ لگایا...... پچھلے دنوں ان کے محلے میں چوری ہوئی تھی۔ نیا چوکیدار کون منتخب کرے گا یہ مسئلہ ابھی تک زیر بحث تھا...... یقیناً اب بھی فیصلہ ہوگا۔ اس نے لڈو تھپکی اور گوٹیاں سمیٹیں۔

”محلے داروں کی بیٹھک سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آج آمنہ اور اکرم والا معاملہ حل کرلیا جائے شاید۔“ اس کی سماعتوں سے ماں کی آواز ٹکرائی جو اپنی پڑوسن سے ہم کلام تھیں۔

”استغفار! اکرم بیوی کو تین طلاقیں ایک ساتھ دینے کے بعد واپس لے آیا ہے اور مولوی سمیت تمام اہل محلہ گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھے ہیں۔“ پڑوسن نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ وہ اب پورے دھیان سے ان کی طرف متوجہ تھی۔ برتن اٹھاتی ان کی ملازمہ کا ہاتھ لگنے سے ٹیبل پہ پڑی گوٹیاں زمین پہ بکھر گئیں۔

”بے چاری پھول منڈی کی بچی پہ بخشو دھوبی نے جو ظلم ڈھایا ہے تو ممکن ہے آج اسے محلے سے نکالنے کا فیصلہ کیا جائے۔“ ان کی ملازمہ نوری نے بھی اپنے اندازوں کا اظہار ضروری سمجھا تھا، ان کے قریب بیٹھی اس لڑکی کی ہتھیلی پہ بری طرح کچھ چبھا...... جانے یہ کیا چیز تھی جو اک عرصے سے اس کی ہتھیلیوں میں چبھتی تھی۔

”ارے کہاں نوراں! یہ پہلی بار تھوڑی ہوا ہے۔“ اس کی ماں نے ایک تلخ آہ بھری تھی۔

”یہاں ادھر کے بچوں کو بھی نیلامی کا مال سمجھا جاتا ہے۔“ وہ تینوں خواتین تاسف سے ہاتھ مل رہی تھیں۔

”جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہفتہ بھر متواتر ہونے والی بارشوں سے ہمارے محلے اور پھول منڈی کی مشترکہ دیوار تقریباً گر چکی ہے۔“ گلی سے آتی یہ پاٹ دار آواز میاں صاحب کی تھی۔

”اور محلے دار پھول منڈی کی شہرت سے آگاہ ہی ہیں۔“ میاں صاحب نے سلسلہ کلام جوڑا...... وہ چونی اور ہمہ تن گوش ہوئی۔

”جی، جی بالکل ہیں۔“ یہ پڑوسی محلے کی شہرت سے آگاہی رکھنے والوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ (وہ جانتی تھی آگہی آگ ہے جو جلاتی ہے آگہی برف ہے جو جما دیتی ہے)

”ادھر کے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے ہمارے بچوں کا اخلاق و کردار متاثر ہو رہا ہے۔“ یہ بھدی اور بھاری آواز پرچون کے مالک بھٹی کی تھی۔ (اس کے اندر اک لاوا سا ابلا) محلے کے ماحول کو پاک صاف رکھنا ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔“

وہ مزید گویا ہوا...... کہ اس محلے کا بزرگ جو تھا......(ہاں جیسے بچیوں کے گریبانوں کے بٹن گننے کی ذمہ داری تجھے ان کی ماؤں نے سونپ رکھی ہے)

”کیا پرہیزگاروں اور گنہگاروں کا ایک جگہ رہنا ممکن ہے۔“ یہ کھردری آواز محلے کے مولوی کی تھی۔ وہ اچانک چونکی...... اس نے اس جملے کو دل میں کئی بار دہرایا تھا اور ہر بار اسے اپنی مرضی کے معنی دیے۔

اب گلی میں موجود افراد کی ”نہیں نہیں، ممکن نہیں۔“ ان الفاظ کا ساتھ گھر میں بیٹھی وہ لڑکی بھی دے رہی تھی۔ باہر گلی میں ایک بار پھر شور شرابے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس مشترکہ دیوار کی تعمیر کے لیے وہاں اب اہل محلہ سے فنڈ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ جانتا تھا کہ وہ ایک عام انسان ہے پھر بھی وہ جو سوچتا تھا وہ ہو جاتا تھا۔ جو چاہتا تھا کرلیتا تھا، وہ کوئی ولی اللہ نہیں تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سارا کمال...... اختیار اور پیسے کا ہے، جہاں ان دو چیزوں کا ملاپ ہوتا ہے وہاں بے بسی کے لیے ٹکنا مشکل ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو رب نواز اس سے قاضی کے متعلق حکم لے کر گیا تھا کہ وہ ان دونوں کو خفیہ طور پر صاحب کے ایک دوست کے پاس ست چھوڑ آئے گا۔ (یہ شہر خنجراب کے بالکل پاس ہے) اور

اب وہ پریشان شکل کے ساتھ دوبارہ سالم کے مقابل تھا۔ جس نے اپنے اس خاص ملازم پہ سرسری سی نگاہ ڈالی۔ سالم سمجھ گیا کہ وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے جبکہ وہ کہیں جانے کو تیار کھڑا تھا۔

"اب کیا مسئلہ ہے یار......" اس کی پیشانی پہ بل پڑے...... "میرے پاس طویل بات سننے کو وقت نہیں ...... جو بھی کہنا ہے ذرا جلدی کہو۔" اس نے رسٹ واچ پہ نگاہ ڈالتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"سر قاضی یہیں رہنا چاہتا ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا ...... سالم نے ٹھٹھک کے اسے دیکھا۔

"اس کا دماغ درست کرنا تمہارا کام ہے۔" اسے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد وہ برہمی سے گویا ہوا۔

"وہ پہلے کی طرح یہاں تنہا رہنا چاہتا ہے۔ وہ اس لڑکی سے ہر تعلق توڑنے کو تیار بیٹھا ہے۔" صاحب کے تاثرات کے پیش نظر اس نے یہ بات تیزی سے ختم کی ......سالم آگے بڑھتے ہوئے یکلخت رکا...... کیا اس نے جو سنا وہ درست تھا۔ اس نے مڑ کے بے یقینی کے عالم میں رب نواز کو دیکھا۔ وہ حد درجہ حیران ہوا۔

"کیا کمٹمنٹ اور محبت کی قید سے آزاد ہونا اس قدر آسان ہوتا ہے۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا حالانکہ اسے اچھا خاصا طیش آرہا تھا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے ......ان دونوں سے کہو کہ اپنی اپنی راہ ناپیں۔" چند لمحے غور کرنے کے بعد اس نے رب نواز کو ایک معقول مشورہ دیا......اور غور کے ان چند لمحوں میں اسے مصباح اور اس کی جگنو سے متعلق تمام گفتگو یاد آئی۔ قاضی سے متعلق جس کے اندیشے بلاوجہ نہیں تھے۔

"قاضی کو تو میں ابھی بھیج دوں گا مگر وہ لڑکی ضد کیے بیٹھی ہے کہ اب یہاں سے اس کی لاش ہی جائے گی۔" یہ جملہ ادا کرتے ہوئے اس کے ملازم کی آواز لرز سی گئی تھی اور اس فارم ہاؤس کا مالک بے حس و حرکت کھڑا اپنے ملازم کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے خود کو اک اشتعال سے چھڑا کے پرسکون کیا، جہاں اختیار اور پیسے کا ملاپ ہوتا ہے وہاں بے بسی کا ٹکنا مشکل ہوتا ہے مگر اس وقت اس کے فارم ہاؤس میں بے بسی چہار سو پھر رہی تھی۔ بہت جلد وقت نے اسے اس لڑکی سے ملنے پہ مجبور کر دیا تھا جس کی آنکھیں رات کی مانند تھیں۔

☆☆☆

"مجھے لگتا ہے رشتہ طے ہونے کے صدمے نے تمہارے دماغ کو کافی نقصان پہنچایا ہے اس لیے آج کل الٹے سیدھے خیالات کا اظہار ہو رہا ہے۔ ہنی تمہیں بطور سیکریٹری اپائنٹ کرنا چاہتی ہے۔" وہ اس کی بات دہرا کے استہزائیہ بڑبڑایا، مصباح نے اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو جھپٹ کے بیڈ پہ پٹخا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو طلحہ ...... وہ تمہیں ہائی سیلری دے گی۔ تمہارے حالات دنوں میں بدل جائیں گے پھر اس کے بعد۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کے اچانک خاموش ہوئی۔ طلحہ کی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں نے اس ایک لفظ کے بعد کو آئینے کی مانند روبرو کیا۔ بعد کے ترجمے سے لے کر تشریح تک ایک وہی تھی جو سراب تھی، اس نے ساعتوں کے کاغذ پہ لکھا لفظ تیزی سے صاف کیا۔

اگلے پل اسی تیزی سے اس کی ماں کمرے میں آئی......"اس طرح فوری منہ پھاڑ کے انکار کی ضرورت نہیں تھی کہ مصباح کا مشورہ قابل غور ہے۔" اس نے منہ بسورا۔

"پھر ماشاء اللہ سے اچھی شکل اور قد کاٹھ کے مالک ہو۔ کل کلاں کو ہنی تمہیں اپنے ساتھ ہیرو بھی لے سکتی ہے۔" وہ بیٹے کو گھور کے مصباح پہ صدقے واری جاتی اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

مصباح نے جز بز ہو کے پہلو بدلا کہ اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ہنی نے ایک ریسٹورنٹ میں اس سے ملاقات کی تھی آگے پیچھے اس کی دو فلمیں

باکس آفس پہ ہٹ ہوئیں تو اب وہ پھول منڈی چھوڑ کر ایک لگژری اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ ہزار ہا کوششوں کے باوجود طلحہ سے ملنے میں ناکام رہی تو بالآخر اسے مصباح کا سہارا لینا پڑا، لیکن طلحہ نے وہ پرکشش آفر فوراً رد کر دی تھی۔

''میں کہتی ہوں اس میں ہرج ہی کیا ہے آج کل تو فلمی ہیروئن کا سیکریٹری ہونا بڑے افسروں سے بھی زیادہ شان کی بات ہے اور پھر اپنی تو ہماری۔''

''اماں آپ ہماری باتیں چھپ کے سن رہی تھیں۔'' اسے ماں کی اس حرکت پہ غصہ سا آرہا تھا مگر یہ کہتے ہوئے اس نے لہجہ نارمل ہی رکھا۔

''لو میں کیوں چھپ کے سنتی، تم دونوں کی آوازیں صحن تک آرہی تھیں۔''

اس نے صاف نگاہ چرائی حالانکہ یہ غلط تھا۔ مصباح کی آواز نہایت مدھم تھی، طلحہ کی ماں نے کسی خدشے کے تحت وضاحت نیچی آواز میں کی تھی پھر کچر کچر امرود کھانے کا سلسلہ دوبارہ بحال کیا لیکن ہونی ہو کر رہی۔

''میں کافی دیر سے اماں کو دروازے سے چپکا دیکھ رہا ہوں۔''

اس گڈو نامی خدشے نے صحن سے ہانک لگائی۔ مصباح کے چہرے پہ بکھری مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

''اللہ ان نرسوں کا بیڑہ غرق کرے جنہوں نے میرا معصوم بچہ بدل کے جانے کس کا یہ فتنہ میری گود میں ڈال دیا تھا۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے چلائی۔

''اتنا جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے اماں! یہ فتنہ سو فیصد آپ کا ہی ہے۔'' طلحہ مسکراہٹ دبا کے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''ہاں تو۔ میری سرکل آنکھیں اور ٹرائی اینگل ناک بالکل آپ جیسی ہے۔'' گڈو نے ممکنہ خطرے سے بچاؤ کی صورت یہ انکشاف پردے کے پیچھے رہ کر کیا۔

''شٹ اپ گڈو۔''

طلحہ نے اسے بری طرح جھاڑا...... پھر ماں سے مخاطب ہوا......

''یاد رکھیے کل کو آپ کی بیٹیاں جب یہی عادتیں چرائیں گی تو۔''

''ہاں تو شوق سے چرائیں ...... گھر میں اب چوری کے لیے اور تو کچھ قیمتی ہے نہیں ...... تو تمہارے افسر باپ کی بیٹیاں میری عادتیں بھی چرالیں تو غنیمت سمجھو۔''

وہ کس قدر تلخ ہو کے اور تپ کے بولی تھی کہ اس کے بیٹے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے مصباح کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ وہ جبراً مسکرائی۔

''مجھے اکیڈمی جانا ہے۔''

وہ ان سے اجازت مانگتی دروازہ پار کر گئی تو طلحہ نے باہر جاتی ماں کا ہاتھ نرمی سے پکڑ لیا۔ اسے یاد تھا بہت عرصے پہلے جب اس کی ماں افسر کی بیوی ہوتی تھی۔ اس کی عادات و اطوار تب بھی ایسے ہی تھے۔ تب گھر میں قیمتی چیزیں بھی تھیں جو حالات بگڑنے کی صورت بکتی چلی گئیں مگر کچھ ایسی قیمتی چیزیں بھی تھیں جن کے متعلق اس کی ماں آگہی چاہتی ہی نہیں تھی۔

''سلیقہ ہو یا پھر تہذیب و تمدن ...... یہ سب کہاں بکتا ہے اور انہیں کہاں سے خریدا جاتا ہے۔''

اس نے ماں سے سوال کیا۔

''یہ تمام گڈ مینرز اعلا گھروں اور قیمتی گاڑیوں کے مالک لوگوں کی ہی میراث نہیں اماں! پھر ہم جیسے مڈل یا لوئر کلاس ان عادات و اطوار کو خود پہ لاگو کیوں نہیں کرتے۔''

یہ عجب سوال تھا۔ ماں کی نگاہ ادھر ادھر ہوئی۔

''یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔''

وہ بجھی ہوئی آواز میں بولی۔ اس نے ایک بے بس سا سانس لے کر افسردگی کے ساتھ سر جھٹکا۔

''میری مانو تو ہنی کی پیش کش قبول کر لو طلحہ!''

اسے اس کمرے میں آنے کی وجہ اچانک یاد آئی

تھی۔ وہ اسے پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھی جواب ایک فقیر کی بیوی تھی، پھر بھی ویسی ہی تھی جیسی بہت پہلے تھی۔ اس کا بیٹا بھلے دولت کے ڈھیر بھی لگا دیتا اس نے ایسے ہی رہنا تھا کہ وہ قیمتی چیزوں سے آگہی چاہتی ہی نہیں تھی۔

وہ عجیب مزاج کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ماں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ اس کے بچوں کے لیے کون سی دولت زیادہ ضروری ہے ورنہ پیسے کی اہمیت سے طلحہ نوید بھی کب انکاری تھا۔

☆☆☆

وہ طلحہ کے گھر سے باہر آئی اور چند قدم ہی چلی تھی کہ یونہی اک خیال کے تحت اس نے رک کے اپنا بیگ چیک کیا۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا کہ بیگ میں موجودہ رقم بہت کم تھی۔ وہ خود کو کوستی ہوئی واپسی کی راہ ہولی، تاہم اس کے قدم سست روی کا شکار تھے جبکہ دھیان طلحہ کی جانب تھا۔ فارہ کے لیے اس شخص کا سرد رویہ اب مصباح کو ڈسٹرب کرنے لگا تھا۔

"ہنہ......" اس نے گردن کو بائیں جانب جھٹکا۔ مجھے تو خیر اپنا رشتہ طے ہونے کا صدمہ پہنچا ہے یا نہیں، لیکن تمہارے انداز صاف بتا رہے ہیں کہ تم بہت گہری چوٹ کھانے والے ہو طلحہ صاحب۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

جانے کیوں آج گھر جاتے ہوئے اس کا حال پہلے دن اسکول جانے والے بچے جیسا تھا، چند گھنٹے قبل اس کے گھر میں اچانک صورت حال گمبھیر رخ اختیار کر گئی جب اس نے محلے کی چند عورتوں کے سامنے گوشی کے شوہر کے خلاف بولنا شروع کیا۔

"کیوں؟ آخر کوئی کیوں نہیں سمجھتا کہ وہ بندہ اپنی سوتیلی بیٹی کے لیے کیوں تڑپ رہا ہے۔" وہ انہیں ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نکتے پہ سوچنے کے لیے مجبور کر رہی تھی جو عاقل کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں کہ ایک سوتیلے رشتے کے لیے اس کی تگ و دو اور انعامی رقم قابل تحسین عمل ہے اور یہی باتیں سن کر اس کے اندر اک آگ سی جل اٹھی تھی اور......

"آخر کیوں؟" جیسے اس سوال کے ساتھ وہ بے ساختہ چلائی تھی۔ اس کی ماں نے ہڑبڑا کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا، ماں کے اشارے پہ مصباح کا دھیان ڈرائنگ روم کی طرف گیا جہاں ٹی وی چل رہا تھا...... اس نے اگلے لمحے اپنے تایا زاد وہاب کو جو انتہائی منہ پھٹ اور بدلحاظ انسان تھا۔ باہر آتے دیکھا تو اس کا دل کہیں گہرائی میں اترا۔ حالانکہ وہ اس شخص سے کبھی خوف نہیں کھاتی تھی۔ دل ڈوبنے کی وجہ کچھ اور تھی ......وہ پریشانی میں مبتلا ہوئی۔ وہ عقب سے گھوم کے اس کی ماں کے سامنے آیا۔ وہ ہراساں ہوئی۔ وہ محلے کی عورتوں کے سامنے بھی اس کی ماں سے بدتمیزی سے پیش آسکتا تھا۔

"مان لیا کہ آپ کی بیٹی نے محلے کی تمام بدکردار عورتوں کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے پھر بھی اسے سمجھانا آپ کی ذمہ داری ہے کہ معاشرے میں چچا کا بھی ایک مقام ہے اور عزت ہے۔" مصباح کی سفید رنگت پہ چھانے والا سیاہ رنگ لمحاتی نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھا کے اپنے سامنے ایستادہ پختہ اور قد آور عمارت کو دیکھا جو بہروز علی کا گھر تھا۔

"لازم ہے کہ ان اونچے مضبوط دروازوں کی پیشانیوں پہ جو کتبہ لگایا جاتا ہے وہاں پہ عزت اور مقام بھی کندہ کر دیا جاتا ہے، بھلے وہاں کے رہائشی جانوروں کی سی صفت کے مالک ہوں۔" اندر کی ابتر حالت کے برعکس اس نے اپنے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دی تھی اس نے محلے کی عورتوں کو وہاں سے اٹھتے دیکھا۔

"ہمارے پورے خاندان کی عورتوں میں سے اگر آپ کی بیٹی کی آواز گھر کی دیواریں پار کرتی ہے تو اس کا یہ عمل آپ کی ناقص تربیت کا نتیجہ ہے چچی۔" اس کی آواز میں غصہ اور تیزی کا عنصر تھا۔ اس نے اپنی ماں کو بے حس و حرکت ہوتے دیکھا۔ مصباح

کے اندر اشتعال کی ایک تیز لہر دوڑی۔ اس کا دل ان کے گھر کا خارجی دروازہ پار کرتے دہاب کی پشت پہ پتھر مارنے کو چاہا تھا......

اس نے اپنی ماں کی جانب دیکھنے سے گریز برتا جو اسے اب گوشی کے معاملات میں خاموش رہنے کی تلقین کرتی تھی...... آخر بنت حوا کی تربیت پہ ہی کیوں حرف آتا ہے؟ اکثر ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ اولاد کے وجود میں پنہاں سبز موسموں کو ابن آدم کے اعمالوں کی دھوپ جھلسا دیتی ہے۔

☆☆☆

وہ اپنے گھر کے عین سامنے ٹھٹھک کے رک گئی اور اطراف میں دیکھا۔ اس کا گھر اس محلے کی مرکزی اور کشادہ گلی میں تھا سو وہاں مغرب سے قبل گھروں کو لوٹنے والے اسے حیرانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے جو خود میں اس قدر مگن تھی جیسے سنسان گلی میں چل رہی ہو۔ وہ دو سیڑھیاں چڑھی اور جونہی دروازے کا ایک پٹ وا کیا تو دروازے کے دوسرے پٹ پہ ایک پھڑ پھڑاتا ہوا پرندہ زور سے بھاگا......

غالباً اسی پرندے کے پیچھے بھاگتی ان کی ملازمہ کی چھوٹی بیٹی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بال...... بال بچی ...... مصباح بھی اپنی جگہ جم سی گئی۔ ان پھڑ پھڑاتے پروں کی جھڑتی گرد سے اپنا چہرہ بچانے کی خاطر اس نے آنکھوں کے آگے ایک ہاتھ کیا اور دوسرے ہاتھ سے اس بچی کو راستے سے ہٹایا۔

''افوہ یہ کیا ہو رہا ہے بھئی ...... راستہ چھوڑو۔''

مگر وہ بچی بات ان سنی کرتے ہوئے کہیں نظروں کا نشانہ باندھے بس لپکنے کو تھی۔ وہ دروازے کا دوسرا پٹ دھکیلتی اندر چلی آئی۔ سامنے ہی بہروز علی مسہری پہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہے تھے وہ جانتے تھے کہ مصباح اس وقت اکیڈمی سے واپس آتی ہے۔

مصباح نے سامنے کے بجائے اپنا رخ کچن کی طرف موڑا...... ابھی چند ہی قدم چلی تھی کہ معاً وہ رک گئی۔ آج کافی دنوں بعد گوشی وہاں موجود تھی اس نے بے یقینی نظروں سے زمین پہ پڑے اس جہازی سائز بیگ کو گھورا...... جو گوشی کے قدموں کے پاس پڑا تھا۔ گویا آج وہ قصہ ختم ٹھہرا...... اس کی سانس میں گرہ سی پڑی۔

وہ جانتا ہے کہ تلاش گمشدہ جیسے اشتہار کے بعد جگنو کا پوشیدہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ کبھی بھی کسی پولیس اسٹیشن، کسی دوراہے یا کسی بس اسٹینڈ پہ جگنو کے دستیاب ہوتے ہی وہ اسے لے کر روپوش ہوسکتا تھا۔ اس تصور کے ساتھ ہی مصباح کے دل میں اٹھتی ٹیس نے جیسے پورے وجود کو جکڑ لیا تھا۔ اس نے زخمی گوشی پہ اک بے بس نگاہ ڈالی ...... جسے بہروز علی مذاق اڑاتی نظروں سے گھور رہے تھے کہ دوبارہ گھر بسا کر تمہاری زندگی میں کون سے چار چاند لگ گئے تھے۔

''دیکھو تو اس وحشی نے بے چاری کی کیا حالت بنا دی ہے۔ خدا اسے دن دہاڑے غارت کرے...... اس نے نگاہ موڑی اور کوسنے دیتی ماں کو دیکھا جس کے ایک ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا اور دوسرے میں روئی کا بنڈل تھا۔ وہ تیزی سے اسی جانب بڑھ رہی تھی...... اسے حیرت کا سامنا ہوا......

کیا اس کی ماں اپنے شوہر کی موجودگی میں اس عورت کے زخموں پہ مرہم لگائے گی، کیا اماں اس قدر بہادری کا مظاہرہ کرسکتی ہے؟ اس نے گھوم کے باپ کو دیکھا...... جن کی آنکھوں میں اک سکون تھا۔

''شکر ہے یہ زخمی تھی تو پکڑی گئی ورنہ میں تو بھاگ بھاگ کر مر جاتی۔'' ملازمہ کی بیٹی نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا تو مصباح چند لمحے اس کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑاتی شور مچاتی مرغی کو دیکھتی رہ گئی...... وہ کچھ دیر پہلے جسے پرندہ سمجھ رہی تھی، وہ ان کی پالتو مرغی تھی۔ اس کے پروں سے خون رس رہا تھا۔ اف یہ اماں کی مرغیاں آئے دن کسی تار وار سے الجھ کے زخمی ہو جاتی تھیں۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھی۔

آج وہ بھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کے

بمشکل ہی مسکرائی تھیں۔ مصباح کی نگاہ دوبارہ اس کے سامان پہ پڑی وہ کسی سوچ کے تحت چونکی۔ وہ اس لیبل عورت کو جگنو کی کوئی بھی خبر آنے تک تو پناہ دے سکتی تھی وہ اس کا سامان اپنے کمرے میں لے جانے کا ارادہ باندھ کے آگے بڑھی، آخر کچھ دیر پہلے اماں بھی تو اپنی سہیلی کے حق میں کس قدر بہادری اور دھڑلے سے بول رہی تھیں اور اکثر اماں کے فیصلوں پہ ابا سر جھکا دیتے تھے۔

"ہیں مگر یہ کیا ہوا تھا۔" مصباح کے تاثرات بے طرح گڑبڑائے، خاموشی سے بیٹھی اپنے آنسو پیتی وہ گھائل عورت اب پیچھے رہ گئی تھی اور اس کی اماں وہ ایریا چھوڑ کے آگے بڑھ چکی تھیں جہاں ان کی سہیلی اور بیٹی موجود تھیں، مصباح ماں کو حیرت سے تک رہی تھی۔

اگلے ہی لمحے اس کے دماغ میں اک جھماکا سا ہوا۔ کسی کو دن دہاڑے غارت کرنے کی بددعائیں ماں کی بہادری، وہ ہلدی ملا تیل، وہ مرہم پٹیاں یہ تمام بھاگ دوڑ کس کے لیے تھی ...... وہ یہ گتھی سلجھاتے ہی دنگ رہ گئی...... اس نے گوشی کے ساتھ کھڑے ہو کے سامنے کا منظر دیکھا جہاں اس کی ماں اپنی لاڈلی مرغی کو مرہم لگا رہی تھی۔

"اگر آئندہ اس نے میری مرغیوں کو چھیڑا تو میں اسے محلہ بدر کر دوں گی۔" اماں اپنا کام نپٹاتی ہوئی جیسے غرائی تھیں، مصباح نے تکلیف دہ آہ بھر کے چہار اطراف نگاہ دوڑائی......

پھر اس کی نگاہ ایک تنومند بلے پہ جم کے رہ گئی جو بہروز علی کے جوتوں کے پاس خوش باش بیٹھا تھا، جسے یقین تھا کہ وہ کبھی محلہ بدر نہیں ہوگا، جسے یقین تھا کہ یہاں آج بھی جنگل کا قانون رائج ہے۔ گوشی کی آنکھ سے بہنے والا واحد آنسو شاید بہت کڑوا تھا جسے وہ پی نہیں سکی، وہ ایک آنسو درد کا ایک ریلا تھا جو مصباح کو بہالے گیا۔

وہ پختہ ارادے کے ساتھ اٹھی۔

"میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔" معا اس کی نگاہ سامنے کی جانب اٹھی جہاں ایک تنومند اور خوش باش بلا زخمی مرغی پہ اپنی گھاگ نگاہ جمائے گھات لگا کے بیٹھا تھا جیسے وہ اپنے شکار کو دبوچنے کے لیے موقعہ کا منتظر ہوا۔ "صریحاً وہی گمراہ ہیں جو فلاح نہیں مانگتے۔"

سامان کی طرف بڑھتے اس کے ہاتھ ہوا میں معلق رہ گئے۔ تو کیا انسان آج بھی جنگل کے قانون میں جی رہا ہے وہ اپنے اٹل ارادوں سمیت وہیں کھڑے کھڑے مٹی کا ڈھیر ہوئی۔

☆☆☆

وہ گہری سیاہ رات ستاروں سے خالی تھی جیسے اس کی بوجھل آنکھیں نیند سے خالی تھیں۔ اس کی سوچ نے اک نئی کہانی گھڑی، اسے یقین ہو چلا تھا کہ ان دنوں نیند سیاہ آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔ اس نے اچھی خاصی پرزور کروٹ بدلی، عام حالات میں بھی مصباح کی نیند سے کچھ خاص دوستی نہیں تھی اب تو پھر معاملہ ہی الگ تھا، اس گھر کا دروازہ پار کرنے تک گوشی کی آنکھیں اس عورت کے وجود کا طواف کرتی رہیں جواب اس کے لیے مسز بہروز علی تھی۔ اس کی ماں کا رویہ جاہلانہ تھا۔ اس نے اپنے ذہن سے آج کی شام تلف کرنے کی آخری کوشش کی۔

اور اسی رات کے پہلے پہر میں سالم امین کے فارم ہاؤس کی خبر لیں تو وہ اپنے بیڈروم کے وسط میں کھڑا...... اپنے فون کی روشن اسکرین پہ انگلی چلاتے ہوئے ریسیوڈ کالز کا گزشتہ ریکارڈ چیک کر رہا تھا وہ ٹھنکا ریکارڈ میں صرف ایک کال انجان نمبر سے تھی۔ اس نے نمبر پش کیا...... اگر واقعی ان دنوں نیند سیاہ آنکھوں سے روٹھ چکی تھی تو یہ بات سچ تھی۔ وہ اب کال ریسیو ہونے کا منتظر تھا۔

اس کے آسودہ خالی چہرے پہ چند دنوں سے چھائی اکتاہٹ اس وقت عروج پہ تھی...... مصباح نے چھت کو گھورتے ہوئے ایک آہ بھری اور بیڈ سائیڈ لیمپ بھی آف کر دیا۔ تاکہ چھت کو تکتے رہنے کا مشغلہ دم توڑ دیتا۔ عین اسی وقت اس کا موبائل بج

اٹھا۔

آج وہ خود فراموشی کے موڈ میں تھی۔ آج وہ فارہ کے فون کی منتظر نہیں تھی، فارہ ایک سال سے جس مسئلے کا شکار تھی اب وہ مسئلہ تکلیف دہ صورت اختیار کر چکا تھا۔ مصباح اب اس کے سامنے اپنی پریشانی دہراتی رہتی تھی۔

فون کی بیل اس خاموش ماحول میں شور سے مشابہ تھی اس نے جھنجلا کے فون اٹھایا کہ فارہ کی ڈھٹائی قابل رشک تھی۔

کیا یہ بہت مشکل ہے کہ میں اپنی حالت سے فرار پا کے اپنی دوست سے اچھے موڈ میں بات کروں۔" سو وہ کال ریسیو کرتے ہی مسکرائی۔

"قسم سے فارہ ڈیئر! مجھے ایسی لوری سناؤ کہ میری گم شدہ نیند میری ان خوب صورت آنکھوں کا وصال پانے کو تڑپ تڑپ جائے۔" وہ ایک گلیشئر پگھلاتی آہ کے ساتھ مخاطب ہوئی تھی۔ سالم نے اپنے فون کو ذرا فاصلے پہ دیکھتے ہوئے بے یقینی سے گھورا...... کہ اس کے لیے اس لڑکی کا یہ لب ولہجہ ناقابل یقین تھا جو اسے اپنی دوست گردانتے ہوئے اب دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔

"سچ کہوں تو مجھے میر ——— (میر تقی میر) کی قسمت پہ رشک آتا ہے۔ کس قدر خوش قسمت تھا جو روتے روتے سو جاتا تھا جبکہ ہمیں تو۔" وہ ایک دم خاموش ہوئی کہ دوسری جانب کوئی ہلکا سا کھنکھارا تھا۔ اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ یہ ضرور طلحہ ہوگا میسنا ادھر سالم نے بات کرنے کا ارادہ باندھا مگر لب وا ہی رہ گئے۔ وہ لڑکی کس قدر باتونی تھی اس کے اعصاب جھنجھنا کے رہ گئے۔

"سنو طلحہ...... اگر میری بات نہیں مانو گے تو تم بھی نیند کو ترسو گے کہ نیند کا یہ قحط اب سیاہ آنکھوں کا مقدر ہوگا۔"

"اُف...... سالم کے دماغ نے چکر کھایا اور وہ قریبی صوفے پہ ڈھیر ہوا کہ اس کی برداشت بس اتنی ہی تھی۔"

"میں سالم امین ہوں اور آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ جب بولا تو اس کی دھیمی اور بھاری آواز کسی حد تک پرسکون تھی۔ مصباح کے بستر پہ جیسے بم پھٹا تھا، اچھل کر سیدھی ہوئی۔

یعنی کہ یہ بندہ واقعی سالم امین ہے مطلب کے۔" اب دونوں جانب خاموشی کا وقفہ تھا...... اس نے کچھ دیر پہلے جو بھی اول فول بکا، وہ سن چکا تھا اس پہ خفت اور غصے نے ایک ساتھ حملہ کیا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل قبول تھی۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس کی سرد اور سنجیدہ آواز دوبارہ مصباح کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دونوں اس وقت میرے پاس ہیں۔" وہ ایک نیا احساس تھا۔ کیا اس کی سماعتوں نے بھی مراد بر آنے کی نوید سنی ہو گی۔ دل خوشی سے دھڑکا لیکن کچھ تھا جو دھڑکنوں میں چھپا۔ گو کہ خبر جاندار تھی لیکن وہ خبر سنانے والا خود غرض تھا۔ کچھ تھا جسے سوچ کے وہ بے وجود ہوئی جیسے اسے اندھیرا نگل چکا تھا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ اسے کیفے ٹیریا کی وہ ٹیبل یاد آئی اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ اسے اس شخص کے انتظار میں مبتلا بے حساب وقت یاد آیا اسے اپنا شیفون کا دوپٹہ یاد آیا۔ اسے سالم امین کے چند جملے یاد آئے، وہ جیسے ہوش میں آئی۔

"آپ نے مجھ سے بات کرنے کی جرات کیسے کی۔" وہ ہتھے سے اکھڑی، سالم نے فون کو ناپسندیدگی سے گھورا۔

"اس قدر خوش کن خبر سنانے کا شکریہ اور میری طرف سے کل آپ پھولوں کا بکے وصول کر لیجیے گا۔ کیا آپ مجھ سے کوئی ایسی ہی بات سننے کے متوقع ہیں۔" وہ تڑخ کے بولی۔

"میں آپ کو جو بتانا چاہتا ہوں پہلے وہ سن لیں۔"

"مجھے بتانے کی ضرورت آپ کو تب پیش

آتی۔ اگر یہ سب میری خواہش پہ ہوا ہوتا۔" وہ اس کی بات کاٹ کے جیسے بھڑکی تھی۔

"آپ نے یہ کارنامہ اپنی وجہ سے انجام دیا ہے۔ اب وہ دونوں آپ کے پاس رہیں یا کالے چور کے پاس، مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ تیز تنفس کے ساتھ ہموار لہجے میں بولی۔

"اور آئندہ یہاں فون کرنے کی کوشش کی تو۔"

وہ اس کا پورا جملہ سننے سے قبل سختی کے ساتھ بولا۔

"قاضی اس لڑکی کو چھوڑ چکا ہے اور اب وہ فرار ہونا چاہتا ہے تو کیا میں اس لڑکی کو اس کے گھر ڈراپ کردوں۔" وہ اپنی تمام ناپسندیدگی اور اشتعال دباتے ہوئے ایک ایک لفظ پہ زور دیتا انتہائی ضبط سے بولا تھا۔ وہ ایک بار پھر جیسے ڈھے سی گئی۔ کیا اس کی سماعتوں نے اس سے قبل اتنی بُری خبر سنی ہوگی۔

"قاضی لڑکی کو چھوڑ کے بھاگ جانا چاہتا ہے۔" وہ صدمے سے بے حال ہوئے جا رہی تھی وہ ایک بار پھر بے وجود ہوئی جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ اسے پھر سے اندھیرا نگل چکا تھا۔

☆☆☆

اس کے خیال میں وہ اپنی نیند مکمل ہونے پہ بے دار ہوئی تھی۔ اس نے قریب پڑا فون اٹھا کے وقت دیکھا......

"او خدایا! وہ دھک سے رہ گئی کہ گھڑی کی چھوٹی سوئی چار کا ہندسہ پھلانگ چکی تھی وہ اگرچہ دن چڑھے ہی سوئی تھی مگر وہ اتنی طویل نیند کہاں لیتی تھی۔ اسے شبہ گزرا کہ آج کی سہ پہر اپنے سنہرے پن سے محروم ہے۔ اس نے پردہ سرکایا اس کا اندازہ درست تھا کہ آج جولائی کا تپتا سورج گہرے سیاہ بادلوں کی تحویل میں تھا۔ شاور لینے سے معمول کی تیاری تک اس کے تیس منٹ صرف ہوئے جبکہ اسے پانچ بجے اکیڈمی پہنچنا ہوتا تھا۔

وہ کمرے سے باہر آئی جہاں اک سکوت کا عالم تھا۔ وہ چائے بنانے کی غرض سے کچن کی طرف بڑھی پھر وہ سکتے میں رہ گئی جیسے گزشتہ شب بھاپ بن کے اڑ گئی تھی۔ وہ کل اپنی ماں کو جس پوزیشن میں چھوڑ کے اپنے کمرے میں گئی تھی وہ آج اس لمحے بھی اسی کام میں مصروف تھیں اپنی مرغی کے زخموں پہ مرہم لگاتے ہوئے انہوں نے پاس کھڑی بیٹی پہ خاموش نظر ڈالی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ناراض تھیں۔

مصباح نے آگے بڑھنے سے قبل چارپائی کے پہلو میں پڑے صوفے کو تکا، کل شب جس کی آنکھیں اس کی ماں کے وجود کا طواف کر رہی تھیں اب وہ عورت کہاں تھی۔ مصباح کا دل اپنی بے بسی پہ کٹ کے رہ گیا۔ اس کی نانی نے یقیناً اس کی ماں کی تربیت ایسی نہیں کی تھی کہ وہ تاعمر گوشی جیسی عورتوں سے دوستیاں نبھاتیں......

وہ پرانا صوفہ اب خالی تھا گویا رات آئی اور گزر گئی۔ وہ چونکی...... ہاں رات اس نے ایک کال ریسیو کی تھی...... گرم اور کڑوی چائے کے آخری گھونٹ تک وہ کچھ سوچتی رہی...... اگلے پانچ منٹ بعد وہ گلی میں تھی۔ ماں نے اس کی تربیت اس بنیاد پہ کی تھی کہ یہ گناہ ہے اور یہ ثواب...... اس نے چہار سو دیکھا۔ ایسے ہی گوشی کو بھی اس کی ماں نے گناہ اور ثواب کی تفریق بتائی ہوگی۔ وہ گناہ کی زندگی سے انکاری ہوئی۔

"کیا یہ ضروری تھا کہ گوشی بھی اپنی بیٹی پہ واضح کرتی۔ یہ گناہ ہے یہ ذلت ہے یہ ثواب ہے اس کا اجر ملے گا۔ کاش وہ اپنی بیٹی پہ یہ واضح نہ کرتی تو آج اس کی بیٹی دربدر ہوتی اور نہ ہی وہ خود در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہوتی اُفف۔" وہ کراہی اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرا کر مڑا تھا۔ خراب موسم کے باعث دن پہ رات کا رنگ غالب تھا۔ وہ کسی سوچ کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی وہ اچانک طلحہ کے گھر کے سامنے رکی۔ حال پہ ماضی کا رنگ غالب آیا۔

☆☆☆

ابھی وقت ایک عرصے میں کہاں ڈھلا تھا۔

یہی کوئی ایک ماہ پہلے وہ طلحہ کے ساتھ بحث کر رہی تھی اور وہ اسے سمجھا رہا تھا میرا مشورہ مانو تو قاضی والے معاملے سے دور رہو اور اگر تم میرے مشورے سے انکاری ہو تو اس کوشش کے لیے تمہارے پاس یہی وقت ہے۔ پھر مصباح کے چہرے پہ فیصلہ کن تاثرات پا کر جب طلحہ نے اسے اپنے پلان سے آگاہ کیا تو وہ متحیر رہ گئی۔ اس نے طلحہ کی اچھی بھلی شکل کو منہ بگاڑ کے دیکھا تھا۔

"بھئی ...... ذرا سی تیز ضرور ہوں مگر اتنی چالاک نہیں کہ ایک فلمی ہیروئن کی طرح چھلانگ مار کے وین کے اندر گھس جاؤں اور مالک کا گریبان پکڑ کے کہوں، اپنے ڈرائیور کے متعلق جو کچھ جانتے ہو ایک ہی سانس میں اگل دو ...... ورنہ گولی سے اڑا دوں گی۔" وہ اس صورت حال کا مزہ لے کر ہنسی پھر سنجیدہ شکل بنائے طلحہ کو کمرے سے باہر جاتا دیکھ کے اس کے راستے میں آ کر التجائیہ سی ہوئی۔

"دیکھو میری بات کو سمجھو۔ یہ سچویشن میرے مقام اور میری پرسنالٹی پہ سوٹ نہیں کرتی ...... کچھ ایسا سوچو کہ قاضی کے مالک سے کسی مناسب جگہ پہ بات چیت ممکن ہو سکے۔" مصباح کی خواہش پہ جواباً اس نے بے رحمی سے اسے گھورا۔

"ہنہ ......" وہ ہنکارا بھر کے بولا ...... "تم بات کرو گی اور وہ پوری تفصیل جاننے کے بعد تم سے وعدہ کرے گا کہ فکر نہ کریں مصباح صاحبہ میں جلد ہی اس خبیث کو ڈھونڈ کے سو جوتے لگاؤں گا۔" طلحہ تمسخر اڑاتا ہنسا۔

"او بی بی کس دنیا میں رہ رہی ہو ...... تمہاری بات سننے کے بعد وہ صاف مکر جائے گا کہ کون سا ڈلیوری مزدا، کہاں کا قاضی اور کیسی پھول منڈی ...... میں یہ سب تمہارے منہ سے پہلی بار سن رہا ہوں۔" طلحہ نے گنگ کھڑی اس لڑکی کی ساکن پلکوں کے آگے چٹکی بجائی۔

"میری اطلاع کے مطابق وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ ایک خود پسند شخص ہے۔" وہ طلحہ کے گھر کے سامنے رکی۔ وہ نیچے کھڑی ہے اور کمرے کی کھلی کھڑکی سے نیچے جھانک کے طلحہ اسے بتا رہا ہے۔

"سالم امین کسی کی پرواہ نہیں کرتا وہ ایک خود پسند......" "تم نے غلط کہا طلحہ۔" ...... وہ اس کا جملہ کاٹ کر منہ اٹھائے اٹھائے اسے بلند آواز میں جواب دیتی ہے۔" وہ خود پسند ہی نہیں بلکہ خود غرض بھی ہے وہ جواب دے کر پاؤں کی ہلکی موچ کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے۔

ٹھیک پونے گھنٹے بعد وہ ایک کیفے ٹیریا کے سامنے کھڑی گلاس وال سے اندر جھانکتی ہے۔ اسے اک منظر یاد آتا ہے کہ ابھی وہ وقت اک عرصے میں کہاں ڈھلا تھا۔ یہ بات زیادہ پرانی کب تھی کہ ٹیولپ ہال کے وسطی ٹیبل پہ نہایت قیمتی لباس زیب تن کیے ایک دلکش اور اسٹائلش لڑکی اپنی نم اور متحیر آنکھوں سے اپنی ٹیبل سے اٹھ کے جاتے ایک مغرور اور دراز قد شخص کی پشت کو تکے جا رہی ہے جو ابھی اس پہ اپنی نگاہ ٹکائے کہہ رہا تھا۔

"آپ چاہیں تو ہم ایک طویل عرصے تک ملتے رہیں گے۔" وہ بامشکل خود پہ قابو پا کے اسے دیکھ رہی ہے پھر وہ اپنی مسخ شدہ انا اور خودداری کے ساتھ چلائی۔

"مصباح علی کسی بھی خوب صورت ماحول میں مردوں کی سحر انگیز گفتگو سننے کی متلاشی لڑکیوں میں سے نہیں۔" وہ چلائی۔

"میں تمہاری یہ سڑی ہوئی شکل روز قیامت بھی دیکھنے کی خواہاں نہیں۔" مگر دونوں بار اس کی آواز گلے میں گھٹ کے رہ جاتی ہے۔ سالم نے اسے کیفے ٹیریا کے باہر کھڑے دیکھا تھا شاید اس لیے باہر کھڑی ہو کہ وہ مقررہ وقت سے بیس منٹ پہلے آ چکی تھی۔ اس نے نگاہ موڑی اور دھیان سامنے کھلی فائل پہ ٹکایا چند لمحوں بعد اس کا دھیان بے قابو ہو کے کیفے ٹیریا سے باہر بھاگا ...... وہ کسی گہرے دھیان کے ساتھ وہیں کھڑی تھی باہر بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

"تم اپنے کام پہ توجہ دو سالم۔" اس کے دماغ

نے فوری صلاح دی۔

"شاید میں گلٹ فیل کر رہا ہوں۔" وہ گردن کھجاتے ہوئے خجالت سے مسکرایا میسنے ارحم کے مشورے پہ۔

"تم ارحم کے مشوروں پہ پہلے بھی سوبار عمل کر چکے ہو۔" دماغ نے دوبارہ جرح کی۔

"اوشٹ یار۔" اس نے اپنے گرم دماغ کو ڈانٹا۔ وہ کیفے ٹیریا کا شیشے کا دروازہ دھکیلتی اندر آئی، اس نے ٹیولپ ہال کے وسطی ٹیبل پہ نگاہ ڈالی، اس نے یاد کیا وہ اسٹائلش لڑکی اپنا ریشمی دوپٹہ سنبھالتی سرخ اور تپے چہرے کے ساتھ اس کیفے ٹیریا کو بھسم ہو جانے کی بد دعائیں دیتی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ مصباح اس لڑکی پر ہنستی ہے، "بندے تیرے دعوؤں کی اوقات ہی کیا ہے" سالم اسے دور سے دیکھتا ہے جس کی بالیوں کے موتی پرکشش تھے، جو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔

☆☆☆

اس شخص کو اکیلے آتے دیکھ کر مصباح کی بے تابی کافور ہوئی حالانکہ کسی بھی عام جگہ پر جگنو کی موجودگی کا سوچنا حماقت تھا کہ آج کل اس کی خبر تصویروں کے ساتھ شائع ہو رہی تھی۔ وہ اسے ساتھ لے کر کیسے آسکتا تھا تو پھر وہ اس سے کہاں مل سکتی تھی۔

"میں اس سے ابھی ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے بے تاثر چہرے اور سپاٹ لب و لہجے میں کہا، وہ اس ترش اور تیکھی لڑکی کو غور سے دیکھ رہا تھا جس کے مزاج میں کڑواہٹ اور انداز میں متانت تھی جس نے آج براؤن دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا، جس کے دھاگے کھردرے اور برہم تھے اور تو اور ان گول بالیوں کے سفید موتی بھی اس دوپٹے کے ہم مزاج تھے۔

"اس سے ملنے کے لیے آپ کو میرے ساتھ فارم ہاؤس چلنا ہوگا۔" اس نے گہری سانس لے کر ہلکی آواز میں جواب دیا۔

سالم نے دیکھا اس کی پیشانی پر ابھرنے والی شکنیں تک اس کے دوپٹے کے دھاگوں سے مشابہہ تھیں۔ اب وہ اس کے سامنے یوں بیٹھی تھی، جیسے وہ اس آدمی کو پہچانتی ہی نہیں۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ وہ اس کے سامنے سے اٹھ کر چلی جائے گی۔ اسے حیرت کا سامنا تھا وہ اس سے زندگی میں کتنی بار ملا تھا پھر کیوں اسے اس کے مزاج کے تمام انداز ازبر تھے۔

اس نے بوجھل دماغ کے ساتھ سوچا۔ وہ فی الحال دل کی کلاس لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ عجب لڑکی تھی جس کے عام سے حلیے کو اچانک چار چاند لگ جاتے تھے اور وہ لمحوں میں بادشاہت اوڑھ لیتی تھی، اسے یاد آیا کہ وہ اچانک فقیری میں ڈھل کے کاسہ بھی پکڑ لیتی تھی۔ پھر وہ جیسے دھیرے دھیرے کسی قصر کی حدود سے باہر آئی اب وہ جیسے عام سی گلی میں کھڑی تھی۔

"ٹھیک ہے، ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ چند لمحوں بعد فیصلہ کن لہجے میں بولی تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔ باہر اب بھی بوندا باندی جاری تھی۔ ابھی وہ کیفے ٹیریا کے سامنے والی سڑک پر تھے جب ایک رینگتی ہوئی گاڑی نے سالم امین کی سیاہ سوک کے پہلو میں بریک لگائے اور پھر پچھلی نشست پر بیٹھی لڑکی کو دیکھ کے ارحم خاک ہوا تھا۔ مصباح پر تھمی ارحم کی نگاہ کا تاثر سالم کے لیے ناقابل فہم تھا مگر وہ اتنا سمجھ رہا تھا کہ اس کی گاڑی میں موجود لڑکی ارحم کی حالت سے غافل تھی۔

☆☆☆

جب اس نے اگلی نشست نظر انداز کرتے ہوئے عقبی دروازہ کھولا تھا تو اس گاڑی کے مالک کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ اس کی پیشانی نے لمحوں میں شکنوں کا جال بنا، وہ سوچ سکتا تھا کہ اس کی موجودگی میں کوئی لڑکی فرنٹ سیٹ نظر انداز کر سکتی ہے، اس شخص کی حالت کے پیش نظر مصباح کو مٹھی بھر سکون حاصل ہوا کہ اس شخص کی اوقات مٹھی بھر تو ضرور کم

ہوئی ہوگی۔ اس نے خاصے مزے سے سوچا تھا، وہ فارم ہاؤس آبادی سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کوفت میں مبتلا تھے۔

گاڑی نے چند سیکنڈ کے لیے اس جنگلہ نما آہنی گیٹ کے سامنے بریک لگائے۔ اگلے چند منٹوں تک اس سیاہ سوک نے اس فارم ہاؤس کے گرد ایک چکر کاٹا جسے اونچے لمبے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ تھی، اس فارم ہاؤس کے مغربی جانب تین چار کچے پکے سے گھر تھے۔ پھر گاڑی کے تیز ہارن پر فارم ہاؤس کا بھاری گیٹ فوری کھلا، وہ دونوں آگے پیچھے گاڑی سے نکلے، اس فارم ہاؤس میں ہُو کا عالم تھا۔ اس نے سالم امین کو سیدھ میں چلتے دیکھا، وہ الجھ کے رک گئی۔ ایک حد سے زیادہ اعتبار بھی خطرناک ہوتا ہے۔

شام ڈھل چکی تھی اور موسم خراب تھا، وہاں صرف پرندوں کی آوازیں تھیں اور فضا میں پھولوں کی باس سرسرا رہی تھی۔ سرگوشیاں کررہی تھی کہ مجھے تلاش کرنا کیا ممکن ہے، بالآخر مصباح کی بہادری دم توڑنے لگی۔ وہ کہنا چاہتی تھی اس ویرانے میں آگے کیا ہے اور......

''جگنو کہاں ہے رب نواز۔'' سالم کی بھاری اور بلند آواز نے اس سناٹے میں اک ارتعاش برپا کیا۔

''قاضی کو بھی بلاؤ۔'' مصباح کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی ایک لہر دوڑی۔ وہ ایک کمرے کے سامنے رکا پھر پلٹ کے مصباح کو دیکھا جس کا چہرہ زرد اور دل کی دھڑکن تیز ہوچکی تھی۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کو گھما کر مصباح کو اندر جانے کا اشارہ کیا، وہ من من بھر کر قدم اٹھاتی آگے بڑھی اور دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ پیچھے دروازہ کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

پھول منڈی اور ان کے محلے کی مشترکہ دیوار تعمیر ہورہی ہے، وہ خوشی سے اپنی پرمسرت نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتی ہے۔ وہ آسمان کو کب دیکھ رہی تھی، وہ آسمان کے مالک کو کھوج رہی تھی۔ آج اسے کائنات کے مالک سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ سب سے اوپری سیڑھی پر بیٹھی ہے اس کی پچھلی گلی میں کوری اینٹوں اور تازہ سیمنٹ کی خوشبو پھیلی۔ وہ اس خوشبو کو گہرے گہرے سانس بھر کے اپنے اندر اتارتی ہے، اب دیوار کی تعمیر ختم ہوچکی ہے۔ بچے بوڑھے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔

وہ کچھ پریشان ہے وہ کچھ اداس بھی ہے۔

اسے مولوی کی پتلی اور کھردری آواز یاد آئی۔

''پرہیز گاروں اور گناہ گاروں کا کیا ایک ساتھ رہنا ممکن ہے۔'' جب اس کا باپ دیر سے گھر آتا تھا تو اس کے آنے تک ماں پریشان رہتی تھی اور اب تو ابا شاید بھی، کیا اسے ماں کو بتادینا چاہیے۔ وہ ایک دم کھڑی ہوئی پھر وہ ساکت ہوئی۔ اس نے دہلیز پار کرکے اپنے باپ کو پتھرائی آنکھوں سے دیکھا۔

''شاید کام رک گیا ہو۔ شاید تعمیر ادھوری ہو۔''

وہ دوڑی اور منڈیر سے نیچے جھانکا۔ تعمیر مکمل ہوچکی تھی، وہ قد آور دیوار اس کی منڈیر سے ذرا نیچے تھی۔

وہ دوسری منڈیر کی طرف لپکی' پرچون کی دکان کا مالک، بخشو دھوبی، اکرم برف والا۔ جگنو کا باپ اور منان کریم عرف میاں صاحب وہ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اس کے جسم پر پسینہ اترا، اس قدر کہ وہ نہا گئی تو پھر......تو پھر دیوار کے اس طرف کون تھا۔ وہ پھر پچھلی منڈیر کی طرف بھاگی، دیوار کے اس طرف پارو تھی۔ تاشہ، منو، سانول، ماجد، اس کا بوڑھا دادا جی اور......

اور کچھ بچے گیلی سیمنٹ سے کھیل رہے تھے۔

کچھ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کو جوڑ کے گھر بنارہے تھے۔

کچھ اس اونچی دیوار کو دیکھ کے حیران ہورہے تھے، کچھ اداس تھے۔ چند بوڑھیاں اللہ کا شکر کررہی تھیں کہ پڑوسی محلے کے ان پرہیزگاروں سے ان کی جان

چھوٹی، ان کے بچے بھی اب محفوظ ہوگئے تھے۔
وہ اب چھت کی وسط میں کھڑی ہے تو پھر گناہ گار کون تھے۔ وہ اپنی لہو رنگ آنکھوں سے آسمان کو دیکھتی ہے۔ اسے آسمان سے گلہ نہیں، تابع چیزوں سے کیسا گلہ، اسے مالک سے گلہ تھا۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی، پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتی ہے، جانے وہ کیا چیز تھی جو ایک عرصے سے اس کی ہتھیلیوں میں چبھ رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کے روتی اس بچی پر آج منکشف ہوا تھا کہ اس کی نرم گلابی ہتھیلیوں پر چبھنے والی چیز کا نام بے بسی تھا۔

☆☆☆

کمرے میں داخل ہونے کے چند لمحوں بعد اس نے جان لیا تھا کہ اس کے عقب میں قاضی کھڑا ہے۔ اس نے پلٹ کے دیکھے بنا محسوس کیا کہ دہلیز سے ٹیک لگائے اس چھوٹی سی ریاست کے مالک شخص کو اس قصے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس ڈرامے کی آخری قسط دیکھنے کا بھی شائق نہیں تھا۔ وہ اس وقت وہاں آخری حکم صادر کرنے کے لیے موجود تھا۔ مصباح نے اپنے سامنے دیکھا جہاں اس کی مطلوبہ ہستی موجود تھی، وہ جگنو تھی، مصباح کا دل بھیگا۔

"یہ وہ جگنو تھی جو کبھی پورے طور چمکی۔ نہ کبھی اپنے مکمل پروں کی ساتھ اڑی۔ اس کی جوان اور بیوہ ماں تو دوسری شادی کی خواہاں ہی نہیں تھی۔ وہ تو لوگوں کے برتن دھو کر بھی اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال سکتی تھی۔ اس نے تو دوپہری بلاؤں اور زہریلی دستکوں کے خوف سے اک آگ برساتا سورج اپنے سر پر تان لیا تھا۔ جگنو کی بدقسمتی تھی کہ وہ سورج شام کے بعد بھی غروب نہیں ہوتا تو کیا پھر جگنو کا چمکنا ممکن تھا۔

"ادھورے پروں کی مالک اس لڑکی کو دیکھو۔" وہ پلٹ کے قاضی سے مخاطب ہوئی تھی اور چند قدم دور ہوتا سالم وہیں ٹھہر گیا۔

"اسے تم سے محبت ہوگئی تھی۔" اس کا مخاطب یقیناً قاضی تھا۔ سالم نے بے ساختہ گردن موڑ کے قاضی کو دیکھا گیا۔

"ایسے لوگ چاہے جاتے ہیں، کیا اب جگنو پورے طور چمکتی ہوگی۔ کیا تمہارا ساتھ پا کے وہ مکمل پروں کے ساتھ اڑتی ہوگی۔ یہ راز پانے کے لیے میں جہاں گشت ہوگئی تھی۔" اس کی آواز بھیگی۔ اس ریاست کے مالک نے کھلے دروازے کے اندر نگاہ دوڑائی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں گشت کیا سیاہ آنکھوں کے مالک ہوتے ہیں۔ "میں کیسے کیسے لوگوں کے سامنے فقیر ہو کے گڑگڑائی تھی۔" وہ عجب لڑکی تھی جو تلخ باتیں بھی کمال لہجے میں کرتی تھی۔
سالم نے اپنا چہرہ چھوا۔

"ایسے مالا مال فقیروں سے جان چھڑانے والے چہرے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔" وہ خاموش ہوگئی۔ وہ چند لمحے جگنو کا چہرہ دیکھتی رہی جیسے وہ جگنو نہیں تھی۔ مصباح جیسے کسی چولستان کا نظارہ کر رہی تھی، وہ صحرا جیسا وجود لیے اس کے سامنے بے حس کھڑی تھی۔

"بقول اس کے اس کا باپ مر چکا ہے اور ماں بے چاری سی عورت ہے تو پھر یہ کون ہے، جس نے سارے زمانے کو اس کے پیچھے لگا رکھا ہے۔ جب میں نے اپنے ذرائع سے تمام حقیقت جانی تو مجھے اس کی غلط بیانیوں نے، بہت دکھ دیا، میں ایسے چھپ کے زندگی نہیں گزار سکتا۔" وہ خاموش ہوا۔ اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

"ہم کورٹ میں جائیں گے۔ میں تمہارے حق میں بیان دوں گی۔" وہ ایک دم تڑپ کے قاضی کے سامنے آئی۔

"اب نہیں جگنو! اب میں جان گیا ہوں کہ تمہاری ماں کے شوہر نے تمہارے ساتھ......" قاضی کا لہجہ کانپا۔

"تمہاری منزل میں نہیں ہوں، تمہارا مقصد صرف اپنے گھر سے فرار حاصل کرنا ہے۔" قاضی نے اپنی آنکھوں میں اتری نمی تک سمیٹ لی تھی۔

”یہ تمہارے ساتھ جانے سے پہلے ایک چھوٹے جہنم میں تھی۔ اسے ایک بڑے جہنم کی سیر کروانے کے لیے تمہارا شکریہ۔“ اس نے جاتے ہوئے قاضی سے یہ آخری بات کی، جگنو نے جاتے ہوئے قاضی کو یوں دیکھا جیسے اس کی بینائی بھی وہ ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے آج صبح قاضی کا تمام حساب کتاب چکا دیا تھا، اب اس معاملے میں ملوث ان تینوں افراد کی اپنے اپنے ٹھکانوں پر روانگی طے تھی۔ اس نے قاضی کو خدا حافظ کہتے سنا، یہاں تک کہ وہ فارم ہاؤس کا گیٹ پار کر گیا۔ پھر چند لمحوں بعد سالم نے اس کہانی کے تیسرے کردار کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ جس کا دعویٰ تھا کہ اس کی سیاہ آنکھوں سے نیند ہجرت کر چکی ہے۔

”اس سب کے لیے بہت شکریہ۔“ وہ اپنے سفید پڑتے لبوں کے ساتھ ہولے سے بولی۔ سالم نے خاموش نگاہ سے اسے جاتے دیکھا پھر وہ ٹھٹکا۔ وہ اس جگنو نامی لڑکی کو کمرے میں چھوڑ کے خود اکیلی ہی جا رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا اس کے راستے میں آیا۔

”کیا آپ نے مجھے فارغ العقل سمجھ رکھا ہے، آپ اس لڑکی کو چھوڑ کے جا رہی ہیں۔ جسے پانے کے لیے آپ دیوانی ہو رہی تھیں۔“ اس کا لہجہ تند و تیز اور آواز میں اشتعال تھا۔

”میں کسی کو پناہ دے سکتی ہوں، نہ بچا سکتی ہوں۔ آپ بھلے اسے دارالامان بھجوا دیں۔“ اس کی خشک آواز میں تلخی تھی۔

”اس لڑکی کو کون نارمل کہہ سکتا تھا۔“ وہ تلملا کے رہ گیا۔

”آج کل اس طرح کے اداروں نے بھی عورت کو کمائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔“ وہ عجب حال کے ساتھ مسکرائی۔

”آپ ایسا کریں اسے گولی مار دیں۔“ اس نے حسب عادت اپنے شانوں کو خفیف سا جھٹکا۔ وہ یوں حیران ہوا، کیا اسے ابھی زمین نے اگلا تھا۔ اس کی چھوٹی سی روایت اس کے اپنے وجود سمیت درہم برہم ہوئی۔ اس نے اپنی شل نگاہ لڑکی کے وجود پر ٹکائی جو یقیناً نیم پاگل تھی، جو معاشرتی بدصورتیوں پر لپٹی خوشنما پیکنگ کو نوچ کے پھینک دینا چاہتی تھی، تب ہی اس کے شفاف رخساروں پر خشک آنسوؤں کی خوشبو پھوٹتی تھی۔

☆☆☆

وہ فارم ہاؤس کے اندرونی حصے میں آ گئے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی دیوار کے ساتھ چل رہے تھے۔ جسے گل عباسی کے پودوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس پختہ روش کے دوسری جانب ایک کیاری تھی جس میں پھل دار پیڑ تھے۔

وہ اچانک ٹھہری وہ لیموں کا ایک گھنا پیڑ تھا، اس نے گھونسلے میں موجود پرندے کی آواز کو غور سے سنا۔ سالم نے بلا ارادہ قدم جمائے اور اسے پلٹ کے دیکھا، جسے خود کو برتر رکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ گارڈن لائٹ کی مدھم اور زرد روشنی میں اس کی سیاہ آنکھیں نمایاں ہو رہی تھیں۔

”یہاں کا باسی پرندہ اس وقت کسی تکلیف کے باعث کراہ رہا ہے۔“ وہ اس کی توجہ خود پر مرکوز پا کے فوری گویا ہوئی۔ وہ اپنی حیرت چھپانے میں ناکام ہوا۔ اس نے خود سے دو رقدم آگے چلتی لڑکی کو رک کے دیکھا جس کی اوڑھنی کے دھاگے اس کا مزاج چرا لیتے تھے۔ جو اس وقت بہت خاموش اور بے حد نم تھے۔ یہاں اک دوراہا تھا، وہ وہیں ٹھہر گیا۔

اس آہنی گیٹ کے دوسری جانب ایک خوبرو مرد ٹیکسی سے ٹیک لگائے مصباح کے انتظار میں تھا۔ مصباح پورے سفر کے دوران محسوس نہیں کر پائی تھی کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور اسے عقب نما آئینے میں بار بار کیوں دیکھ رہا تھا، وہ اس قدر ڈپریسڈ تھی کہ اس احساس سے بھی غافل تھی کہ کوئی دوراہے پر کھڑا اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

"میرے ہاتھوں پر اس کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ میں چھڑا نہیں پائی، اس کیفیت پر میں اس قدر ہراساں تھی کہ چیخ بھی نہیں پائی۔ میں جانتی تھی کہ میری ایک چیخ میری بہن کے گھر کی بنیادیں ہلا سکتی ہے۔ اس لمحے میں نے اپنے اللہ سے مدد چاہی تھی پھر اماں دبے پاؤں چھت پر آ گئیں اور لوہے کا وہ زنگ آلود جھولا ساکن ہوا۔ وہ بے ضمیر شخص شرمندہ ہوا، نہ گھبرایا بلکہ اس نے کہانی کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس نے کہا۔

"فارہ میری یونیورسٹی فیلو تھی، ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ یہاں میرا پروپوزل فارہ کے لیے آیا تھا، آپ کی بڑی بیٹی صرف میری فیملی کی چوائس ہے۔ میں اپنی زندگی کا دوسرا فیصلہ کچھ ماہ تک کروں گا۔" اماں نے اسے خاموش نظروں سے دور تک دیکھا شاید وہ آخری سیڑھی بھی اتر گیا تھا، جب ماں کا زوردار تھپڑ میرے چہرے پر پڑا۔" مصباح نے بے یقینی کے عالم میں فارہ کو دیکھا جس کے رخسار پر تھپڑ کا نشان اب گہرا نیلا پڑ چکا تھا۔

"وہ مجھے چار تھپڑ اور بھی مار لیتیں، میں آہ تک نہ بھرتی مگر اماں کے منہ سے ادا ہونے والے ایک لفظ بے غیرت نے مجھے جو تکلیف پہنچائی ہے، وہ بیان سے بھی باہر ہے۔" وہ اب ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس وقت فارہ کے آنسوؤں کو تسلی بے معنی تھی، ان کا بہہ جانا زیادہ ضروری تھا۔

وہ اس ساکت ماحول میں فارہ کو خاموشی سے سن رہی تھی جس کی زندگی ایک سال پہلے تک بس خواب دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی اور وہ پچھلے ایک سال سے اپنے بہنوئی جیسے عذاب میں گرفتار تھی جو اس پر پہلے محدود وقت تک مسلط رہتا تھا لیکن جب سے اس کی بہن میکے میں مقیم تھی وہ شخص بھیانک بیماری کی طرح حد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ فارہ کی ماں کو بہت پہلے چونکنا چاہیے تھا کہ میرا داماد آخر اس قدر پانی کیوں پیتا ہے۔

وہ کسی دوسرے گھر کے کچن میں بار بار صرف پانی کے لیے جاتا ہے، وہ اپنی سالی کے کمرے میں منہ اٹھا کر کیوں جاتا ہے۔ اس کی موجودگی میں میری بیٹی کیوں ہراساں رہتی ہے، وہ اس سے کیوں کتراتی ہے۔ اسے اپنے داماد کے بدلے اندازوں نے کب جھنجوڑا تھا اور وہ کب سے اس کی تاک میں تھی مگر وہ غلط وقت پر چونکی تھی جب پانی سر تک آ پہنچا تھا۔ یہ سمندروں اور دریاؤں کا پانی نہیں تھا کہ ساحل اور کنارے چھوڑ دینے سے بات بن جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس بپھرے پانی سے اس کی بیٹی کا گھر بھی ڈوب سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ بے فکر رہتا تھا۔ جانتا تھا کہ دوسروں کی فکر انسان کو کمزور کر دیتی ہے، وہ سمجھتا تھا کہ حالات انسان کے عمل اور اس کی مرضی سے بدلتے ہیں۔ اس کی یہ تمام سوچیں جس قدر تیزی سے غلط ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ زندگی میں پہلی بار اندر تک چونکا تھا اور اس نے پہلی بار خود کو بے بس محسوس کیا تھا۔ اور وہ اب خود پر اپنا اختیار چاہتا تھا۔ اس نے حسب عادت ٹیرس پر آ کر چہار سو دیکھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ میں خوش گواری کا عنصر تھا، اس کی نگاہ لیموں کے گھنے پیڑ سے الجھی، جس کی شاخ سے ایک پنجرہ لٹک رہا تھا۔ پنجرے میں موجود پرندے کے زخم اب مندمل ہو رہے تھے۔

وہ لڑکی کیا اک گمان تھی یا کسی الف لیلیٰ قصے کا کردار تھی اور سالم امین کب سے کوہ قاف میں رہنے لگا تھا۔

"کیا تمہارا ساتھ پا کے وہ مکمل پروں کے ساتھ اڑتی ہوگی۔" اس نے لیموں کے پیڑ اور پنجرے سے نگاہ ہٹالی۔ مگر وہ جملہ اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا۔ اس نے کمرے کی مدھم لائٹ بھی بند کی۔

"یہ راز پانے کے لیے میں جہاں گشت ہو گئی تھی۔" وہ حدت دیتی آواز کہیں پاس سے ابھری، وہ

ساکت رہ گیا۔ وہ لہجہ اس کی سماعتوں نے کیوں کر سنبھال رکھا تھا۔

جگنو کون تھی۔ مصباح کون تھی۔ ان کی کہانی میں کتنی خوشی تھی اور کتنا دکھ تھا، سالم نے وہ افسانہ ابھی تک پڑھا ہی نہیں تھا پھر بھی اس لمحے اس اجنبی لہجے کی حدت سے اس کے بے نیاز اور لاپروا احساسات نے اک آگ سی پکڑلی تھی۔ اک چراغ سا جلا دیا تھا اور اس چراغ کی فسوں خیز روشنی میں وہ کسی مصباح کی جگنو کا پورا افسانہ پڑھنا چاہتا تھا۔ وہ اس افسانے کے باقی دو کرداروں کی زندگیاں سہل کرنا چاہتا تھا۔

اکیڈمی کی دوسری منزل پر کلاسز ختم ہونے کے بعد کشادہ لابی میں برپا بھیڑ بھاڑ کا عالم چند منٹوں میں چھٹ جاتا تھا۔ وہاں مصباح کے علاوہ اکا دکا لڑکیاں تھیں جو نوٹ شدہ لیکچر سمجھنے اور پھر ایک دوسرے سے ڈسکس کرنے کے بعد وہاں سے جاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ آج کا لیکچر ڈسکس کر رہی تھی، جب اسے ایک شناسا سا چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ مصباح نے جھرجھری لے کر آنے والے کو دیکھا۔ اس کے اعصاب پر بوجھ پڑا۔ پھر اس نے اسے ٹیرس کی طرف جاتے دیکھا۔ کیا خبر یہ کسی اور سے ملنے آیا ہو۔ وہ کچھ پرسکون ہوئی اور کیا خبر یہ کوئی اس سے مشابہہ شخص ہو وہ مزید پرسکون ہوئی۔ اس اکیڈمی میں اس کا کیا کام۔

اس نے اپنے قریب بیٹھی لڑکی سے بات جاری رکھتے ہوئے یوں ہی ٹیرس پر نگاہ ڈالی۔ اس نے سالم امین کو اپنی جانب متوجہ پایا۔ یہ چند دنوں کی مہلت چوبیس گھنٹوں میں کیسے ختم کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے خشک لبوں کو زبان پھیر کے تر کیا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے اپنے سمٹے ہوئے نوٹس ٹیبل پر بکھیرنے لگی۔

وہ مصباح کے اس مشغلے کو دیکھتا رہا، حتیٰ کہ ٹیرس پر اب واحد وہ شخص رہ گیا۔ مصباح نے نگاہ ذرا سی اٹھائی، یہ ایک سنگین حقیقت تھی کہ وہ سالم امین سے مشابہہ شخص نہیں تھا بلاشبہ وہ اس کیفے ٹیریا کا مالک تھا۔

وہ سر جھکائے بھی محسوس کر سکتی تھی کہ وہ اس کی الجھی شکل پر کس قدر غور و فکر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پاس بیٹھی لڑکیوں کو خدا حافظ کہتے سنا۔ اب اس نے فائل تھامی اور کندھے پر شولڈر بیگ ڈال کے کھڑی ہوئی تو اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھا، اس کے دل میں پکڑ دھکڑ ہوئی۔ ”میری طرف دیکھنے کی بھی تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔“ کاش وہ کہہ سکتی۔

”مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مخاطب ہوا۔

وہ اکیڈمی کمرشل علاقے میں نہیں تھی تب ہی اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا، وہ اس شخص سے چار قدم پیچھے تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑی اس کی کار پر مصباح نے ناگوار نظر ڈالی۔ اس نے گاڑی کے عقبی دروازے کو چھوا۔ وہ آج بھی مٹھی بھر سکون سے فیض یاب ہونا چاہتی تھی، دروازہ کھولنے سے قبل اس نے کیا کچھ نہیں سوچا تھا۔ جب ایک لگژری ریسٹورنٹ میں وہ اس کے عین مقابل ہوگا، تو وہ ہتک آمیز لہجے میں اس کے جملے اس کے منہ پر مار کے اٹھ آئے گی۔ وہ اسے سخت لہجہ اپناتے ہوئے حکم دے گی کہ جو بھی کہنا ہے کھڑے کھڑے کہو۔

اگلے ہی لمحے اس کا نہایت تیزی سے تیار پلان چھناکے سے ٹوٹا کہ وہ اپنی گاڑی پیچھے چھوڑتا، آہستہ قدموں کے ساتھ آگے جا رہا تھا۔

اس نے مٹھی کھول کے سکون کو آزاد کیا۔ اس شخص کا رخ اس پوش علاقے کے حد نگاہ پھیلے ایک سرسبز پارک کی طرف تھا جو وہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

کیا وہ اس کے تابع تھی۔ اس نے سوچا ضرور مگر

پیر پٹخنے سے پرہیز کیا۔ داخلی دروازے سے کافی ہٹ کے وہ پارک کا ایک گوشہ تھا جگہ قدرے خالی مگر وہاں روشنی کا تیز انتظام تھا۔ وہ پھولوں کی دکان کے عقب میں تھے، سالم نے وہاں موجود ایک کرسی سنبھالی، اسے اس کے مقابل ناچار بیٹھنا تھا۔ وہ ان سب کے لیے مشعلیں جلانا چاہتی تھی جو غلام گردشوں میں تھے، وہ بے بسی کے قید خانوں میں مقید انسانوں کو بااختیار دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے درمیانی ٹیبل پر اپنی فائل کو پٹخا اور اطراف میں دیکھا۔ اس فلاور شاپ کی عقبی دونوں کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اس حصے میں جیسمین اور ٹیولپ کی خوشبو کا شمار آوارہ گردوں ہوتا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس بھر کے خانہ بدوش خوشبو کو گھورا۔ یہ سارا عمل خلاف توقع تھا۔

"اس سب کے لیے آئی ایم سوری۔" اس نے براہ راست مصباح کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے جانے کس عمل کے لیے سوری کیا تھا، وہ اتنی بھی انجان نہیں تھی مگر اس کا لب ولہجہ ایسا تھا کہ وہ اسے براہ راست دیکھ نہیں پائی۔ وہ ٹیبل پر دھری فائل کو گھورتی رہی پھر جلد ہی اس کیفیت سے باہر آئی۔

"بہت زیادہ سوچنے کے بعد بھی سچ یہی ہے کہ میرے پاس اسے دارالامان چھوڑنے کے علاوہ فی الحال دوسرا کوئی آپشن نہیں۔" وہ کوئی بھی بات سننے سے قبل ہتھیار ڈال کے گویا ہوئی تھی۔ اس کے تاثرات میں پھر بھی مات نہیں تھی، ایک فیصلہ تھا۔ وہ بس رنجیدہ تھی۔

"لیکن میرے پاس ایک آپشن ہے۔" وہ اس کے پھیکے پڑتے چہرے پر نظر جما کے ہلکی آواز کے ساتھ گویا ہوا اور وہ جو رخ موڑے چائے کا ڈھابہ چلاتی عورت کی طرف متوجہ تھی، ایک دم چونک کے سیدھی ہوئی۔ اب سالم کا دل چاہا کہ خراب حال لوگوں کا ایک ہجوم ہو۔ وہ ہر ایک کے لیے اس لڑکی کے سامنے ایک نیا آپشن رکھتا جائے اور وہ ایسے ہی پورے دھیان کی ساتھ اسے تکتی رہے۔

"ان تمام الجھنوں کا حل یہ ہے کہ اس لڑکی کی شادی کردی جائے۔" وہ یہ بات اس قدر سہل انداز میں کر رہا تھا، اس پارک میں سینکڑوں لوگ ہوں گے، ان میں سے کوئی ایک بھی مصباح کی مانند حیران نہیں ہوگا، چند لمحوں بعد اس چہرے پر حیرت کی جگہ یاسیت نے گھیر لی۔

"جس شخص نے اس سے عہد و پیمان باندھے تھے جب تمام حقیقت جان کر وہ پیچھے ہٹ گیا تو کسی اور سے کیا امید ہے۔" وہ انتہائی تلخ ہو رہی تھی۔ سالم نے محسوس کیا کہ بھاپ صرف ڈھابے کی چمنی ہی سے نہیں اٹھ رہی تھی، تب ہی ایک چھوٹی بچی نے پاس آ کر ان سے چائے کی بابت پوچھا۔ سالم نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے اس بے سکون لڑکی کو دیکھا جو شاید کسی کی سمجھ میں تو آتی ہوگی۔

"ایک شخص ہے جو اسے اپنانا چاہتا ہے۔" یہ جملہ سننے کے بعد بھی اس کی اندازِ نشست میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ کہاں متوجہ تھی۔

"وہ معاملہ فہم ہے، سمجھ دار ہے۔ کل کلاں کو اگر بات کھل بھی جائے گی تو...... تو وہ قانوناً حل کرنے کے لیے کوٹ کچہری افورڈ کرسکتا ہے۔ ہاں وہ اس لڑکی سے عمر میں کافی بڑا ہے اور......"

"کیا وہ حقیقت جانتا ہے کہ جگنو کی ماں کا شوہر اس کے ساتھ......" وہ اس کا جملہ کاٹ کے بولی تھی مگر اس کی مجتمع ہمت راستے میں ہی بکھر گئی۔ سالم نے ایک تکلیف محسوس کی، جیسے ڈھابے کی تمام گرم چائے اس پر اچھال دی گئی ہو۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے لفظ "ہاں" کہنے کے ساتھ سر کو بھی اثبات میں ہلایا۔

اور یہ بھی بتا دیا کہ آج دوپہر کو جب رب نواز نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ خود اتنا ہی حیران تھا جس حالت میں ابھی وہ تھی۔ میں نے مصباح بی بی کی بھاگ دوڑ سے سیکھا کہ کوئی ایک فرد بھی خدا کی

حدیں توڑنے والوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو حدیں توڑنے والے ہارنے لگتے ہیں۔ ہار جاتے ہیں۔ پارک کے اس روشن حصے میں وہ اس لڑکی کے جواب کا منتظر تھا، جس نے چند پُراذیت سانس ہوا کے سپرد کیے تھے اور آوارہ گرد خوشبو جھلس کے رہ گئی تھی۔

وہ انکار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ رب نواز کے جملے یقین دلا رہے تھے وہ عہد و پیمان توڑنے والوں میں سے نہیں۔ وہ میز پر چائے رکھتی، بچی کو دیکھ کے دھیرے سے مسکرائی۔ سالم نے پیالیوں کی جگہ بنانے کے لیے اس کی فائل کو ہاتھ سے پرے کیا۔ اس نے دیکھا کہ ان گول بالیوں کے سفید موتیوں کو یہ بے تکلفی ناگوار گزری تھی، وہ اب اگلا پروگرام طے کر رہا تھا اور وہ اس کی بات سنتے ہوئے چائے کی پیالی سے جانے کیا کھوج رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے اختتامی مراحل کی جانب گامزن شام پر اک ٹھنڈی نگاہ ڈالی پھر جھک کے جوتے کا بکل بند کرنا چاہا۔

''اف! او اماں! کبھی جوتے صاف کرنے والا کپڑا بھی دھلوا لیا کریں۔'' اس نے اس برتن کو ناپسندیدگی سے دیکھا جس میں اس کی ماں دودھ ڈال رہی تھی۔ آس پاس ٹہلتی مرغیوں کا تاثر بھی مصباح کے لگ بھگ تھا جبکہ دودھ کے برتن کی طرف آتے بلے کے چہرے پر غرور تھا۔ مصباح نے سیدھی ہو کر بیگ سے ٹشو نکالا، اب وہ جوتا چمکا رہی تھی۔

''تم باپ بیٹی اس قدر آوارہ جوتیاں جانے کہاں سے خریدتے ہو جن کی قسمت میں اتوار کو بھی آرام نہیں۔'' اس کی ماں نے اسے جھاڑتے ہوئے اک نگاہ کمرے پر بھی ڈالی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس گھر کا مالک بھی اندر اپنا جوتا چمکا رہا تھا، ماں کی بات پر اسے ہنسی آ گئی۔

''اکیڈمی تو آج بند ہوتی ہے۔'' یعنی آج ابا نے اماں سے حساب کتاب مانگا تھا اور اب وہ اس کے سر پر کھڑی شوہر پر ثابت کر رہی تھیں کہ میں بھی اپنی زبان سے کام لیتی ہوں۔ ''مجھے ایک کام ہے اور میں اکیلی نہیں طلحہ کے ساتھ جا رہی ہوں۔'' وہ بعجلت گویا ہوئی اور تہہ شدہ چادر کو کھولا۔ اماں نے صحن کی جانب آتے شوہر کو ہڑبڑا کے دیکھا جن کی نگاہ میں غصہ تھا۔ انہوں نے نگاہ چرائی کہ بہروز کو طلحہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

''پہلے کی بات اور تھی اب تمہارا رشتہ طے ہو چکا ہے، اب اس لڑکے کے ساتھ ہر وقت کا آنا جانا چھوڑ دو۔'' انہوں نے بیٹی پر عصیلی نگاہ ڈالی۔

''طلحہ میرے بھائی جیسا ہے۔'' اس نے چادر اوڑھتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

''مگر وہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔'' اس کے دوبدو جواب پر اماں مشتعل ہوئیں۔

''میں اسے بھائی سمجھتی ہوں۔'' وہ اپنی نیت پر مغرور ہوئی اس کی گردن میں جیسے سریا سا لگا۔ بہروز نے بیٹی کا چہرہ ٹھہر کے دیکھا۔

''وہاب سچ کہتا تھا خاندان کی باقی لڑکیاں کیا اس قدر آزاد تھیں۔'' انہیں بیٹی کا رویہ خوف زدہ کرتا تھا۔

''تمہارا اسے بھائی سمجھنا دنیا کی سمجھ میں کبھی نہیں آ سکتا مصباح۔'' ماں کی آواز نے پینترا بدل کے اسے سمجھانا چاہا۔

''مگر اللہ تو سمجھتا ہے نا اماں، اور میں دنیا سے نہیں روزِ حساب سے ڈرتی ہوں۔'' اس کی آواز بلند تھی، وہ دودھ کی طرف لپکتے بلے کے پیچھے چل دی۔ دہلیز پار کرتے بہروز علی کے قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہوئے۔ انہیں روز حساب سے ڈرنے والی کا چہرہ دیکھنا پڑا۔ بلے نے دودھ پینا چاہا۔

''روز حساب اپنی جگہ اٹل ہے مگر دنیا میں رہتے ہوئے دنیاداری کو دیکھنا پڑتا ہے۔'' اس بار وہ توقع کے خلاف بھڑک کے بولی تھیں۔ دودھ کے پاس مغرور بلا دور بیٹھی مرغیوں پر غرایا۔

"اب کون دنیاداری سے ڈرتا ہے، اب ہر کوئی دوسرے کو ڈراتا ہے۔" مصباح نے جوتے کی نوک سے دودھ سے بھرا برتن الٹ دیا۔ گھر کے آنگن میں سکڑ کے بیٹھی مرغیوں نے قہقہے لگائے، وہ کھمن گھیری ڈال کے ناچ اٹھیں۔

"ہا...... ہائے۔" اماں نے اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھ کے جامد کھڑے شوہر کو دیکھا۔

"اس نے پالتو مرغیوں کا بھی جینا حرام کر رکھا ہے۔" وہ مسکرا کے پیچھے ہٹی۔ بہروز نے بامشکل دہلیز پار کی۔

"یہاں روز حساب کا ڈر کسے ہے اماں! ہر کوئی بے بسی سے ڈرتا ہے۔" اس نے چارپائی پر پڑا فون اٹھایا۔ آج پھر بہروز علی کی مٹھیوں میں ایک چیز چھپی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پائے کہ وہ کیا تھی۔ مرغیاں بلے کا مایوس چہرہ دیکھ کے رقص کے انداز بدل رہی تھیں۔ اس نے کچھ نزاکت سے اٹھایا پھر وہ حق دق کھڑی ماں کے گلے کا ہار بنی۔

"میری توبہ اماں اگر آئندہ اس قدر آوارہ جوتیاں خریدوں۔" وہ دوبارہ مسکرائی۔

"دماغ چل گیا ہے اس کا۔" اسے اپنے عقب میں ماں کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

☆☆☆

اس کے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز، پرمسرت اور دل فریب تھا۔ وہ گنگ بیٹھی بس مصباح کو بولتے سن رہی تھی، گوشی وہ محلہ چھوڑ کے ہنی کے پاس آ گئی تھی۔ وہ اس وقت ہنی کے اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ہنی جو اس وقت سپر اسٹار تھی۔ شہر کے پوش علاقے میں بنے اس پرتعیش اپارٹمنٹ میں اس وقت چار افراد موجود تھے۔ طلحہ نے لاؤنج کے قد آدم شیشے کی کھڑکی سے حد نگاہ تک نظر آتے شہر کو دیکھا۔

اس امپورٹڈ شیشے سے باہر چھائی پہر نیلگوں ہو رہی تھی۔ دولت بھی عجیب چیز ہے۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ٹھہری، اسے نہیں پتا کہ اس نے بھی ہنی نامی لڑکی کو نظر بھر کے دیکھا ہوگا اور اسے پتا تھا کہ اسے سامنے پا کے ہنی کی نظر کہیں اور ٹھہری نہ ہوگی۔ اب وہاں مصباح اور گوشی ہر بات کر لینے کے بعد خاموش ہو چکی تھیں، تب ہی وہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ اپنی ملازمہ کے ہمراہ لاؤنج میں آئی۔ اسے توقع تھی کہ وہ بہت ماڈرن لباس میں ہوگی اور اس کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ جمائے ملازمہ کو آرڈر دیتے ہوئے اس پر اپنی دولت کا رعب جمائے گی کہ وہ وقتاً فوقتاً اس کی ہر پیش کش ٹھکرا چکا تھا۔

گو کہ طلحہ اب پھول منڈی سے اپنی دکان کہیں اور شفٹ کر چکا تھا۔ مگر ہنی کے پیغام اسے اب بھی ملتے رہتے تھے۔

"انعم تم ٹیبل سیٹ کر دو، چائے میں خود بناؤں گی۔" اس نے ملازمہ کو نرمی سے مخاطب کیا اور قالین پر دو زانو بیٹھ گئی۔

وہ نہ صرف خوش اخلاق تھی بلکہ بے حد حسین بھی تھی، وہ اس وقت بالکل سادہ حلیے میں تھی۔ اس نے اپنے لمبے سنہرے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ طلحہ کی نگاہ کھڑکی سے باہر بھٹکتی تھی۔ جانے وہ اس میں کیا تلاش کر رہا تھا اور ہنی کی نگاہ اس کپ پر تھی جس میں وہ طلحہ کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ وہ کپ کی آرائش کیونکر کر سکتی تھی، وہ پہلی اور شاید آخری بار اس کا مہمان تھا۔ وہ کانچ کے اس کپ پر ہیرے موتی بھی جڑ دیتی تو کم تھا۔

"میں گوشی آنٹی کو یہی سمجھا رہی تھی کہ جگنو کو بس باوفا ساتھی چاہیے تھا ورنہ آپ کی بیٹی ہر اس دولت سے مالا مال ہے جو کبھی کم پڑتی ہے نہ زوال پذیر ہوتی ہے۔" وہ دھیمی آواز میں کہتی ہلکا سا مسکرائی، وہ چونکا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔ مصباح ان دونوں پر ایک سادہ سی نظر ڈال کے رہ گئی۔

"مثلاً کیا؟" اس نے ہنی سے بے ارادہ ہی پوچھا جو اس وقت اپنے وجود میں لو جلائے بیٹھی تھی۔

”مثلاً تعلیم، تہذیب، طریقہ، رکھ رکھاؤ، صبر شکر وغیرہ۔ یہ تمام نعمتیں متاعِ زندگی ہیں مصباح! میری امی کہتی تھیں ان تمام نعمتوں کو ایک آنہ خرچ کیے بنا اپنایا جاسکتا ہے۔ باقی روپیہ پیسہ تو خریداری کے کام آتا ہے۔“ اس نے شائستگی سے بات مکمل کی اور کندھوں کو نرم سی جنبش کے ساتھ اچکایا۔ ہنی کا دل فریب مہمان جیسے سوتے سے جاگا تھا، وہ خیالات کی اس قدر ہم آہنگی پر پتھر کے بت میں ڈھلا۔

اس کی متحیر نگاہ ہنی کا چہرہ چھو کے امپورٹڈ شیشے کے باہر بھٹکی۔ شہر حد نگاہ تک ختم نہیں ہوجاتے، کسی کو تلاش کرنا جاں گسل عمل ہے۔ اس کے لیے جہاں بھر کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ وہ کس کو سوچ رہا تھا اور ہنی اس کو دیکھ رہی تھی جو خوبرو تھا، جس کی عادات و اطوار میں شائستگی تھی، جو صبح سے رات گئے تک سگریٹ پان کی دکان چلاتا تھا پھر بھی اسے پانے کے لیے وہ زمانے بھر کی خاک چھاننے کو تیار تھی۔

☆☆☆

”میں اماں کو یقین دلا دلا کے تھک چکی ہوں کہ آپ کا داماد جھوٹ بولتا ہے۔“ اس کے لہجے سے ہمت نچڑ چکی تھی۔

”اماں کو میری کسی بات پر اعتبار نہیں۔“ اس نے مصباح کا ٹھنڈا ہاتھ تھاما۔

”جب وہ قاضی کے ساتھ اس فارم ہاؤس میں سبز باغ دیکھنے جاتی تھی تو کیا وہ جانتی تھی کہ وہ اسی فارم ہاؤس میں کسی اور کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔“ مصباح نے محسوس کیا کہ اس کی بات سنتے ہی فارہ کے ہاتھ نے حرارت کھودی تھی۔

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری ماں نے آناً فاناً جو فیصلہ کیا ہے تو کیا میری تقدیر اس کے پچاس سالہ بھانجے کے ساتھ لکھی جا چکی ہے۔“ اس نے اپنی اکلوتی دوست کا چہرہ بے یقینی سے دیکھا۔ پہلی تاریخوں کا چاند بھی آنکھوں کا دکھ روشن کررہا تھا۔ وہ مصباح کے چہرے پہ کیا پڑھنا چاہتی تھی، وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو وہ طلحہ سے متعلق کرتی تھی، وہ ذومعنی جملے جو وہ وقتاً فوقتاً بولتی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کی گفتگو سے طلحہ گم ہوچکا تھا۔ فارہ کے دل کو دھکا سا لگا، آخر ایسا کیوں تھا وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

”تم دیکھنا مصباح! میں طلحہ کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔“ وہ جملہ ایک شعلہ تھا، جس میں مصباح کو بھڑ بھڑ جلنا چاہیے تھا مگر اس کے سپاٹ چہرے پر ہلکا سا تفکر بکھرا اور تب ہی ان دونوں کی سرد ہتھیلیوں کے بیچ ایک عہد گم ہوا۔ وہ محلہ اور اس کی گلیاں گم ہوئیں، ایک محبت گم ہوئی۔ وہ طلحہ کو کھوچکی تھی جیسے وہ ستم گر اس کی آرزو کھوچکا تھا۔

”وہ گوشی جیسی بائیں ہوتی ہیں جن کی بیٹیاں گھر سے بھاگتی ہیں۔ تمہیں ایسا کہنا بھی زیب نہیں دیتا۔“ جانے کب تک وہ ایک دوسرے کو تکتی رہیں۔ اس نے فارہ کی بات کو اس کے منہ پر ایک چابک کی طرح مارا تھا تو کیا وہ نہ سوچتی کہ جگنو ایسی ہی بے بسی میں مبتلا تھی۔ اس کی سہیلی نے اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔

”نہیں...... جگنو اس سے کہیں زیادہ بے بسی کا شکار تھی۔“ اس کا جواب خاموشی نے دیا تھا۔

”اگر تم اپنی ماں کے پچاس سالہ بھانجے کے ساتھ چپ چاپ رخصت ہوجاؤ گی تو تمہاری ماں کی زندگی آسان ہوجائے گی۔“ اب فارہ نے نگاہ جھکالی تھی اور مصباح نے رخ موڑ لیا تھا کہ ضبط اب بچہ بن رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت صحن کے ایک نیم تاریک حصے میں تھیں، ان کی گفتگو میں ابھی ابھی گلاب مرجھائے تھے کہ امید کی تمام تتلیاں لمحوں میں اڑ گئیں، ابھی کسی نام کا چراغ بجھا تھا کہ سلگتی بات کا کڑوا دھواں فضا میں پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

”کبھی میں بھی اس امتحان کی تیاری میں آپ ہی کی طرح کانشس تھا، اگرچہ میں نے تینوں چانس کھودیے تھے مگر میرے پاس تاج بہت ہے۔“ وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ وہ مبہم سی پیش کش

اک رابطے کی طرف اشارہ تھا۔ اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے درختوں پر نگاہ ڈالی، جن کی شاخوں کے دوسری طرف سورج ڈوب رہا تھا۔

"ہر خواہش کو زوال ہے۔" اس نے دل گرفتگی سے سر جھٹکا۔ اسے گوشی نے ایک باکس دیا تھا کہ یہ جگنو کی امانت ہے۔ وہ اس امانت کو جلد جگنو تک پہنچانا چاہتی تھی۔ اس لیے آج اس نے سالم کو اکیڈمی کے بعد کا وقت دیا تھا۔ جب وہ نیچے آئی تو وہ اکیڈمی کے مین گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ پھر وہ دونوں ساتھ چلتے پارک کے جنگلے کے پاس آ گئے۔ مصباح نے اپنا بیگ کھنگالا اور وہ نیلا باکس اس کے سپرد کیا۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس نے ایک آدھ بار ہی اس کے چہرے سے نظر ہٹائی ہوگی۔ اس کے بدلے انداز اسے کوفت میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس کے کانوں میں ارحم کی آواز گونجی۔

"تو جس لڑکی کو پٹانے کے چکر میں ہے وہ نیم پاگل ہے یار۔ اس کی اپنی زندگی ابھی صفر کے مدار میں ہے۔ وہ لوگوں کے مسائل میں ایسے گھستی ہے جیسے رگوں میں لہو۔ وہ ایک بیماری کا شکار ہے اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ یونیورسٹی میں اسے سب سائیکو کہتے تھے۔ اگر تیرے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال پنپ رہا ہے تو باز آ جا یار۔" ارحم نے اپنی طرف سے اسے جی بھر کے ڈرایا تھا اور وہ دنیا کا پہلا شخص ہوگا جو ڈرنے کے باوجود مسکرا رہا تھا اور صرف چند گھنٹوں بعد اس کا میسج پڑھتے ہی وہ اس کے دیے وقت سے پہلے اکیڈمی کے گیٹ پر موجود تھا۔ اب پاپولر اور سنبل کے درختوں تلے سڑک کنارے کھڑا وہ شخص اس کے زرد چہرے اور الجھی پلکوں کو تکے جا رہا تھا جسے وہ خود بھی پاگل خانے سے بھاگی ہوئی سمجھتا تھا۔

"جگنو کی رہائش اسی فارم ہاؤس میں ہے۔"

اس کی آواز نے نگاہ کا ارتکاز توڑا اور اس کا سوال انتظار کا پیغام تھا کہ اس فارم ہاؤس کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے مدتوں بیٹھا جا سکتا تھا۔ وہ مسکرایا۔

"یہ ایک مشکل سوال ہے۔" وہ آنکھیں سکیڑ کے حیران ہوئی۔

"اس کا جواب بعد میں دوں گا۔" وہ ایک محظوظ سا تاثر دیتا۔ اسے ایک بار پھر رابطے پر اکسا رہا تھا۔ مصباح نے جیسے کلس کے اپنی راہ پکڑی مگر وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا ایک جہاں گرد پرندہ شاخ کی طرف لپکا، اس نے سانس بحال کر کے اپنے پر سمیٹے۔ سالم نے دور جاتی اس لڑکی کو دیکھا۔ اس نے بھی وہ لمحہ اپنی نگاہ میں سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

"ہم نے تو ایسی شادی دیکھی نہ سنی...... کوئی کارڈ نہ شگن، نہ ڈھولک گانے اور تو اور گلی میں شامیانے تک نہیں لگے بس گھر میں ہی چپ چپاتے نکاح اور پھر رخصتی، توبہ توبہ۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے ہاتھوں کو تیز حرکت دی...... ساتھ ہی ثریا کو ایک دھموکا جڑا...... طلحہ نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھا جس کے پیندے پر ڈسپرین کے بچے کچھ ذرات تھے۔

"تو ٹک کے نہیں بیٹھ سکتی، رکشے والے کو منٹ دو منٹ انتظار کرنا پڑ جائے۔ تو نگوڑمارے ریٹ بڑھا دیتے ہیں۔" ثریا کے بال سنورتے ہوئے اس کی نظر طلحہ پر تھی جس کے وجود پر آج تھکاوٹ غالب تھی۔

"ابھی گھنٹہ بھر پہلے تو نے پیناڈول لی تھی۔" وہ حقیقتاً پریشان ہوئی۔ ایک طلحہ ہی تو تھا جس کے لیے وہ فکرمند ہوتی تھی۔

"بس یونہی درد ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔" وہ قریبی چارپائی پر لیٹتے ہوئے پژمردگی سے بولا۔

"اماں رکشہ آ گیا ہے۔" گڈو نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھولا۔

"ہائے ہائے ایسا دھاڑنے کی کیا ضرورت تھی جیسے رکشہ نہیں ڈاکو پکڑ کے لایا ہو۔"

ماں نے اسے ہاتھ میں موجود کنگھا مار کے

سمجھایا طلحہ کے لیے یہ منظر تکلیف دہ تھا۔
"اک ذرا سر میں درد ہی تو تھا اب مجھے آپا کے سامنے سو بہانے گھڑنے ہوں گے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔
(یہ اک ذرا درد نہیں ہے اس نے آنکھیں زور سے میچیں)
"بھائی کنڈی لگا لینا۔" سب سے آخر میں ویدو تھا۔
"لو...... اب اس تاکید کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کمبخت تو پڑ گیا نا شک میں...... کہ گھر میں خوب مال و دولت ہو گا۔" اس نے رکشے والے کی طرف اشارہ کیا۔ جسے لفظ کمبخت ناگوار گزرا تھا...... وہ بچوں کو رکشے میں بھرتے ہوئے گڈو پر غرائی۔
"تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ رکشہ منگواتے وقت ڈرائیور کی ہڈی پسلی دیکھ لیا کر۔ دو بچوں کو آگے بٹھانا ہوتا ہے۔" ڈرائیور بے چارا بوکھلا کے سمٹ سا گیا جو پہلے ہی الف کی مانند تھا۔
"بی بی اب کیا ہڈیاں بھی غائب کر دوں۔" اس کی جلی کٹی آواز پر بچوں نے مشترکہ قہقہہ لگایا تھا۔ طلحہ کے سر درد میں مزید اضافہ ہوا۔ بچوں نے کیسے ماں کی زبان اپنائی تھی۔

☆☆☆

شاید وہ سو گیا تھا یا جاگ رہا تھا یا پھر قدموں کی تلخ آہٹ پر چونکا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کے آنے والے کو دیکھا...... اگلے لمحے وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔ وہ خود اس سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ اسے پکارنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ گئی۔ جیسے اپنا تمام قیمتی سامان گاڑی میں رکھ کے اسے گھر میں موجود وہ قیمتی چیز یاد آ گئی تھی جس کے بغیر سفر کتنا مشکل تھا۔ صحن میں جلتے اکلوتے بلب کی روشنی میں وہ اسے دیکھتا رہا۔
"میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔" وہ جیسے سرگوشی میں بولا تھا۔
"میں کبھی واپس نہیں آؤں گی۔" اس کے سرد الفاظ بے جان تھے۔ وہ ان الفاظ کی مانند ہوا۔ اب اس لڑکی کا چہرہ خواب ہو جائے گا۔ اس کی آواز میں جاڑا تھا۔ وہ ٹھٹھر کے رہ گیا۔
"یہ ایک فضول بات ہے۔" اسے سچ مچ غصہ آ گیا۔ "کیا لوگ جدا نہیں ہوتے" وہ لمبے ڈگ بھرتا بورڈ کے پاس پہنچا۔ اس نے صحن کی باقی بتیاں بھی جلائیں۔ مگر وہ اندھیرے سے باہر نہیں آیا۔
"کیا جدا ہونے کی کوئی ایسی کڑی شرط رکھتا ہے۔" اس کی سانسیں ابھی سے —— جل رہی تھیں۔ ایک بار وہ پھر اس کے مقابل تھا۔
"میں سچ کہہ رہی ہو طلحہ! میں کبھی واپس نہیں آؤں گی۔" محبت کی دلدل نے مزاج بدل لیا تھا وہ اب ایک سفاکیت سے طلحہ کا وجود نیچے بہت نیچے کھینچ رہی تھی۔
"تمہیں خبر ہی نہیں۔" وہ سر جھٹک کے ہنسا۔
"محبوب چہروں کے چھپ جانے سے بستیاں اُجڑ جاتی ہیں اور اللہ کو آبادیاں پسند ہیں فارہ۔ تم مجھے برباد کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی ہو۔"
"تم نے مجھے صرف ایک لڑکی سمجھا...... اور تم نے ایک لڑکی کو چھوڑ دیا۔" وہ اس کی بات ان سنی کر کے تیزی کے ساتھ بولی تھی۔ اس کی آواز میں صرف ریت تھی۔
"اگر طلحہ نوید تمہیں ایک لڑکی سمجھتا تو تمہارا جینا حرام کر دیتا۔" اس نے فارہ کی گردن پر بکھرے ملائم بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا تھا۔ اس کی پتھرائی آنکھیں لمحوں میں بھیگیں۔ وہ اس کی گیلی آنکھوں کی تکلیف دیکھتا رہا۔
"تمہیں ایک لڑکی ہی تو نہیں سمجھا...... جو سمجھا...... وہ کبھی تم پر عیاں نہیں کر سکتا۔" وہ آواز مدھم ترین تھی اس نے اپنی مٹھی کھولی اور اس کے نرم بالوں کو آزاد کیا۔
سنو جن سے محبت ہو
انہیں آزاد رکھتے ہیں
وہ جگنو ہوں پرندے ہوں

کہ انساں ہوں
انہیں پھر مٹھیوں سے قفس سے۔
اور آرزوئے طلب سے آزاد رکھتے ہیں

''میں یہ شہر زندہ وجود کے ساتھ نہیں چھوڑ رہی...... میری ماں...... مصباح اور تم ذہن میں رکھو کہ میں کبھی یہاں زندہ وجود کے ساتھ واپس نہیں آؤں گی...... میں اس وقت کو تمہارے آنگن میں چھوڑ کے جارہی ہوں جس کی بارشوں میں ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے بھیگتے تھے۔'' وہ اس کے سامنے سے ہٹی اِگلے ہی لمحے اس نے فارہ کے ہاتھ کو یوں بے رحمی سے پکڑا...... کہ وہ اگلا قدم نہیں اٹھاسکی۔

''کیا اسے محبت کہتے ہیں کہ دوسرے بندے کی سانسوں میں آگ لگا کر پانی پر پہرہ لگادیا جائے۔''

ان حاصل اور لاحاصل لمحوں میں ،بدقت مسکرایا۔

''اور میں اگر یہ چہرہ آخری بار دیکھ رہا ہوں تو کیا میں کبھی اپنی بینائی کا یقین کرپاؤں گا۔'' اس کا لہجہ توڑ پھوڑ کا شکار تھا۔

''اور اگر میں تمہیں آخری بار دیکھ رہا ہوں تو تم ایک بے رحم لڑکی ہو۔'' فارہ نے اس کی آواز آنکھوں کو بھیگتے پایا۔

''اور جو محبت میں نے تم سے کی وہ کبھی میں بھی عیاں نہیں کرسکتی طلحہ۔'' اس نے آنکھوں میں جمع شدہ پانی کو اندر ہی جذب کیا۔ جیسے طلحہ وہ چہرہ نگاہوں میں جذب کررہا تھا۔ اسے الہام ہوا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ جب اذن جدائی ہو تو پہلے امید ہجرت کرتی ہے عشق بعد میں خیمے اکھاڑتا ہے۔ جس ادا سے طلحہ نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا فارہ نے بھی اتنی ہی بے رحمی سے چھڑایا۔ وہ خیمے اکھاڑ رہی تھی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اس کی سانسیں دہک رہی تھیں۔

تم میرا پہلا عشق ہو سائیں
تم میری سانس کی ضرورت ہو
مجھ پر اب نزع کا ہی عالم ہے
تم میری آخری عبادت ہو
زندگی اختتام چاہتی ہے
تم نئی زندگی کی حسرت ہو

☆☆☆

ہر کوئی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ اس لیے حیران تھا کہ آخر لڑکی سے ایسا کیا گناہ سرزد ہو چکا تھا کہ اس قدر افراتفری کے عالم میں اسے دگنی عمر کے مرد سے بیاہنا پڑا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے اور یوں بھی تو ہوسکتا ہے۔ لوگوں کی زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔ اس محلے میں میاں منان کریم کی بیٹی بدنام ہو چکی تھی اس کی عزت کو بٹہ لگ چکا تھا۔

زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا صرف ڈیڑھ ہفتے بعد محلے داروں نے دیکھا کہ میاں صاحب کے گھر شادیانے کی ڈھولکی بج رہی تھی۔ اللہ نے انہیں جڑواں نواسوں کا نانا بنادیا تھا۔ گلی میں مٹھائیاں بٹ رہی تھیں اور اس سے اگلے پہر میاں صاحب کے گھر کے سامنے خواجہ سرا ناچ رہے تھے۔

وہ منڈیر سے جھانکتی ہے۔ طبلے ہارمونیم اور گھنگھروؤں کے تال میل پر محلے دار جھوم رہے تھے۔ وہاں نوٹ لٹائے جارہے تھے مگر آج میاں صاحب چپ تھے ان کی جھکی آنکھیں اپنے ہاتھوں پر ٹکی تھیں ورنہ محلے کے ایسے فنکشنوں میں سب سے زیادہ ان کے نوٹ اڑتے تھے۔ آخر وہ اس محلے میں سب سے دولت مند تھے دولت تو اب بھی پہلے سے بڑھ کر تھی پر کمی کس چیز میں آئی تھی۔ وہ اچانک چونکی۔

سازوں پر جھومتا ناچتا اس گھر کا داماد، جس کے اندر باہر زندگی رقصاں تھی اس سے بڑھ کر کوئی خوشی تھی کہ وہ دو بیٹوں کا باپ بن چکا تھا۔ وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی ہے جہاں پندرہ دن پہلے ایک میت کو چپکے سے جنازہ گاہ پہنچادیا گیا تھا وہاں آج زندگی جوبن پر تھی۔ وہ سب سے اوپری سیڑھی پر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کے رودی۔ اسے آج بھی آسمان سے گلہ نہیں تھا تابع چیزوں سے کیا گلہ۔ اس محلے میں آج بھی دو افراد ایسے تھے کہ جن کا وقت کٹ رہا تھا نہ درد مٹ

رہا تھا۔ وہ جہاں گرد ہو چکے تھے، وہ محبت برد ہو چکے تھے۔

☆☆☆

آج رات کے دوسرے پہر بھی درختوں پر پرندے شور مچا رہے تھے۔ وہ اپنے مالک کی طرح اب رت جگوں کا شکار تھے۔ وہ اپنے کمرے سے باہر ٹیرس پر کھڑا تھا۔ وہ اپنے گھونسلوں سے باہر شاخوں پر بیٹھے تھے۔ اس فارم ہاؤس میں آرام، چین، سکون کا نظام پچھلے دو ہفتوں سے درہم برہم تھا۔ اکیڈمی، گلی، محلہ پارک وہ ہر جگہ سے غائب تھی اور ہر جگہ سے غائب ہو کر جیسے وہ اس کے دل میں ٹھہر گئی تھی۔ یہ عجیب بات نہیں تھی عجیب یہ تھا کہ اس کی روپوشی پر دن صدیوں میں ڈھل چکے تھے۔ وہ کہیں ملتی تو۔ وہ اسے بتاتا کہ سیاہ آنکھیں اب بھی نیند کے قحط کا شکار ہیں۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا جب وقت پر لگا کے اڑتا ہے وہ موسم وصال ہوتا ہے۔ اور جب وقت مغرور ہو جاتا ہے وہ ہجر کے دن ہوتے ہیں۔ اس کے دل کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس چار حرفی دیوار کے نیچے دب چکا ہے جسے محبت کہتے ہیں۔

اس کا فون بھی مسلسل بند جا رہا تھا وہ یوں غائب تھی جیسے اب سامنا ہی نہیں ہوگا وہ اب شہر کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتا تھا پھر اپنے طور تھک ہار کے اسے رب نواز کا سہارا لینا پڑا۔ اور رب نواز کی حاصل کردہ معلومات پر اس کی حسیات جیسے سُن ہو کے رہ گئی تھیں۔ کیا ارحم کی تمام باتیں سچ تھیں کیا وہ لڑکی واقعی ایک سائیکو کیس تھی۔

☆☆☆

وہ تھیٹر میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھی تھی اور خود کو اس ڈرامے کے کسی کردار میں ڈھال چکی تھی۔ وہ ایک کلاسیکل ڈرامہ تھا۔ وہ اس بات سے غافل تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھنے والا کون تھا۔ اس وقت اسٹیج پر ایک مشہور اداکارہ بہت خوب اداکاری کر رہی تھی، کچھ دیر بعد ہنی نے مصباح کے پہلو میں بیٹھے شخص کو دیکھا۔

وہ ڈائیلاگز بھول گئی۔ تو کیا...... تو کیا...... اس کی سوچیں گڈمڈ ہوئیں،۔۔ وہ جس اعتماد کے ساتھ اس کردار کی ادائیگی کر رہی تھی وہ اعتماد لمحہ بھر کو ڈگمگایا...... اور اگلے لمحے وہ پھر سے اپنے کردار میں ڈوب چکی تھی جب اس کا سین ختم ہوا...... تو اس نے اپنے پرستاروں پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی...... وہ اگلی قطار میں دو خالی کرسیاں دیکھ کے جیسے کھل اٹھی تھی...... اسے ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"میں یقین نہیں کر سکتا کہ آپ اس طرح کے شوق رکھتی ہیں۔" وہ اپنے کان کے پاس ابھرنے والی اس آواز پر شاکڈ رہ گئی تھی۔ کیا یہ اتفاق تھا۔ اگر نہیں...... تو پھر کیا تھا۔ اس نے رخ پھیر کے اسے دیکھا جس کے آسودہ چہرے پر بے چینی اور بے یقینی تھی۔ وہ کب سے اس کے تعاقب میں تھا وہ تب سے لے کر ایک مختصر سفر طے کرنے کے بعد اب تک حیران تھی۔ وہ پارک کے اس خاموش گوشے میں۔ اس کے روبرو بھی اسے الجھی نظروں سے دیکھ رہی تھی جو تھیٹر میں ادا کیے واحد جملے کے بعد اب تک خاموش تھا۔ وہ چنچل سی بچی ابھی ان سے چائے کا پوچھنے آئی تو وہ اسے انکار نہیں کر سکی تھی۔

بند لبوں پر مٹھی جمائے اسے تمام تر توجہ کے ساتھ دیکھتا وہ شخص اس کی بکھری بکھری حالت پر پریشان ہو رہا تھا جس کی سوئی آنکھوں کے گرد پڑے حلقے تازہ تھے۔ جس کے دوپٹے کے ڈیزائن میں تمام رنگ زرد شیڈ میں تھے اور اس کے چہرے پر ویسی ہی زردیاں کھنڈی تھیں جو خشک پتوں پر نگاہ جمائے سوچ رہی تھی کہ آخر یہ میرے پیچھے کیوں ہے اور کب سے ہے کہ آج یہ تھیٹر تک پہنچ گیا۔ میں ایسی کون سی حور پری ہوں...... یا کسی بادشاہ کی بیٹی ہوں اور میرے منہ سے کون سے پھول جھڑتے ہیں وہ ان تمام خوش فہمیوں اور خوش رنگ وجوہات کو بھی ایک ایک کر کے رد کر چکی تھی۔ اچانک اس کے اندر ایک خیال نے

سر اٹھایا۔

"اف خدایا...... جگنو نے کچھ غلط سلط تو نہیں کر دیا۔ وہ ٹھیک تو ہے نا۔"

اس نے بے صبرے پن کے ساتھ پوچھا اور پھر مقابل کے چہرے پر چھائے تاثر نے اسے یکلخت مایوس کیا۔ وہ اس کے اندازوں پر گہری مسکراہٹ کے ساتھ محظوظ ہوا تو پہلو بدل کے رہ گئی۔

"تو پھر۔" اس کے دو حرفی سوال کے وہ ہزاروں جواب دے سکتا تھا۔

"کیونکہ میں وہاں آپ کی موجودگی کو اتفاق نہیں کہہ سکتی۔" وہ سر کو دائیں بائیں جھلاتی تنک کے بولی تو سالم نے اپنی مسکراہٹ سمیٹی۔

"یہ اتفاق ہو بھی نہیں سکتا۔" اس نے وہ زرد چہرہ اپنی خوش نما نظر کے حصار میں رکھ لیا تھا۔

"جو بندہ پچھلے پندرہ دنوں سے تمہیں دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہو تو تمہارا کیا خیال ہے وہ تمہیں کسی چڑیا یا جگنو کی خبر دینے کے لیے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ کیا وہ اپنی بات نہیں کر سکتا۔" اس کے دھیمے لہجے سے اس کے بوجھل انداز سے ــــ فضا میں چائے سے پھوٹتی خوشبو کی، گلاب اور ٹیولپ کی ہر چیز کی کیفیت بدل چکی تھی۔ مگر اس بدلاؤ نے اس بے زار لڑکی پر کچھ خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔

"اپنی باتیں اپنے جیسے ہی لوگوں سے کرنا چاہئیں۔" اس نے اپنے ماتھے کی گہری شکنوں کے باوجود اپنے لہجے کی درشتی کو قدرے کم ہی رکھا تھا۔ وہ اس کی بات پر مکمل وجود کے ساتھ خاموش ہوا۔

"اگر اس سے مراد میرا اسٹیٹس ہے تو وہ سب کچھ میرا نہیں۔ وہ کیفے ٹیریا وہ فارم ہاؤس سب کچھ میری سوتیلی ماں کی ملکیت ہے مجھے تو ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کے عوض ہر ماہ تنخواہ ملتی ہے اور میرے ٹھاٹ باٹ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے میرے باپ کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اس طرح میرا خرچ کم اور بچت ہی بچت ہو رہی ہے۔" وہ جس طرح مسکرایا تو مصباح نے اسے الجھ کے دیکھا۔ کیا وہ غیر سنجیدہ تھا۔

"اور اگر آپ کی مراد میرے کردار سے ہے تو یقین کیجیے چند افیئرز میں نے ضرور چلائے ہوں گے مگر کبھی کسی کی زندگی خراب کی۔ اور نہ ہی کبھی کسی کو سیدھی راہ سے بھٹکایا۔" وہ اب اپنے مخصوص مزاج کے حصار میں تھا اور اس کی ازلی لاپروائی ارد گرد اڑ رہی تھی۔

"تو پلیز پھر مجھے بھی سیدھی راہ پہ ہی رہنے دیں۔" اس نے اٹھنے کے ارادے کے ساتھ ہی ٹیبل پر پڑے بیگ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"آپ کو بھٹکانا نہیں چاہتا۔ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کے بیگ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتا ہوا کچھ یوں بولا تھا کہ ماحول، فضا، خوشبو ٹیولپ جیسمین اور اس شخص کی آنکھوں میں وہی سابقہ کیفیت طاری ہوئی۔ اور وہ خود بے حس و حرکت ہوئی۔ اس کے دوپٹے کے زرد شیڈ نے ہزاروں رنگ بدل لیے تھے۔ ان گول بالیوں کے موتی مزید مغرور ہو چکے تھے۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ یہ ممکن نہیں اور ایک گہرے توقف کے بعد اس نے بتا دیا۔

"میرا رشتہ طے ہو چکا ہے۔" وہ اپنا بیگ اٹھاتی نہایت مدھم بولی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ساکن ہوتے اس شخص کے چہرے نے اس کے دوپٹے سے تمام رنگ چرا لیے تھے۔

☆☆☆

ساون بھادوں کے رخصت ہوتے ہی حبس ختم ہو گیا تھا۔ ستمبر کے بخار زدہ سائے تپی تپی دیواروں کو جلد ہی پیچھے چھوڑ دیتے تھے اور زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے ورنہ طلحہ کا دل تو چاہتا تھا کہ باپ کی طرح کسی درگاہ پر چپ چاپ بیٹھ جائے اور وہ اکثر وہاں چلا جاتا تو اسے محسوس ہوتا وہاں ہر بشر اس کے دکھ کو محسوس کرتا ہے۔ وہ خنک دیوار سے ٹیک لگائے دعا مانگتے ہاتھوں میں...... رخساروں پر گرتے آنسوؤں

میں اور وجد زدہ جسموں میں جیسے ہی جاتا تھا۔ وہ اپنا دکھ ان ہی وجد زدہ جسموں میں چھوڑ کے واپس آ جاتا کہ ابھی زندگی کے پاس بہت کچھ تھا اور وہ ناشکروں میں سے نہیں تھا۔

ابھی آس پاس اور بھی رشتے تھے۔ رشتوں سے جڑے لالچ تھے گڑیا، ویدو، گڈو اور دوسرے بچوں کی آنکھوں میں کئی خواب تھے جو اس سے تعبیریں چاہتے تھے۔ ایسے ہی وقت کے ساتھ رینگتے دنوں میں وہ ایک مٹیالی سی صبح تھی کہ اپنے سامنے اخبار پھیلاتے ہی ایک خبر نے اسے حیرت میں مبتلا کیا۔ رواں سال کی سپر اسٹار ہنی خان نے فلموں سے کنارا کشی کا اعلان کر دیا بلکہ سائن کردہ فلموں کے ایڈوانس بھی واپس کر دیے اور اس نے ہر قسم کے میڈیا کے نمائندوں کو اپنے اس فیصلے کی وجہ بتانے سے معذوری کا اظہار کیا اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا وہ یہ خبر طلحہ سے ڈسکس نہ کرتی، جس نے جواباً صرف ایک لفظ اچھا کہنے کے بعد فون بند کر دیا تھا مگر وہ مصباح تھی جو تجسس کے مارے اکیڈمی سے قبل اس کے اپارٹمنٹ میں بیٹھی تھی جہاں ہنی اپنی ملازمہ اور گوشی کے ساتھ مل کر سامان پیک کر رہی تھی۔ جس نے مصباح کی تمام باتیں گول کر کے صرف ایک کا جواب دیا تھا کہ وہ اب ایک چھوٹے سے گھر میں اپنی ماں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ مصباح اسے مغرب کی نماز پڑھتے دیکھ کر گنگ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"سچ کہوں تو میں بھی پچھلے کئی دنوں سے میر صاحب (میر تقی میر) کی قسمت پر رشک کر رہا ہوں جو رونے دھونے کے بعد سو تو جاتا تھا۔" وہ آج پھر اچانک نمودار ہو کے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"لگتا ہے آپ کی سوتیلی ماں نے آپ کو ملازمت سے نکال دیا ہے۔" اس نے اچھا خاصا بے زار منہ بنایا اور چہرے کے آگے جھکی ٹہنی کو ہاتھ سے ہٹانا چاہا مگر وہ عجلت میں ٹہنی کو بلند کرتا اس کے سامنے ٹھہرا۔

"میرے گھر میں کئی پیڑ پودے ہیں اور ان پر بے شمار گھونسلے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کہاں کون سا پرندہ تکلیف میں ہے۔" لب بھینچ کے التجا کرتا وہ جس پرندے کی بات کر رہا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ان بوجھل آنکھوں کو گھور کے آگے بڑھ جاتی ہے جن میں نیند کا قحط تھا۔ "ان پرندوں کو اڑا دو کہ میں اب خراب حالوں سے ربط نہیں رکھتی۔" وہ کندھے جھٹک کر کہتی ہوئی جیسے اسے ان گول بالیوں کے دائروں سے آزاد کر دینا چاہتی تھی۔ وہ چوٹ کھا کے رہ گیا۔

"ایسا کیسے ممکن ہے کہ تم کسی اور کی زندگی میں شامل ہو جاؤ...... اور کیا میں ایسا ہونے دوں گا۔" وہ اس کی راہ میں حائل ہوا۔

"میں نے اس لیے آبادیوں سے منہ موڑ لیا کہ تم برباد حالوں کی خبر گیری کرتی ہو۔" وہ اس کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے لیموں کے پیڑ کے گھونسلے کا پرندہ بن گیا۔ وہ رکے تو۔ وہ دیکھے تو۔

"میں اب خراب نہیں بلکہ خراب تر حالوں سے رابطہ رکھتی ہو۔" وہ یوں ہنسی جیسے نیم پاگل ہو۔ وہ اسے یوں تکتا رہا تھا کہ نگاہ آنچ بن جاتی۔

"تمہاری روشن آنکھوں کے اس الاؤ سے یہ مصباح نامی چراغ نہیں جلنے والا۔" وہ راستہ بدل کے چل دی اور کہیں گم ہو گئی اور ارحم کا کہا سچ ثابت ہو گیا۔ وہ آسیب زدہ تھی وہ خراب حالوں کا آئینہ تھی۔

☆☆☆

اکتوبر نے ہوا سے ساز باز کر کے کچھ ہرے کچھ سوکھے پتوں کو شاخوں جھاڑ دیا، یہ موسم کا بدلاؤ تھا اور بدلاؤ کی انہی رتوں میں ایک شام ہنی نے طلحہ کو گرم کپڑوں کی خریداری کرتے دیکھا۔ وہ ایک متوسط علاقے کی مارکیٹ تھی جہاں سیل لگی ہوئی تھی۔ بے ساختہ ہی وہ کھنچی چلی آئی۔ اس کے

مخاطب کرنے پر وہ ٹھٹکا۔ چند ہی کلمات کے بعد اس نے غور کیا اس کے ہاتھوں میں موجود سامان بتا رہا تھا کہ وہ بھی وہیں سے شاپنگ کر چکی ہے......

وہ اسے بغور دیکھنے پر مجبور ہوا...... دبئی اور یو کے سے شاپنگ کرنے والی اس مہنگی ترین ہیروئن نے ایک کامیاب زندگی اور زندگی کی تمام آسائشات سے رخ موڑ لیا تھا تو کیوں؟ اسے مصباح کے ذریعے ہنی کے متعلق کوئی نہ کوئی خبر مل جاتی تھی۔

''ایک لگی بندھی رقم کے ساتھ شاپنگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا یا اسے بتا رہا تھا۔ وہ نا سمجھتے ہوئے بھی مسکرائی۔

''چیزیں ہو یا روپیہ پیسہ ان کا گنتی میں رہنا ہی انسان کو انسانیت کے دائرے میں رکھتا ہے۔ جب بات لاتعداد، بے شمار...... اور بے حساب پر آجائے تو پھر انسان خدا بن بیٹھتا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اسے مجھ سے ابھی محبت تھی کہ مجھ جیسی گنہگار کو انسانیت کے دائرے میں لے آیا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور اس پر گہری نگاہ ڈالتی الوداعی جملہ بولتی آگے بڑھ گئی وہ حجاب میں تھی نہ اسکارف میں مگر اس نے دوپٹہ سلیقے سے اوڑھا ہوا تھا۔ اس کا حلیہ کسی کو اپنی جانب متوجہ کرنے جیسا نہیں تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی تھی جسے طلحہ نے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھا اس نے دنیاداری اس حد تک ترک کی تھی جس سے آگے میانہ روی تھی، جہاں نہ انسان خود کو قیدی تصور کرتا ہے اور نہ ہی پرندہ۔

☆☆☆

خانہ بدوش ہوا سفر سے واپسی پر پہاڑوں کی ہلکی خنکی بھی ساتھ چرا لائی تھی جو نومبر کی نیم طویل راتوں میں گھل مل گئی۔ وہ اوائل سردیوں کے قدرے بونے اور سست دنوں میں اک عام سا دن تھا۔ آج بہروز علی کے گھر کی چہل پہل بتا رہی تھی کہ وہاں کسی تقریب کا اہتمام ہے۔ قریبی عزیز واقارب سے گھر بھرا پڑا تھا۔ اس شوروغل سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ چائے بنا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ تبھی اس کے سیل فون پر ٹیکسٹ ٹون بجی۔

''میں آج تم سے رابطوں کے قابل ہوں کہ میں آج خراب تر حال میں ہوں۔''

اففف، اس نے میسج پڑھ کے ایک کڑوا کسیلا سانس لیا۔ وہ یہی میسج صبح سے لے کر غروب تک بے شمار بار ریسیو کر چکی تھی۔ اب کے بار اس نے آگ بگولہ ہو کے کال ملائی۔

''میں نے رابطہ جوڑ دیا ہے اب کہو۔'' وہ جیسے گرمیوں کی دھوپ سینک کے بولی تھی کہ دوسری جانب کئی ساعتوں کے لیے خاموشی طاری ہوئی۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ منگنی کی انگوٹھی پہن لینے سے ہم جدا ہو جائیں گے۔'' شاید وہ مسکرایا تھا۔

''اگر کسی طور بھی میرا چارہ نہ چلا تو اغوا کر لوں گا تمہیں۔ مصباح کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے سنبھلا۔

''تم پر یہ باتیں سوٹ نہیں کرتیں سالم۔'' وہ دانت پیس کے بولی۔

''یہ عشق کے دعوے یہ لڑکیوں پر مرمٹنا یہ عام مردوں کے مشغلے ہیں جبکہ تم ایک بددماغ اور خود پسند شخص ہو اور تم پر یہی روپ سوٹ کرتا ہے۔ اس نے تنتنائے مگر ٹھہرے الفاظ میں بات ختم کی۔

''نہ تم پر مرمٹا ہوں۔ نہ عشق کا دعویٰ کر رہا ہوں مگر تم اس حد تک اچھی لگتی ہو کہ تمہیں عمر بھر اپنے پاس اور اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں اور یاد رکھنا میں اس کے لیے ہر حد سے گزر جاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ مصباح کے ٹھنڈے ہاتھوں سے جیسے دم نکلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''ارے ہٹو لڑکیوں مجھے بھی راستہ دو تا کہ رسم شروع کر سکوں۔'' لڑکے کی اسمارٹ سی اماں نے راستہ بناتے ہوئے اپنی طرف کی لڑکیوں کو کرسیوں

پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو مصباح کے سامنے سے ہجوم چھٹ گیا۔ اب اونچے اسٹیج پر دلہن دور تک نظر آ رہی تھی تبھی ایک شخص دلہن سے ذرا فاصلے پر آ کے ٹھہر گیا۔ وہ شخص مصباح کا جیٹھ تھا وہ اسے بغور کھڑا دیکھتا رہا حالانکہ اس کے شک کی تصدیق تو طلحہ کو دیکھ کے ہی ہو گئی تھی۔

وہ وہاں سے ہٹتا ہوا پریشانی کے عالم میں باہر نکلا، اب اس کا رخ اپنے باپ کی طرف تھا جو بہروز علی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ باپ کے پہلو میں ٹکا اور ان کے کان میں کچھ بات کی۔ جسے سن کر اس کا باپ بھی پریشان ہو چکا تھا۔ مصباح کا جیٹھ انتہائی سخت طبیعت کا ایک شکی مرد تھا وہ اپنی ٹیکسی چلاتا تھا۔ وہ آج وہاں پہلی بار آیا تھا مگر رشتہ طے ہونے کے بعد اس نے لڑکی کی تصویر ضرور دیکھی تھی چند لمحوں بعد اس کے باپ نے بہروز علی کے کان میں بس اتنا کہا۔

"آپ ذرا ڈرائنگ روم میں آئیں، ایک ضروری بات ہے۔" اور بہروز نے وہاں سے اٹھتے وقت وہاب کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ اندر ڈرائنگ روم میں کچھ دیر بعد بہروز اور وہاب ان باپ بیٹے کا چہرہ یوں تک رہے تھے جیسے بھوت دیکھ لیے ہوں۔

"ایسا کیسے ممکن ہے۔ نثار صاحب آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں۔" خاصی دیر بعد وہاب جب بولا تو اس کا لہجہ تپا ہوا تھا جس پر نثار کو بھی غصہ آ گیا۔

"پہلے آپ اس معاملے کی تحقیق تو کریں۔ اگر میں جھوٹا نکلا تو جو چور کی سزا وہ میری۔" نثار نے اس قدر وثوق کے ساتھ کہا کہ وہاب اور بہروز ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے پھر ان کے درمیان یہ طے ہوا کہ اس معاملے کا فیصلہ کل رات کو کیا جائے گا۔ پھر وہ لوگ خراب موڈ کے ساتھ ہی وہاں سے گئے تھے۔ فی الوقت وہ دونوں بھی گھر میں موجود مہمانوں کا خیال کرتے ہوئے اپنا غصہ اور اشتعال دبا کے بیٹھے تھے ورنہ وہاب کا دل مصباح کی دھنائی کرنے کو چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

مصباح کی قسمت اچھی تھی کہ وہاں قیام کرنے والے مہمان آج سہ پہر کو ہی رخصت ہوئے تھے۔ مہمانوں کے جاتے ہی اسے کمرے میں طلب کیا گیا۔ جہاں اس کی ماں اور طلحہ پہلے سے موجود تھے۔ اس نے حیرت کی شدت کو کمال ضبط سے چھپایا۔

"پہلے مجھے تو بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے۔"

عذرا نے اپنے شوہر کو پریشانی سے دیکھا۔

"معاملہ میں بتاتا ہوں بچی۔" جیسے جیسے وہاب بات کرتا جا رہا تھا زمین و آسمان کے ساتھ وہ دونوں بھی گھوم رہے تھے۔ طلحہ کی تو خبر نہیں تھی مگر ایک ٹھنڈا پسینہ مصباح کے تلووں کو بھگو چکا تھا اس کی ماں تو لفظ پھول منڈی پر ہی جان کنی کے عالم میں تھی۔

"اب ان سے کون پوچھے گا کہ یہ وہاں کیا کرنے گئے تھے۔" وہاب کا لہجہ ایک پھنکار سے مشابہ تھا۔

"اماں! وہ فارم ہاؤس ہے جہاں پھول کاشت کیے جاتے ہیں۔ وہ اس طرح کی پھول منڈی نہیں ہے۔" وہ ماں کی نیلی پڑتی رنگت سے پریشان ہو کر وضاحت پیش کرنے لگی۔

"وہاں پھول اگتے ہوں یا سانپ اگتے ہوں۔ تمہارا وہاں کیا کام تھا۔"

یہ بات اس کے باپ نے کی تھی۔ مصباح نے اسے آج سے پیشتر اس قدر پریشان نہیں دیکھا تھا۔ اسے ہلکی سی ندامت نے آ گھیرا۔

"میں وہاں اپنی ایک دوست کے کام سے گئی تھی پھر میرے ہی کہنے پر طلحہ مجھے پک کرنے آیا تھا۔" اس نے حرف حرف سچ کہا تھا۔ وہ تینوں اسے بری طرح گھور رہے تھے۔ جانتے تھے کہ اب دم آخر بھی مصباح کا بیان یہی ہوگا۔

☆☆☆

آخر اس کے سسرال والے سالم سے کیوں ملنا چاہتے تھے۔ وہ اس سے کیا پوچھیں گے۔ اور وہ جو پہلے ہی اسے دھتکار رہا تھا۔ اس کا رسپانس کیا ہوگا۔ اوپر سے طلحہ کے میسجز......

"میں کیفے ٹیریا سے قریب ہوں تم اسے تمام معاملے سے آگاہ کردو۔" وہ جب بھی اس شخص سے دوبارہ رابطہ نہ کرنے کا تہیہ کرتی تھی تو جلد ہی اس کا ارادہ چکنا چور ہوجاتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر بکھری ہوئی تھی کہ اس نے کمرے کی چیزیں سمیٹتی ملازمہ کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھگا دیا۔ پھر اس نے جھنجلا کے کال ملائی جو پہلی ہی بیل پر ریسیو کرلی گئی۔

"یعنی ہم انہیں یاد آنے ہی لگے۔ یہ اچھا سگنل ہے۔" اس کا انداز کچھ آزردہ کچھ مسکراتا ہوا سا تھا۔

"مگر جو سگنل یہاں آرہے ہیں، وہ نہایت برے ہیں۔" وہ جل بھن کے بولی دوسری جانب وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔ پھر وہ اسے ہر بات بتاتی چلی گئی۔ اب دونوں طرف خاموشی طاری تھی۔

"کوئی بھی کہانی سنا دینا مگر اصل حقیقت چھپا لینا۔" چند لمحوں بعد وہ التجائیہ سی ہوئی۔ وہ ایک احمقانہ بات تھی صورت حال جس رخ جارہی تھی وہاں حرف اس کے کردار پر آرہا تھا۔ اسے اب بھی جگنو کی فکر تھی۔ لیکن وہ سمجھ رہا تھا۔

"ہاں ضرور، میں کہہ دوں گا، تمہیں اور کوئی کام نہیں تھا۔ تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔" وہ پھر سے مسکرایا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ تلملا کے رہ گئی۔

"میرے پاس بھی کوئی تیسری کہانی نہیں۔"

اسے سچ مچ غصہ آچکا تھا اور اس نے فوری کال منقطع کی۔

"عجب پاگل ہے کوئی بھی کہانی سنا دینا۔" اس نے ایک مشکل آہ بھری، چند لمحوں بعد وہ اس سچویشن کو سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

ان سے بات چیت کرتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ سچ اور جھوٹ کی پہچان سے عاری لوگ تھے اور اگر انہیں سالم کی حیثیت کا علم نہ ہوتا تو وہ اسے پیٹ پیٹ کے سچ اگلوا چکے ہوتے۔ بول بول کے اس کا حلق خشک ہوچکا تھا مگر انہیں سچ اور جھوٹ ثبوت سمیت چاہیے تھا۔ ایک لمحے کو تو اس کا دل چاہا کہ تمام صفائیوں کو گولی مارتے ہوئے اسے کہہ دینا چاہیے کہ اسے کوئی کام نہیں تھا، وہ صرف مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اب تو وہ انہیں سخت نظروں اور سرخ چہرے کے ساتھ بس گھورے جارہا تھا۔

"آپ یہ تمام باتیں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر دہرائیں۔ ہم یقین کرلیں گے۔" اس کی سانس بند ہوئی۔ وہ کسی اتھاہ میں اترا۔

اس نے اپنے سن وجود کے ساتھ اس شخص کا چہرہ دیکھا۔ جس کو باقی نثار کے نام سے مخاطب کررہے تھے۔ وہ اس قدر بڑی بات کہہ کے اس قدر سکون سے کھڑا تھا۔ اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ اور وہ ایسا کر بھی گزرتا۔ ان لوگوں کا اشتعال بتا رہا تھا کہ اگر وہ بے گناہ ثابت نہ ہوئی۔ تو اسے زندہ درگور کردیا جائے گا۔

اس نے اپنے سامنے ٹیبل پر رکھی اس پاک کتاب کو دیکھا یہ اس کی زندگی کا شدید ترین دھچکا تھا۔ مشکل ترین فیصلہ تھا وہ لڑکی اس کی کون تھی وہ اس کے ساتھ جو بھی سلوک کرتے۔ اور اگلے لمحے اسے ادراک ہوا کہ وہ اسے کس قدر عزیز تھی۔ وہ اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا قسمت اسے ایک موقع دے رہی تھی۔ اسے مصباح کا چہرہ یاد آیا۔ جو یتیم لڑکی کی حفاظت پر اپنی عزت قربان کررہی تھی۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کرسکتا تھا۔

اسے مصباح کے کردار کی صفائی پیش کرنے کے لیے پتھروں جیسے ٹھوس الفاظ درکار تھے کہ کانچ کا ایک ذرہ بھی ان کے دونوں جہان برباد کرسکتا تھا۔ وہ سب پاکیزہ اور دین دار لوگ تھے جنہوں نے

اسے وضو کی مہلت بھی نہیں دی تھی پھر اس نے قرآن کو چوم کر اس پر ہاتھ رکھا۔

''وہ جتنی بار بھی میرے گھر آئی، اپنی ایک دوست کی وجہ سے آئی۔ اس نے کبھی میری طرف نرم نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ اس نے مجھ سے جب بھی بات کی، اپنا لہجہ سخت ہی رکھا۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اس کی انگلی تک نہیں چھوئی۔'' اس نے سب کو چھوڑ کر صرف بہروز کو دیکھا جس کے چہرے کی طمانیت لوٹ آئی تھی۔

''میں اسے جتنا جانتا ہوں، یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک شفاف اور با کردار لڑکی ہے۔'' باہر دیوار سے چپکی مصباح اپنی ہی آنکھ کا خشک آنسو بن چکی تھی۔ اس نے قرآن سے ہاتھ ہٹالیا۔

''کہو کہ تمہارے نزدیک اس کی حیثیت بہن برابر ہے۔'' اس نے تڑپ کے ہاتھ سمیٹا۔ اس نے اس شخص پر کاٹ دار نگاہ ڈالی۔

''یہاں بات ایک لڑکی کے کردار اور نیت کی ہو رہی ہے۔ برابری یا حیثیت کی نہیں۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا۔

''وہ ایک جاہلانہ خواہش تھی۔ اگر تمہارے دل میں بے ایمانی نہیں تو کہنے میں کیا حرج ہے۔'' یہ جملہ وہاب نے بولا تھا۔

''ایمان کی بات چھوڑیں کہ مرد کا ایمان پہیلی ہے۔ یہ بات یہاں آپ میں سے بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تمام عورتیں میری بہنوں کے برابر ہیں۔'' وہ مضبوط اعصاب کے ساتھ بولا کہ تمام مرد پہلو بدل کے رہ گئے۔ سالم امین اچانک کھڑا ہوا تھا۔

''یہاں تمام عورتوں کی نہیں ایک لڑکی کی بات ہو رہی ہے۔'' مصباح کا جیٹھ بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا جیسے سالم کا گلا پکڑنا چاہتا ہو۔

''دنیا کی ہر عورت میرے لیے قابل احترام ہے لیکن میں انہیں آپ کی منشا کے رشتے میں نہیں جوڑ سکتا۔ میں مصباح کے متعلق اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' اس جملے میں ایک نقطہ ہی نہیں پورا جملہ کانچ کا تھا جو سب کو بری طرح چبھا۔ ان سب نے اسے مشکوک نگاہوں سے جاتے دیکھا۔

''لو، یہ تو معاملہ الجھا کے چلا گیا۔'' نثار نے اپنے دونوں ہاتھ بے دردی سے آپس میں رگڑے۔

باہر کھڑی وہ لڑکی ذرہ ذرہ ہوئی۔ یہ کیسے کافر لوگ تھے۔

☆☆☆

منگنی کے تیسرے روز ہی جب مصباح کی جٹھانی منگنی کا سامان واپس لینے آئی تو گلی میں جمع محلے کی عورتوں سے جانے کیا کچھ کہہ گئی تھی۔

''توبہ استغفار! پہلے میاں صاحب کی بیٹی نے جانے کون سے گل کھلائے تھے کہ بے چارے ماں باپ نے کسی بھی طرح اپنی عزت بچانے کا حل نکالا۔ اور اب یہ مصباح۔''

''سارا دن چھت پر پھول منڈی کی عورتوں سے گپیں لگاتی تھی۔ توبہ توبہ۔''

''آج کل اچھے گھروں کی لڑکیاں بھی بطور فیشن پھول منڈی جانے لگی ہیں۔'' محلے کے چند آوارہ لڑکے اسی طرح کی افواہیں بہت آگے تک اڑا رہے تھے۔

''آج سے اس کا گھر سے باہر آنا جانا اور اکیڈمی وغیرہ سب بند۔'' بہروز کی کرخت آواز گھر کی دیواروں سے بلند ہو رہی تھی۔

''یہ تھی اس کی تعلیم اور یہ ہے تمہاری تربیت کہ اب جہاں تمہاری بیٹی کی بات ہوگی وہیں پھول منڈی کا ذکر ہوگا۔'' اس کی آواز دکھ سے لرز رہی تھی۔

''ہائے ہائے خدا نہ کرے۔'' اس عذرا نامی پتھر میں جیسے اچانک جان پڑی تھی۔

''یہ سو فیصد سچ ہے، وہ ایک پھولوں کی منڈی ہے وہاں پھول وغیرہ۔''

''تو اٹھو باہر نکلو اور یہ بات دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤ کہ وہ ایک دوسری پھول منڈی ہے۔ وہاں پھول اگائے اور بیچے جاتے ہیں۔'' وہ فضا میں دونوں ہاتھ

بلند کرتا شاید اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ اب اندر بیٹھی مصباح کی برداشت ختم ہو چکی تھی وہ تیر کی تیزی سے باہر آئی۔

"پھول منڈی کیا ہوتی ہے ابا۔" آج اس نے برسوں بعد لفظ ابا بولا تھا۔ وہ ماں اور اس کے بیچ آئی۔

"اور یہ کہاں نہیں ہوتی۔" اس کے سارے خوف کہیں دور بھاگ گئے تھے۔

"پھول منڈی دیوار کے پار ہی نہیں ہوتی ابا۔" بہروز کے ہاتھ اس کے پہلوؤں میں گرے۔

"پھول منڈی مرد کی نیت میں ہوتی ہے وہ اسے جب اور جہاں چاہے تعمیر کر لیتا ہے اور اگر یہ مرد کی نیت میں دم توڑ دے تو دنیا سے اس منڈی کا نام ونشان مٹ جائے۔"

بہروز کا تمتماتا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہوا۔

"میں بدکردار نہیں تھی کہ آپ اوروں کو یقین دلانے کے لیے انتہائی قدم اٹھاتے۔ ہر مرد ایک جیسا نہیں ہوتا۔ میں نے طلحہ نوید اور سالم امین میں ایسی کسی آبادی کا نام ونشان نہیں دیکھا جسے پھول منڈی کہا جاتا ہے۔"

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ بات ختم کی......

وہ اسے پتھر نظروں سے دیکھتا رہا اس نے بیٹی کو اندر جاتے دیکھا اس نے دوسری نگاہ بیوی پر ڈالی۔

"تم نے اس کی بکواس سنی......اس لڑکی کا دماغ درست رکھنے کا حل میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔ اب اسے صرف ایک ہی شخص قابو میں رکھ سکتا ہے۔"

☆☆☆

"ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بہت برا ہو رہا ہے پہلے فارہ اور اب مصباح یہ دونوں ان حالات اور اس سلوک کی مستحق نہیں تھیں افف۔"

طلحہ نے جیسے پوری چائے کا ایک گھونٹ بھرا تھا۔ فارہ کا ذکر وجود کے ہر حصے میں درد بن جاتا تھا۔ وہ ادھر ایک دوست سے ملنے آیا تو گلی میں کوشی سے مڈبھیڑ ہو گئی پھر وہ اسی کے ہمراہ ہنی کے گھر آ گیا تھا۔ اس کے چھوٹے سے گھر میں ترتیب اور سلیقہ مہک رہا تھا۔

"آپ اپنے بارے میں بھی بتائیں۔ آج کل کیا کر رہی ہیں۔" اس نے سہولت سے موضوع بدلا۔

"میں ادھر قریب ہی ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔" وہ اس وقت طلحہ کے بجائے ٹیبل کی سطح کو گھور رہی تھی۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب ہنی اسے دیکھنے کے لیے وقت بے وقت سڑک پر آتی تھی ہنی میں یہ تبدیلی کیونکر آئی اسے شدت سے یہ راز جاننے کا تجسس ہوا۔

"ایک بات پوچھوں۔" اس کا انداز نشست آرام دہ تھا جیسے وہ وہاں دیر تک بیٹھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ آج سب سے نچلی سیڑھی پر چپ چاپ اور خاموش بیٹھی تھی۔ آج سورج کی آنکھوں میں سختی تھی۔ اس نے ماں کو اپنی طرف آتے دیکھا اس کی ماں کے ہاتھ میں پھندا تھا اس کا چہرہ دھوپ سے چمک رہا تھا۔ پھر وہ بیٹی کے ساتھ جڑ کے بیٹھ گئی۔ ماں نے اس کا پسینے سے تر ہاتھ تھام لیا اور اس کی سوجی آنکھوں کو قریب سے دیکھا جو آج پہلی بار اپنے لیے روئی تھیں۔ وہ اپنے معاملے میں اناڑی تھی سو چند بے ترتیب سے آنسو بہا کے چپ ہو گئی۔

"مصباح۔" ماں نے اسے ہولے سے پکارا...... اس کی ماں کے ہاتھوں میں موجود پھندا......اس کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

"تمہارے ابا نے جو فیصلہ کیا ہے اسے چپ چاپ قبول کر لینا۔" اس نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا اس کی روتی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں نہیں جانتی اماں! کہ یہ کیسے ہوا۔ مگر یہ ہو گیا کہ برسوں مجھے اچانک سالم امین سے محبت ہو گئی۔" عذرا نے اسے دہل کے دیکھا پھر ارد گرد نگاہ ڈالی۔ کوئی سن تو نہیں رہا تھا۔

"جب وہ میرے اپنوں کو میرے کردار کا یقین

دلا رہا تھا۔ جب وہ میرے لیے جاں سے گزر رہا تھا۔ جب اس نے میرے وقار کی خاطر مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو ٹھیک اسی وقت اماں میرا دل اسے اپنانے کے لیے مچل اٹھا تھا۔"

اسی وقت ان کے گھر کا دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ عذرا کے ہاتھ سے پھندا چھوٹ کے گرا۔

اگلے لمحے اس کا تایا، تائی اور وہاب ایک ساتھ اندر آ گئے۔ تائی کے ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ ٹھیک اسی وقت بہروز علی کمرے سے باہر آیا۔

"شام تک نکاح خواں اور گواہ آجائیں گے۔"

یہ آواز اس کے تایا کی تھی۔ مصباح نے سیڑھیاں چھوڑیں اور دھیمے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

"میں یہ کڑوا گھونٹ صرف آپ کی عزت کی خاطر بھر رہا ہوں چچا!" وہ اب بھی اسی دروازے کو تک رہا تھا جہاں سے وہ گزر کے اندر گئی تھی۔

"تمہاری ملازمہ کہاں ہے۔ یہ سامان مصباح کو دے آئے۔ شام ڈھلنے میں اب زیادہ وقت نہیں۔"

اس نے عذرا کو مخاطب کیا جو مرغیوں کے ڈربے صاف کر رہی تھی۔ چند منٹوں بعد وہ ایک درمیانے سائز کا اٹیچی دھکیلتے ہوئے ان کے پاس آ کے ٹھہری۔

"ابھی رخصتی میں بہت وقت ہے جھلی نہ ہو تو۔" تائی نے اسے ہنس کر دیکھا۔

"میں جا رہی ہوں ابا۔" اس نے گردن سیدھی کر کے باپ کو دیکھا۔

"میں نے کبھی اپنے ساتھ برا نہیں کیا۔ میں نے کبھی کسی تعلیمی ادارے سے عشق محبت جیسی خرافات نہیں پالیں۔ میں نے کبھی کسی مرد سے ایک خوب صورت جملہ تک نہیں بولا۔ میں نے کسی کا بھرم نہیں توڑا۔ آپ لوگوں نے پھر بھی مجھے غیروں کے سامنے بے اعتبار کر کے بے عزت کیا تو کیا ان کو یقین آ گیا؟ اور میں اپنے بے جرم وجود کے ساتھ اس شخص سے شادی کی سزا کیوں جھیلوں۔"

"آپ اس لڑکی کی زبان کھینچ کیوں نہیں لیتے۔" وہاب لال بھبھوکا ہو کے غرایا۔

"عذرا! اس کا ہاتھ پکڑو اور اسے اندر لے جاؤ۔ یہ مردوں کے سامنے زبان چلا کر تمہاری تربیت کے جوہر دکھا رہی ہے۔" بہروز کے اس طنز میں غضب کی کاٹ تھی۔

"ماں کی تربیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتا۔ یہ مکافاتِ عمل کی ایک شکل ہوتی ہے اس جہاں میں صرف بدھی بدنام نہیں ہوتا جب یہ نوبت شرفاء پر آنے لگے تو انہیں سوچنا چاہیے کہ کسی بے بس کی سسکیاں بہت اوپر عرش تک سن لی گئی ہیں پھر ان شرفا کو توبہ کرنی چاہیے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ بہروز علی کی مٹھیوں میں آج اک ادراک کانپا۔ وہ بے بسی تھی۔ وہاب نے اسے لپک کر پکڑنا چاہا۔

"میں کسی کے ساتھ بھاگ کے نہیں جا رہی۔ میں ویمن ہاسٹل جا رہی ہوں۔ میری مٹھی میں موجود گولی اس قدر زہریلی ہے کہ میں نگل لوں تو ایک منٹ میں ختم ہو جاؤں گی۔" اس نے وہاب کا ہاتھ اٹیچی سے دور کیا۔

"اماں! مجھے معاف کر دینا، میں غلط روایتوں کی اچھی امین ثابت نہیں ہوئی۔" پھر وہ باپ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ چاہیں تو مجھے پشت پر گولی مار سکتے ہیں۔" اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔

وہ باہر گلی میں آئی۔ اس نے گلی کا موڑ مڑتی اوبر کو دیکھا۔ اس نے گلی پر ڈبڈبائی نگاہ ڈالی۔

اس کے کانوں میں ماں کے رات کہے جملوں کی بازگشت ہوئی تھی۔

"تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔ نکاح کے بعد وہاب تمہیں یہاں سے لے جائے گا اور قتل کر دے گا۔ اور یہاں واپس آ کر کہے گا کہ تم گھر سے بھاگ گئی ہو۔ میں نے رات اس کی باتیں سن لی ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ میں اسے زندہ نہیں

چھوڑ دوں گا۔"

☆☆☆

اس نے کیفے ٹیریا کے اندر قدم رکھتے ہی کاؤنٹر کے دوسری جانب موجود سالم کو دیکھا۔ آج وہ اسے اپنی نئی کیفیت کے زیر اثر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح فریش نہیں تھا۔ اس کا اٹیچی اس کے ساتھ کھنچتا چلا آرہا تھا کہ ویٹر اسے دیکھ کے چونکا۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے کاؤنٹر پر ہولے سے ہاتھ مارا۔

"ایکسکیوزمی سر، مگر ایک عجیب بات ہے کہ آج وہ لڑکی سامان سمیت آئی ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو منیر؟" اس نے مصروفیت کے عالم میں ہی پوچھا۔

"سر! وہی لڑکی جس کی آمد پر آپ کھسک جاتے تھے۔" ویٹر ہولے سے بولا کہ وہ قریب آچکی تھی۔ سالم کے دل کی دھڑکن تیز اور ہاتھوں کی حرکت سست ہوئی۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔ اک کوندا سا لپکا۔ کیا وہ خواب تھا آنکھیں بے یقین ہوئیں۔ وہ پاس آکے ٹھہر گئی دونوں کی نگاہ ملی۔ سالم نے نظر ترچھی کر کے اس کے سامان کو دیکھا۔ اگلے لمحے اس نے نگاہ جھکائی جو پیروں پر ٹکی اس نے چونک کے حیرت چھپائی۔ وہ اس کا چہرہ سرسری سا دیکھتا دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوا۔

وہ پریشان ہوئی وہ اس کی اس حرکت پر گنگ کھڑی تھی۔

"اسے کیا ہوا ہے۔" سالم کے چہرے پر تھکاوٹ سے زیادہ بے گانگی تھی شاید ویٹر کی وجہ سے اس کا حلیہ اور سامان خاصا آکورڈ لگ رہا تھا۔ اس نے جھٹ سے خود کو تسلی دی وہ چند لمحے اس کے کچھ بولنے کی منتظر رہی پھر اسے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

"یہ کام بعد میں کرتے رہنا پہلے مجھے ویمن ہاسٹل چھوڑ آؤ۔"

سالم امین کے قریب ایک چھوٹا سا بم پھٹا۔ اس نے ہاتھ کی سست ہوتی حرکت کو غور سے دیکھا مگر دل کی درہم برہم دھڑکنوں پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ اس نے مصباح کو دوبارہ دیکھا جو بے حد سوگوار تھی پھر اس نے ویٹر کو آواز دی جو بھاگا آیا۔

"ڈرائیور سے کہو یہ بی بی جہاں جانا چاہتی ہیں انہیں بحفاظت چھوڑ آئے۔" مصباح نے اسے دیکھا کیا وہ غلط جگہ پر آچکی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کے اردگرد دیکھا یہ وہی کیفے ٹیریا تھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"میرے پاس جتنے پیسے تھے، وہ میں اوپر والے کو دے چکی ہوں" کہ یہ بات بتانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ سالم نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ ویران اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، اس کا دل تکلیف میں مبتلا ہوا۔

"آپ بے فکر ہو کے جائیں، میرا ڈرائیور آپ سے کرایہ وصول نہیں کرے گا۔" وہ اجنبی لہجے میں مخاطب ہوا۔

وہ اندر تک چونکی۔ یہ ماحول اور جگہ کا گریز نہیں تھا، یہ کچھ اور تھا، نہ محبت، نہ شناخت۔ اس شخص کے انداز میں بس معمولی سی شناسائی تھی، جس کو اس کے اپنوں نے بے وقعت کر دیا تھا۔ وہ اسے کیوں اہمیت دیتا۔ ان سیاہ آنکھوں میں کچھ پگھلا، وہ کہیں بیٹھ کے رونا چاہتی تھی۔

"اپنا یہ احسان بھی اپنے پاس رکھیں۔" وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ اس نے کمپیوٹر آف کیا اور ہلکی سی تکلیف کے ساتھ مسکرایا۔ اس کی نگاہ مصباح کے قدموں سے الجھ کے رہ گئی۔

☆☆☆

باہر سڑک پر دنیا رواں دواں تھی۔ زندگی صرف اس کے وجود میں سمٹ گئی تھی۔ اس نے وہاب کو جی بھر کے بددعائیں دیں، اگر وہ درمیان میں نہ آتا تو اس کی زندگی وہیں سے شروع ہو چکی ہوتی۔ اس کا دل بھیگا۔

"لڑکیاں کیا سمجھتی ہیں کہ گھر چھوڑ دینے سے

سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ "لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ صعوبتوں کی ٹرین جہاں ٹھہرے گی، آگے اک سرسبز باغ ہو گا۔" آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔

اس نے ہاسٹل میں بات کی ہوئی تھی مگر وہ خالی ہاتھ وہاں کیسے شفٹ ہو سکتی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے ایک سنگی بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بیگ سے فون نکالا۔ اب طلحہ کو پریشان کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس مدھم تھیں۔ وہ ایک چھوٹے پارک کا گوشہ تھا، نہ کوئی آہٹ، نہ کھٹکا۔ کسی نے عقب سے آ کر فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اگلے لمحے وہ اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اکیلی ہو۔ اس نے مصباح کی اور پہلو بدلا۔ وہ ذرا سا پرے سرکی، اس نے آج پہلی بار ان سیاہ آنکھوں کو قریب سے دیکھا۔ غصہ جس کی پلکوں پر لٹکا رہتا تھا، اس کے دوپٹوں کے تانوں بانوں میں جیسے پتھر کا بنا جاتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ اس لڑکی نے ایک انگوٹھی کے لیے اپنا اور ساتھ میرا بھی تماشا لگایا۔" سالم نے ایک گہرا سانس لے کے کہیں دور تک دیکھا۔ وہ ساکت ہوئی۔ مگر اسے جواب دینا تھا۔

"ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ اس حد تک ......" وہ جملہ مکمل کیے بنا خاموش ہوئی تھی۔

"وہ انگوٹھی اسی وقت ان کے منہ پر مارنا چاہیے تھی، تاکہ تیسرے دن وہ تمہاری انگلی سے اتار کے لے جاتے۔" اس کا لہجہ ٹھہرا ہوا مگر بے سکون تھا۔

"میں نے انگلی میں نہیں پہن رکھی تھی۔" وہ بھی تڑخ کے گویا ہوئی۔ وہ اسے گھور کے رہ گیا۔

"وہ عمل میرے لیے تکلیف دہ تھا، میں اس قدر منتشر ہوا ہوں کہ ابھی تک میرے اندر غصہ ہے۔"

"آپ باقی کا غصہ بھی اتار لیجیے، میں اس کے بعد ہی یہاں سے جاؤں گی۔"

"میں اپنا غصہ اتار چکا ہوں۔" وہ بھی سپاٹ آواز میں بولا۔

"تو پھر آپ جا سکتے ہیں۔" وہ ہنوز نگاہ چرا کے بیٹھی تھی۔

"یہ عشق کے دعوے پر لڑکیوں پر مرمٹنا، یہ عام مردوں کے مشغلے ہیں اور بقول تمہارے میں بہت خاص ہوں۔" وہ لہجے کی شرارت دبانے کے بعد ذرا سنجیدہ ہوا۔

"میں نے خاص کب کہا تھا۔" اسے پھر غصہ آیا۔

"جب بد دماغ اور خود پسند ہو جاتا ہوں، تمہیں تب بھی افسوس ہوتا ہے پھر تم کسی بھی گوشے میں بیٹھ کے آنسو بہاتی ہو۔"

"میں یہ آنسو اپنے لیے بہا رہی تھی۔" وہ اس کی مسکراہٹ سے چڑ کے بولی۔ سالم نے ایک طمانیت سے بھرپور سانس لیا۔

"چلو تم نے اپنی زندگی شروع تو کی۔ اب آگے کیا ارادہ ہے کہ شام کی کہانی طلحہ مجھے سنا چکا ہے۔"

"اس سے آگے کی کہانی میں کیفے ٹیریا میں پڑھ آئی ہوں۔" مصباح نے اس کے رویے پر چوٹ کی اور اس کے ہاتھ سے فون لینا چاہا۔

"نہیں ...... اس سے آگے بھی ایک کہانی ہے جو میں سنانا چاہتا ہوں۔" وہ فون اپنے دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے مسکرایا "کہ ذرا میرے ساتھ تو چل کے دیکھو، اس کا لہجہ سبز باغ دکھانے جیسا تھا۔ مصباح نے جھینپ کے نگاہ چرائی۔ وہ سبز باغ دیکھنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ اپنا بیگ اٹھانے کو جھکی تو نگاہ اپنے جوتوں پر پڑی۔

"اف ......" وہ ہراس اور افراتفری میں سلیپر پہنے ہی نکل آئی تھی۔ سالم نے اس کی کھسیاہٹ پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"چلو اٹھو، پہلے جوتا خرید تے ہیں۔" اس نے

مصباح کا سامان پکڑا۔ اسے بے بسوں کا سود و زیاں تڑپاتا تھا۔

وہ بہت رو چکی تھی۔ آج وہ باپ کے سامنے بد اور بدنام کا جو سوال رکھ آئی تھی، جانتی تھی کہ اس کے باپ نے وہ حل کرلیا ہوگا۔ چلو آج دل کسی پرانے ملال سے تو خالی ہوا۔ اس نے ساتھ چلتے شخص کو چپکے سے دیکھا جو اسے بہت کم جانتا تھا۔ اس نے پھر بھی اسے شفاف اور باکردار ثابت کیا تھا، اب وہ اس کے لیے بہت سارا مسکرانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اس کی ماں ہنی کے چھوٹے سے گھر میں آ کر بددل ہو رہی تھی۔

"ہم نے یہاں نہیں رہنا بلکہ اس نے ہمارے گھر رہنا ہے۔ یہ پریشانی اسے ہونی چاہیے کہ ہمارا گھر بھی بڑا نہیں ہے اماں۔" اس نے ٹیبل پر پڑے چھوٹے سے باکس کو دیکھا، جس میں انگوٹھی تھی۔

"مگر تسلی رکھیں۔"

"وہ کنگال نہیں ہے جو دولت اس کے پاس ہے۔ وہ ہر نعمت میں اضافے کا باعث ہے۔" اس بات پر وہ ماں کو خوش ہوتا دیکھ کے ہلکا سا اداس ہوا۔

"اگر کبھی مجھ پر برا وقت آیا تو وہ خوب صورت الفاظ میں مجھے یقین دلائے گی کہ اچھا وقت بھی ضرور آئے گا۔

یہ بات وہ سوچ سکتا تھا، کہہ نہیں سکتا تھا۔" پھر وہ قدموں کی ملی جلی آہٹوں پر خاموش ہوا۔

کچھ دیر بعد ہنی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ طلحہ نے اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈالی' اس نے ہنی کا خوب صورت چہرہ لحظہ بھر کو دیکھا تھا۔ وہ جب پہلی بار اس گھر میں آیا تو اس نے ہنی سے اس تبدیلی کا راز پوچھا تھا اور اس نے جو جواب دیا تھا، وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

"مجھے یاد نہیں کہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اللہ سے کبھی کچھ مانگا ہو، کوئی خواہش کی ہو۔ میں نے بس ایک بار اوپر نگاہ اٹھا کر ایک دعا شدت سے مانگی تھی، بھلے مصباح بہروز کے قدموں میں ایک زمانہ بیٹھ جائے تو بیٹھ جائے سوائے طلحہ نوید کے۔

میں نے پہلی بار کچھ مانگا اور میری دعا قبول کرلی گئی یعنی کہ میں ابھی بھی اس کی نظر میں اچھی تھی۔ میں تمام خامیوں کے باوجود اللہ کو پسند تھی، وہ مجھے جانتا تھا میں اس بات پر جتنا بھی شکر کرتی کم تھا۔ پھر میں اس کا شکر کرتے کرتے شکر گزاروں میں شامل ہوگئی۔"

"یہ قریبی مارکیٹ میں سیل لگی ہے۔ ذرا چکر لگا کے دیکھیں۔" یہ مشورہ ہنی کی ساس کا تھا۔ اب وہ دونوں اکیلے بیٹھے تھے۔

"ایک بات بتاؤں ہنی؟" اجازت لینے کے ساتھ ہی بات شروع کرچکی تھی۔

"اس دن میں نے اپنے طلحہ کو نہیں مانگا تھا۔"

وہ لحہ بھر کو چپ ہوئی۔ وہ حیران ہوا۔

"بلکہ اس دن میں نے مصباح کے لیے سالم امین کو مانگا تھا۔" وہ پہلے سے زیادہ حیران ہوا وہ مسکرائی۔

"تم میری شکر گزاری کا نتیجہ ہو۔"

☆☆☆

"لڑکیوں پر مرمٹنا ایک عام بات ہے نا۔ عشق کے دعوے کرنا آسان ہے۔ اس سب کے لیے ٹائم نکالنا پڑتا ہے۔ جس سے کاروبار کا ہرج ہوتا ہے پھر آمدنی گڑ بڑ ہوجاتی ہے۔ پھر مما کو حساب دیتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اوپر سے ہاسٹل کا خرچا، لانڈری کے بل، اکیڈمی کی فیس، اوبر کا کرایہ، فون کا بیلنس۔" اس نے حساب کی پرچی مٹھی میں دبائی۔

"یار! میں تنخواہ دار بندہ ہوں، یہ سب اگلے ماہ افورڈ نہیں کرسکوں گا۔ اس لیے میں نے اس مسئلہ کا حل سوچ لیا ہے۔" وہ پاؤں جھلاتے ہوئے مسکرایا۔

وہ کیفے ٹیریا میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"میں نے تو تم سے کہا تھا کہ لنچ، ڈنر چائے اور شاپنگ وغیرہ نکال کے باقی سب ادھار کے

کھاتے میں ڈال دو اور تم نے ہی جواب دیا تھا کہ ادھار محبت کی قینچی ہوتی ہے۔" وہ بے نیازی سے کندھے جھٹک کے بولی۔

ان گول بالیوں کے موتیوں نے آنکھیں کو خیرہ کیا، وہ اس کم بخت نگاہ کا کیا کرتا جو اسے دیکھتی رہ جاتی تھی۔

"اس لیے تو کہہ رہا ہوں جو حل میں نے سوچا ہے، اس سے ہاسٹل کے خرچے ختم ہو سکتے ہیں۔" وہ دلکشی سے مسکرایا۔

"وارڈن سے شادی کرو گے؟" اس نے شرارت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"نہیں، وارڈن کی اس مہمان سے۔" وہ اس پر نظر جما کے بولا۔ وہاں اک عجب سی خاموشی طاری ہوئی۔

"کچھ دنوں بعد مما اور بابا آرہے ہیں۔" ماحول اس کی نگاہوں کی طرح فسوں خیز ہوا۔

"دل چاہتا ہے لمبی فرصت ہو اور میں ان بالیوں کے موتی گنتا رہوں۔" وہ الجھی اور اس نے واحد موتی کو چھوا۔

"محبت سراسر اندھی ہوتی ہے۔" وہ سر جھٹک کے مسکرائی۔

"اماں ایک دو ماہ تک ابا کو راضی کر لیں گی۔" وہ ادھر اُدھر دیکھ کے بولی۔

"اوہ نو...... یعنی کہ اگلے ماہ میرے ہاتھ میں ایک ایسی ہی لسٹ دوبارہ ہو گی۔" وہ اپنی جگہ سے جیسے اچھلا۔

"میں آج سے ادھار کا کھاتا کھول رہا ہوں۔" پھر وہ اچانک سنجیدہ ہوا۔

"کیوں نہیں ضرور۔" اس کی آنکھیں مسکرائیں۔ اس نے آرام دہ حالت میں ٹیک لگائی۔

"ایک دو ماہ بعد میری شادی ہو جائے گی تو میرا شوہر آپ کی پائی پائی لوٹا دے گا۔" سالم نے پہلے آنکھیں سکیڑیں پھر پوری آنکھیں پھیلا کے اسے دیکھا پھر اس کا بے ساختہ قہقہہ اس قدر خوب صورت رنگ لیے تھا کہ مصباح کے لیے اس کے چہرے سے نظر ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند سالوں میں طلحہ کی زندگی میں بہت تیزی سے تبدیلیاں آئیں، اس نے سالم امین کے ساتھ مل کر ایک کیفے ٹیریا کھول لیا تھا۔ ان کے پاس اچھی گاڑی تھی۔ انہوں نے گھر بھی بدل لیا تھا، وہ اپنے باپ کو بھی گھر لے آیا تھا۔ اس کے پاس اولاد بھی تھی، اس کی زندگی میں ہر کمی پوری ہو چکی تھی۔ اس میں پہلے سے زیادہ اعتماد آچکا تھا۔ اس کے خوبرو چہرے پر آسودگی برستی تھی۔

وہ ایک باوقار شخص تھا مگر اس میں ایک عادت بچوں جیسی تھی۔ وہ کسی جہاز کو یا پرندے کو اڑتے دیکھتا تو دیکھتا ہی رہتا تھا کہ نظر کا ارتکاز اس کی آنکھوں میں پانی بھر دیتا۔ وہ پانی اکثر آنکھ سے چھلک بھی جاتا۔ کبھی رخساروں پر بھی بہنے لگتا، کبھی گریباں تک بھیگ جاتا۔ کتنے ہی سالوں بعد ہی نے جان لیا تھا کہ یہ آنکھیں جس کی ملکیت تھیں وہ پرندہ وہاں سے ہجرت کر چکا تھا۔ ☆

صائمہ اکرم چوہدری

شہرزاد

شہرزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنادیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کررہے تھے' ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو ماردیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہوگئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام درشہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہوسکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے ۔ ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔



ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور درشہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیورو کریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور درشہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

درشہوار اور ــــ طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ مناہل، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہرزاد کے پاس سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بات پہ ہادی اور شہرزاد بہت چراغ پا



ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات، واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ، درشہوار اور مناہل کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔

صندل کے گھر والے، شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

مسز قریشی کے ڈنر میں برہان اور درشہوار کو دیکھ کر ہادی کو دھچکا لگتا ہے۔ وہ مناہل کو اشاروں میں برہان سے دور رہنے کا کہتا ہے مگر وہ اس کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ طوبیٰ اور نمیرہ کی باتوں سے برہان کو درشہوار اور ہادی کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ اپنی ماں کو بتاتے ہیں اور درشہوار کی شادی ارسل سے کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اس رشتے پر داجی کو بھی اعتراض نہیں۔

ہم زاد، شہزاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیصہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونی ورسٹی میں برہان اور انابیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔

برہان کی شادی کا مناہل کو سخت برا لگتا ہے۔ وہ دبئی جانے لگتی ہے مگر ہادی کے سمجھانے پر اپنا ارادہ بدل لیتی ہے۔

برہان اور تاج دار بیگم کی خواہش پر درشہوار کا رشتہ ارسل سے اور شاہ میر کا رشتہ نمیرہ سے طے کر دیا جاتا ہے۔ داجی کا یہ فیصلہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہے۔

مونیکا امتحان دے کر ذوالکفل کے ساتھ عمرے پر چلی جاتی ہے اور گھر والوں کو شادی اور اسلام قبول کرنے کا بتا دیتی ہے۔

صارم کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ہم زاد شہزاد کی سیکیورٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ رومیصہ کو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے یہ خبر رومیصہ اور ارسل کے لیے پریشانی لاتی ہے۔

ارسل رومیصہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے تو وہاں پتا چلتا ہے کہ رومیصہ ماں بننے والی ہے۔ ارسل بہت خوش ہوتا ہے، رومیصہ خوف زدہ ہو جاتی ہے آگے کا سوچ کر وہ بچہ ختم کرانے کا کہتی ہے۔ ارسل غصے میں رومیصہ کو تھپڑ مار دیتا ہے۔

میر ہاؤس میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں، درشہوار سب سے بدتمیزی کرتی ہے۔

برہان، مناہل کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان ہیں۔ وہ سعد سے ملتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ اسے ان کی شادی کے بارے میں پتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ بات تو ہادی اور مناہل کو بھی پتا ہے۔

سعد کو اچانک مناہل میں دلچسپی ہو جاتی ہے۔

شیری رضا سے میجر توصیف کے بارے میں پوچھتی ہے وہ دراصل ہم زاد کا راز جاننا چاہتی ہے۔ ہم زاد شیری کی

غیر موجودگی میں اس کے گھر کی سیکیورٹی کی جانچ کے لیے آتا ہے اور شیری کے پسندیدہ پرفیوم کی بوتل لے جاتا ہے۔

درشہوار، ارسل کے کمرے میں جاکر بدتمیزی کرتی ہے اور اس کے کمرے کا سامان توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ برہان اور تاجدار بیگم معاملہ سنبھالتے ہیں۔ درشہوار ہادی کو فون کر کے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

شیری، ارتضیٰ کے ساتھ، صارم کے والد سے بات چیت کرنے جاتی ہے۔ راستے میں ہم زاد کی کال آتی ہے کہ ان کی گاڑی کا تعاقب کیا جارہا ہے اور ارتضیٰ ان کا نشانہ ہے۔ ہم زاد، شیری کو گاڑی سے اترنے کا کہتا ہے کہ......

ہم زاد شہریار کو فون کرتا ہے کہ ارتضیٰ کی گاڑی سے اتر کر وہ ان کی گاڑی میں آجائے۔ اسی دوران ان کے پیچھے پڑے لوگ فائر کھول دیتے ہیں اور ارتضیٰ زخمی ہوجاتا ہے شہرزاد کے پاؤں پر بھی چوٹ لگتی ہے۔

شہرزاد ہادی کے گھر آتی ہے۔ اور اوپر کے پورشن سے آنے والی نسوانی چیخ سن کر گھبرا جاتی ہے۔ ہادی بہانے سے اسے مسز قریشی کے کمرے میں بھیج دیتا ہے۔ اوپر آتا ہے تو خون دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ درشہوار اپنے آپ کو زخمی کرلیا تھا۔ وہ حمزہ کے ہمراہ اسے اسپتال لے جاتا ہے۔

شہرزاد مسز قریشی کے گھر سے واپس آکر بھی الجھن میں رہتی ہے۔ حمزہ سے بات کرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے ناراض ناراض ہے۔ وہ اسے کہتا ہے کہ وہ اگلے دن اس کے آفس آکر بات کرے گا۔

نور محل میں مایوسی چھائی ہے۔ جہاں وہاج کے کارنامے کو ڈسکس کیا جاتا ہے۔ وہاج کی ماں بار بار اپنے بیٹے کی طرف داری کرتی ہیں۔ فارحہ کہتی ہے کہ وہ میڈیکل رپورٹ اگر درست ہے تو زیادتی کرنے والا بندہ وہاج نہیں کوئی اور ہے۔

ذوالکفل اپنی بیوی کے ساتھ اپنے آبائی گھر آتا ہے لیکن وہاں انہیں قبول نہیں کیا جاتا — بلکہ اس کے بابا مونیکا کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔ جس سے وہ طیش میں آکر گھر سے نکل جاتا ہے۔

میر وہاج' اسد کے پاس موجود ہے اور اسد ہی وہ شخص ہے جو میر وہاج کے ساتھ شامل ہے۔ رومیصہ اور ارسل کو برہان ایک ریسٹورنٹ میں دیکھتا ہے اور ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ صندل کیس کی پہلی پیشی مسز قریشی پر بھاری پڑتی ہے۔ گھر آکر وہ درشہوار سے مدد مانگتی ہیں۔ شہرزاد اور حمزہ کا جھگڑا ہوتا ہے۔

لودھراں میں ایک شام وہاج اسد کے فلیٹ سے نکل جاتا ہے ایک سنسان سڑک پر کوئی اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتا ہے۔ اس کا وجود مردہ ہوجاتا ہے۔

اکیسویں قسط

"ک ک...... کیا ہوا، کس کی کال تھی؟" رومیصہ بامشکل بولی۔

شہرزاد کا اجلا چہرہ جیسے خون کی حدت سے دہک اٹھا، اس کی فراخ پیشانی پر ناگواری اور غصے کے اتنے بل تھے کہ رومیصہ نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔ جب کہ شہرزاد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سامنے کھڑی رومیصہ کے منہ پر تھپڑ مار دے۔

"ک ک...... کیا ہوا ہے شیری؟" رومی نے خشک لبوں کو خشک زبان سے تر کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"تم۔۔۔" شہرزاد کے منہ سے چند لمحوں کے ناقابل برداشت ضبط کے بعد فقط یہی نکل سکا۔ غصے نے اس کے دماغ کا ہر سوئچ آف کردیا، وہ آگے بڑھی اور اپنے سامنے کسی بت کی مانند ایستادہ رومیصہ کے منہ پر گھما کے تھپڑ دے مارا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

پورے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

رومیصہ نے شاکڈ نگاہوں سے اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھا، اس کے دل و دماغ کی دنیا میں ایک حشر برپا ہو چکا تھا۔ وہ مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ شیری اس پر ہاتھ اٹھا سکتی ہے، لیکن اس ایک تھپڑ نے اسے یہ باور کروا دیا کہ یقیناً شہزاد وہ سب کچھ جان چکی ہے جسے اس نے چھپا کر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

''مام بالکل ٹھیک کہتی تھیں، تم نے اس گھر کا اور ہمارا سکون برباد کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' وہ سلگ کر گویا ہوئی۔

رومیصہ سر جھکائے اپنے آنسوؤں کو پینے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

''تم وہ عذاب ہو جو مجھ پر اور مام پر کسی ناکردہ گناہ کی وجہ سے مسلط کر دیا گیا ہے۔'' اس کے ایک ایک لفظ میں شدید غصہ تھا۔

اسی وقت سیل فون پر ایک بار پھر ارسل کا نمبر بلنک کرنے لگا۔ شہزاد نے پہلے سیل فون کی طرف اور پھر سامنے کھڑی رومیصہ کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور جتاتے ہوئے بولی۔

''بتا دو اسے تم گائنا کولوجسٹ کے پاس گئی تھیں یا نہیں؟'' اس کے زہر آلود لہجے نے رومیصہ کو بُری طرح سے زمین پر لا پٹخا۔

''آئی ہیٹ یو رومی۔'' وہ ذہنی خلجان کے ساتھ کمرے سے نکلی اور گاڑی کی چابی اٹھا کر پورچ کی طرف نکل آئی۔

ارسل کے کہے ہوئے جملے شہزاد کے اندر ایک طوفان برپا کر چکے تھے، سو فیصد یقین تھا کہ جب ٹینا بیگم کو اس تلخ حقیقت کا ادراک ہو گا تو اس گھر میں کتنی بڑی قیامت آئے گی۔ وہ بہت مشکل سے چیزوں کو اپنے ٹھکانے پر رکھنے کی کوشش کرتی لیکن رومیصہ کی بے وقوفیاں اسے ایک بار پھر مسائل کے انبار میں دھکیل دیتیں۔

شہزاد کو حیرانی تو اپنی ماں ٹینا بیگم پر تھی، جو ایک زمانہ شناس خاتون تھیں اور ابھی تک اپنی بیٹی کی طبیعت کی خرابی کی اصل وجہ نہیں جان پائی تھیں اور وہ ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے اپنی ماں اور بہن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بڑے مزے سے رہ رہی تھی۔

شہزاد کے اندر ایک آتش فشاں ابلنے کو تیار تھا، وہ اسلام آباد کی سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑا رہی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہ کوئی مسز قریشی کے چیمبر کا کیس نہیں تھا جس کو سنتے ہی وہ منٹوں میں کوئی نہ کوئی پوائنٹ نکال کر سامنے لے آتی۔

رومیصہ نے ایک بار پھر اسے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جس کے آگے صرف ایک بند گلی تھی، اسے اس بند گلی کے اندر سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنا تھا لیکن ابھی تو اس کے دل و دماغ ہی اس تلخ حقیقت کو قبول کرنے سے انکاری تھے۔

''اس نے چھپ کر شادی کی ہے یا یہ کسی گناہ کا نتیجہ ہے۔''

شہزاد کا دماغ اس سے آگے سوچنے سے انکاری تھا، اندر کا ابال ریش ڈرائیونگ کے ذریعے باہر نکلا، وہ اسلام آباد کا پتا نہیں کون سا سیکٹر تھا، جس کے سروس روڈ کی طرف مڑتے ہوئے اس کی ایک سو چالیس کی اسپیڈ پر چلنے والی گاڑی سامنے سے آتی ہوئی ایک وین کو بچانے کی کوشش میں بے قابو ہوئی۔ شہزاد نے گھبرا کر بریک لگانے کے بجائے ایکسیلیٹر پر مزید دباؤ ڈال دیا۔

سامنے سے دو گاڑیاں مزید آ رہی تھیں، شہزاد نے ان کو بچانے کے لیے بہت تیزی سے کٹ مارا اور اس کی گاڑی روڈ کے دوسری طرف موجود الیکٹرک پول سے بُری طرح ٹکرا کر رک گئی۔ فضا میں ٹائروں کے

چرچرانے اور شیشہ ٹوٹنے کی آوازیں پھیل گئیں۔
اس کی گاڑی کا اگلا شیشہ، بونٹ اور انجن تباہ ہو چکا تھا اس نے خود کو ہاتھ لگا کر ٹٹولا تو پتا چلا اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا، کیونکہ گاڑی ایک دم رکنے سے اس کا سر اسٹیئرنگ سے بُری طرح سے ٹکرایا تھا، اور ڈیش بورڈ کے شیشے کے کئی ٹکڑے اسے آن لگے۔ اس کے ایک بازو پر بھی اچھی خاصی خراش آ چکی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کا جسم کانپنے لگا۔
''میم! آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' پٹرولنگ پولیس کی گاڑی سے ایک نوجوان نکل کر تیزی سے اس کی طرف آیا۔
''یس۔'' تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔
پولیس وین سے دو تین نوجوان مزید نکل کر اس کی گاڑی کی طرف آئے اور گاڑی کے بُری طرح سے پچکے ہوئے دروازے سے اسے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اللہ کا شکر تھا کہ وہ اپنے مکمل ہوش و حواس میں تھی اور اس کی جان بچ گئی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر خون روکنے کی کوشش کی۔
''آپ اپنے فیملی ممبرز میں سے کسی کا نمبر دیں پلیز۔'' پولیس آفیسر اس کے پاس آ کر نرمی سے بولا۔
شہر زاد کو تب احساس ہوا کہ وہ اپنا سیل فون گھر پہ ہی بھول آئی تھی اور اس وقت سوائے ہم زاد کے ایک نمبر کے اسے کسی کا نمبر یاد نہیں تھا۔ وہ روانی میں اسی کا نمبر بول گئی، اس سے پہلے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا، وہ پولیس آفیسر اپنے سیل فون سے میجر حمزہ کا نمبر ڈائل کر چکا تھا اور کال اٹینڈ کی جا چکی تھی۔
☆☆☆
میر وہاج کی تدفین کے بعد بڑی حویلی پر ایک مہیب قسم کا سکوت طاری تھا۔
ایسا لگتا تھا جیسے گھر بھر کی زبانیں بھی ان ہی کے ساتھ قبر میں دفن کر دی گئی ہوں۔ دُور دراز سے آنے والے مہمان تو تھک ہار کر سو چکے تھے لیکن ان سب کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔
وہاج کی موت کے بعد درشہوار کی پراسرار انداز میں واپسی کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھی لیکن درشہوار کی خوش قسمتی تھی کہ یہ ایک ایسا موقع تھا جب اس کے گھر والے کوئی نیا تماشا افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ ہادی کا اسے بھجوانے کا فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔
تاج دار بیگم اسے دیکھ کر جو بلک بلک کر روئیں اور انہوں نے اسے جتنے جذباتی انداز میں اپنے سینے کے ساتھ لگایا اس کے ساتھ ہی گھر کے مردوں کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ وہاج کی موت کا صدمہ اپنی جگہ لیکن اکلوتی بیٹی کی شکل دیکھتے ہی تاج دار بیگم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
''بھابھی تو یوں اس کی واپسی پر رو رہی ہیں جیسے یہ حج کر کے آئی ہو۔'' ندرت بیگم کی بڑبڑاہٹ پر نمیرہ نے کہنی مار کے انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
''تمہیں اندازہ ہے تمہاری وجہ سے ہم کتنی مصیبتوں سے گزرے ہیں۔'' شارقہ بیگم نے دبے انداز میں اسے جھاڑا۔ اس وقت ساری خلقت تاجدار بیگم کے کمرے میں موجود تھی۔ شاہ میر کسی کام سے اندر آیا اور سامنے بیٹھی درشہوار کو دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہوا۔
''اسے کہیں، اپنی منحوس شکل لے کر میرے سامنے مت آیا کرے۔'' وہ ان ہی قدموں کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔
''سب لوگ میری بیٹی کے ہی پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' تاج دار بیگم کے لہجے سے برہمی چھلکی تو وہاں موجود سب

مکین چند منٹوں کے لیے خاموش ہو گئے۔
"تمہیں داجی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" وہ تاجدار بیگم کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی جب ارسل میر حاکم کا بلاوا لے کر اس کے پاس آیا اس کے لہجے کی سنجیدگی پر در شہوار نے خوف زدہ انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ارسل سمجھ گیا وہ ماں کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔
"انہوں نے ممانی جان کو نہیں صرف تمہیں بلایا ہے۔"
"لیکن میں امی کے بغیر نہیں جاؤں گی۔" در شہوار کی پیشانی عرق آلود ہوئی۔
"گھر چھوڑتے وقت بھی امی جان کو ساتھ لے جانا تھا۔" برہان کمرے کے کسی کونے سے نکل کر اچانک سامنے آئے۔
در شہوار پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس وقت چاروں طرف سے اس پر بمباری ہو رہی تھی، اور یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ وہ پلٹ کر جواب دیتی، ورنہ عام حالات میں تو وہ کسی کا ادھار رکھنے کی قائل ہی نہیں تھی اور کسی کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی کہ اس گھر بھر کی لاڈلی کو کچھ کہہ سکے۔
"ایک منٹ کے اندر وہاں آؤ، ورنہ داجی یہاں آجائیں گے۔" برہان ارسل کا بازو پکڑ کر کمرے سے نکل گئے۔
"تم جاؤ، میں آتی ہوں تمہارے پیچھے۔" تاج دار بیگم نے اسے جذباتی سہارا دیا۔
وہ جس وقت کمرے میں داخل ہوئی، میر محتشم، میر خاقان، ارسل، اور شاہ میر کے ساتھ ساتھ حاکم صاحب نے بھی اسے ناراض نظروں سے دیکھا۔ میر برہان اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔
"السلام علیکم!"
سب کے ہونٹوں پر جیسے تالے پڑ گئے۔ کسی نے بھی اس کے سلام کا جواب دینا گوارہ نہیں کیا، وہ خاموشی سے ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔
"پوچھو اس بے حیا سے، کہاں سے منہ کالا کر کے آئی ہے؟ اور کون تھا وہ جو اسے بیچ راستے میں چھوڑ کر بھاگ گیا؟" ان حالات میں ایسا تلخ اور دل دکھاتا جملہ داجی ہی کہہ سکتے تھے اور یہ ان ہی کی طرف سے آیا تھا۔
"میں نے کچھ غلط نہیں کیا داجی۔" وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے بمشکل بولی۔
"عین اپنی شادی والے دن پورے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھر سے بھاگنا غلط نہیں تھا کیا؟" وہ بگڑے۔
"میں نے سب سے بارہا کہا تھا، مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔
"دیکھو محتشم! اپنی اولاد کی خود سری، اگر ان کی تربیت نہیں کر سکتے تھے تو پیدا ہی کیوں کیا تھا۔" حاکم صاحب آپے سے باہر ہوئے۔
در شہوار نے کن اکھیوں سے سامنے بیٹھے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ محتشم صاحب کے چہرے پر اس قدر، دکھ، غم اور صدمے کی کیفیت تھی کہ در شہوار کی ندامت میں مزید اضافہ ہوا۔
وہ جانتی تھی اس وقت وہ کس قیامت سے گزر رہے ہوں گے، لیکن وقت کی ڈور در شہوار کے ہاتھوں سے پھسل چکی تھی، وہ چاہ کر بھی گزرا ہوا وقت واپس نہیں لا سکتی تھی، اسے اپنے جذباتی پن کا کفارہ اب ادا کرنا ہی تھا۔
کمرے کا بھاری بھر کم اخروٹی لکڑی کا بنا ہوا دروازہ کھلا اور برہان اندر داخل ہوئے، سب لوگوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ وہ شاید کوئی کال کر کے آئے تھے۔

''میں نے کنفرم کروالیا ہے داجی! یہ مناہل کے گھر میں ہی تھی۔'' برہان نے نظریں چُرا کر آہستہ سے اطلاع دی اور باپ کے برابر میں بیٹھ گئے۔

''دل تو چاہتا ہے، گولی مار کر اسے بھی وہاج کی برابر والی قبر میں دفن کردوں۔'' وہ غصے سے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے بولے۔

ان کا یہ زہر آلود جملہ کمرے میں داخل ہوتی تاج دار بیگم نے سنا اور وہ جو اپنے بیٹے کے صدمے سے بے حال تھیں، اپنے رہے سہے حواس بھی کھو بیٹھیں اور تن کر میدان میں اتر آئیں۔

''کیوں میری اولاد فالتو ہے، جس کا جب دل چاہے اسے گولیوں سے اڑا دے۔'' بہت عرصے کے بعد حویلی نے ان کے لہجے کی گرج چمک کو سنا، جو کبھی ان کے مزاج کا حصہ ہوا کرتی تھی۔

''اس خاندان میں سب سے زیادہ گند بھی تمہاری ہی اولاد نے گھولے ہیں۔'' ان کے سسر نے انہیں آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

''بس ابا جی، بہت ہوگئی، اب مزید کچھ نہیں کہیں گے آپ۔''

تاج دار بیگم کے جارحانہ انداز پر کمرے میں موجود سب مکینوں کو دھچکا لگا، ایک لمحے کو تو حاکم صاحب بھی بوکھلا گئے، انہیں یقین نہیں آیا کہ ایسی کوئی بات ان کی سب سے چہیتی بہو بھی کہہ سکتی ہے۔

سب نے چونک کر سامنے کھڑی تاجدار بیگم کی طرف دیکھا، سوجی ہوئی سرخ آنکھیں، بکھرے بال اور ملگجے سوٹ میں وہ غم کی جیتی جاگتی تصویر ضرور لگ رہی تھیں لیکن ان کے لہجے میں موجود تلخی کا ذائقہ پہلی بار اس گھر کے مردوں نے چکھا تھا۔

''تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو تاج دار؟''

''ہوش میں تو اب آئی ہوں ابا جی۔ اب اس گھر میں میری اولاد کے نام پر مزید کوئی تماشا نہیں ہوگا۔'' وہ غضب ناک انداز میں چیخیں، ان کے تینوں بچوں نے سخت پریشانی سے ان کی طرف دیکھا۔ جو بول نہیں رہی تھیں کسی زخمی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھیں۔

''بھابھی! کیا ہوگیا ہے؟ جا کر ریسٹ کریں آپ۔'' خاقان صاحب گھبرا کر کھڑے ہوئے۔

''کیا ریسٹ کروں، میری ساری اولاد اس بددعا کی لپیٹ میں ہے، جو آج سے پچیس سال پہلے اس گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر خدیجہ نے دی تھی، یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔'' ان کے انداز میں بلا کی ناراضی تھی، درشہوار نے اپنی ماں کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا، جبکہ سب کے لیے حیران کن اس موقعے پر محتشم صاحب کی معنی خیز خاموشی تھی، ان کے چہرے پر بھی عجیب سا ملال تھا۔

''تاج دار! زبان سنبھال کر بات کرو تم۔'' حاکم صاحب کا دماغ کھول اٹھا۔

''اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف سے بتائیں، آپ کو نہیں لگتا، ہمارا خاندان اس ایک بددعا کی لپیٹ میں ہے۔ آپ نے تو اس کا ایک گھر جلایا تھا یہاں تو ہماری ایک پوری نسل برباد ہو رہی ہے۔ یاد رکھیے اس کا انجام آپ کو بھگتنا پڑے گا، خدیجہ کے خاندان کی فائل کسی نہ کسی دن ضرور کھلے گی۔''

''بکواس بند کرو تم اپنی۔'' ان کی کرخت آواز پورے کمرے میں گونجی۔

''نہیں ابا جی! اب مجھے کوئی چپ نہیں کروا سکتا اور اللہ کی قسم اپنی اولاد کی زندگیوں سے اب کسی کو کھیلنے نہیں دوں گی۔'' وہ تن کر میدان میں اتریں۔

''کون سا غلط فیصلہ کیا ہے میں نے؟'' حاکم صاحب کی آنکھوں میں خون اترا۔

''آخر کون سا فیصلہ آپ کا ٹھیک ہے؟ پسند کی شادی اگر اتنا ہی بڑا جرم ہے تو اپنے اس بیٹے کے گریبان کو کبھی کیوں نہیں پکڑا آپ نے۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر غصّے سے خاقان کی طرف اشارہ کیا، وہ تلملا کر رہ گئے۔

''جگہ جگہ ان کی اولادیں رُلتی پھرتی ہیں۔ دوسروں کی کی ہوئی غلطیوں کا کفارہ میرے ہی بچے کیوں ادا کریں، پہلے آپ نے وہاج کی زبردستی شادی کی اور پھر برہان کا نکاح کروایا اور اس کے بعد درشہوار کو ارسل کے کھونٹے سے باندھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بھی آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ نے کون سا غلط فیصلہ کیا۔'' تاج دار بیگم آج حقیقتاً اپنے حواسوں میں نہیں تھیں یا پھر پہلی بار ہی ہوش میں آئی تھیں۔

''لگتا ہے بیٹے کی موت کے صدمے نے اس کا دماغ الٹ دیا ہے، تم اسے چپ کیوں نہیں کروا رہے ہو۔'' حاکم صاحب نے بالکل خاموش بیٹھے محتشم صاحب کو چیخ کر کہا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں وہ اباجی، اس خاندان پر واقعی کسی کی بددعا کا سایہ ہے۔'' اپنی بات کہہ کر محتشم اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔

صدمے کی کیفیت میں حاکم صاحب کا منہ جو کھلا تو بند ہونا ہی بھول گیا، وہاج کی موت سے زیادہ تکلیف تو ان کو اس آئینہ دکھانے پر ہوئی تھی۔ ان کے چہرے کے زاویے بُری طرح بگڑے۔

''آپ چلیں میرے ساتھ، اس موضوع پر پھر کبھی بات ہوگی۔'' شاہ میر نے زبردستی ماں کا بازو پکڑا۔ انہوں نے متنفر نگاہوں سے میر حاکم کی طرف دیکھا اور جاتے ہوئے دروازے پر اتنی زور سے ٹھڈا مارا کہ میر حاکم کو لگا جیسے وہ ان کے منہ پر ٹھوکر مار کر گئی ہوں۔

☆☆☆

حمزہ پر تو لگتا تھا کوئی آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

اسے جیسے ہی شہزاد کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملی، وہ گاڑی اڑاتا ہوا جائے وقوعہ پر پہنچا، اور وہاں اس کی گاڑی کی حالت دیکھ کر اس کی روح فنا ہوگئی۔ وہ دس منٹ کا فاصلہ پانچ منٹ میں طے کرکے کلثوم انٹرنیشنل ہاسپٹل پہنچا، جس کے بارے میں اسے وہاں موجود کانسٹیبل نے بتایا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں کرتا ہوا جب ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا تو وہ سامنے بیٹھی ہوئی بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی بینڈیج کروا رہی تھی۔ حمزہ کی سانسیں بحال ہوئیں۔ اس کے ماتھے اور بازو پر ہلکی ہلکی سی خراشیں تھیں۔

''تم ٹھیک ہو ناں؟ کوئی بڑی چوٹ تو نہیں لگی۔'' وہ جذباتی ہوا، لیکن شہزاد نے محض ایک شکایتی نگاہ اس پر ڈالی اور چپ رہی۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں شہزاد۔'' وہ جھنجھلایا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی تب ہی اس نے ڈاکٹر سے تفصیل سے اس کے زخموں کے بارے میں پوچھا اور جب آدھے گھنٹے کے بعد وہ دونوں ایمرجنسی سے نکلے تو حمزہ اپنی ساری ناراضی بھلا چکا تھا لیکن تفکرات ہنوز اس کے چہرے سے ہویدا تھے۔

''ایک دفعہ ہی کیوں نہیں مار دیتی ہو تم مجھے؟''

ہاسپٹل کی ایمرجنسی سے نکلتے ہوئے حمزہ خالد نے اس سے گلہ کیا۔ شہزاد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے بے اختیاری میں پولیس آفیسر کو اس کا نمبر دے دیا اور وہ

حسب توقع اڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔
''تمہیں قطرہ قطرہ زہر پلانے میں آخر کیا لطف آتا ہے؟'' وہ اس کے ماتھے پر کی ہوئی بینڈیج دیکھ کر افسردگی سے گویا ہوا۔
''آپ نہ آتے۔'' وہ درشت انداز میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔
''کیسے نہ آتا؟ تمہیں اندازہ ہے، میرے اوپر کیا گزری تھی جب پولیس آفیسر نے مجھے تمہارے ایکسیڈنٹ کا بتایا تھا۔'' وہ جذباتی ہوا۔
شہرزاد چلتے چلتے رکی اور اس نے الجھن بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جیسے ان جملوں کا جواز ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہو۔
''مجھے لگا جیسے کسی نے میرا دل کاٹ کے جلتی ہوئی بھٹی میں پھینک دیا ہو۔ تم نے شاید اپنی گاڑی کی کنڈیشن نہیں دیکھی ہے، میں تو حیران ہوں کہ تم اس حادثے کے بعد اپنے پیروں پر چل کیسے رہی ہو۔''
وہ پریشانی سے اس کے مزید قریب آیا، اس کے لباس سے اٹھنے والی دلفریب مہک شہرزاد کے گرد گھیرا ڈالنے لگی، تب ہی تو وہ گھبرا کر ایک دفعہ پھر چل پڑی۔
''بے فکر رہیں بہت ڈھیٹ ہوں میں۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے سراسر حمزہ کو چڑایا۔
''تم ڈھیٹ ہو سکتی ہو اور تمہیں میرا دل جلانے کی عادت بھی ہو چکی ہے، مجھے اذیت دے کر تمہیں پتا نہیں کون سا روحانی سکون ملتا ہے۔'' وہ خفا ہوا۔
''اور خود کیا کرتے ہیں آپ؟ کبھی خود اپنی حرکتوں پر غور کیا ہے آپ نے؟'' شہرزاد نے بھی دوبدو جواب دیا۔
''میں جو کرتا ہوں، وہ تمہاری کسی نہ کسی بات کا ردعمل ہوتا ہے، جب تم مجھے چھوڑ کر ساری دنیا کو اہمیت دو گی، اس بات کا بھی احساس نہیں کرو گی کہ میں کتنے سال تمہارے پیچھے بھاگا ہوں، تمہیں کبھی میری تھکن کا احساس نہیں ہوا؟'' وہ اب اس سے شکوہ کر رہا تھا۔
''جو محبت تھکا دے، اسے چھوڑ دینا چاہیے۔'' وہ کوریڈور میں بڑے آرام سے چلتے ہوئے اسے مشورہ دیتی ہوئی سخت زہر لگی۔
''محبت نہیں تھکاتی، جس کو چاہا جاتا ہے اس کی بے رخی اور بے حسی تھکاتی ہے۔'' حمزہ نے فوراً تصحیح کی۔
''بس اتنا سا حوصلہ تھا۔'' وہ اب اس کے سامنے کھڑی باقاعدہ اسے چڑا رہی تھی۔
''کسی مرد کے حوصلے کو کبھی چیلنج مت کرنا شہرزاد، وہ ٹوٹ جائے گا، بکھر جائے گا لیکن تمہارے سامنے آکر کبھی اس چیز کا گلہ تک نہیں کرے گا اور اس کی خاموشی کسی بھی عورت کو توڑ سکتی ہے۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔
''میری زندگی میں جو واحد مرد ہے میں نے اسے کبھی عام مردوں کی کیٹگری میں نہیں رکھا اور مجھے یقین ہے وہ بھی مجھے کبھی عام مردوں کی طرح ٹریٹ نہیں کرے گا، اور اگر کبھی ایسا کرے گا تو وہ اس محبت کی توہین ہوگی جو اس نے مجھ سے کی تھی۔'' شہرزاد نے اسے لاجواب کیا۔
''کیا چیز ہو تم؟ کبھی آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیتی ہو اور کبھی زمین سے اٹھا کر پلکوں پر بیٹھا دیتی ہو۔'' وہ حیران ہوا۔
''میرے خیال میں آپ نے بھی کسی عام لڑکی کو نہیں چاہا تھا تو پھر اس سے عام چیزوں کی توقع کیوں کرتے ہیں۔؟'' اب بولنے کی باری شہرزاد کی تھی اور حمزہ کو خاموشی سے اسے سننا تھا۔

''آپ کیوں یہ چاہتے ہیں میں آپ کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ آپ کی بے رخی اور آپ کے لہجے میں موجود اجنبیت مجھے کس جہنم میں دھکیلتی ہے، آپ کیوں یہ چاہتے ہیں کہ میں آپکو بتاؤں کہ مجھے کتنا بُرا لگا تھا جب آپ نے میرے سیکورٹی گارڈ کو واپس بلوایا تھا۔'' وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

''میری عادتیں آپ نے خراب کی تھیں، میرے نخرے آپ نے اٹھائے تھے۔ آپ نے میری کیئر کر کر کے مجھے آسمان پر بیٹھایا تھا۔'' وہ جذباتی ہوئی۔

''ہاں ہاں بولو، چپ کیوں کر گئیں؟''

''اور مسٹر حمزہ خالد! ہمارے درمیان کبھی ایسا ایگری منٹ نہیں ہوا تھا کہ اگر آپ مجھے چاہیں گے تو جواب میں مجھے بھی اس چاہت کو سود سمیت لوٹانا ہوگا۔'' شہزاد آج شام سے سخت قسم کے جذباتی دھچکوں کا شکار تھی، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں بھر آئیں اور ان آنسوؤں کو نگلنے کے لیے اسے چپ ہونا پڑا جبکہ ان باتوں نے حمزہ کی ساری ناراضگی فضاؤں میں تحلیل کر دی۔ وہ اس کے سامنے رو کر کمزور بننا نہیں چاہتی تھی۔

''مجھے منانے کے لیے گاڑی کھمبے پر مارنی ضروری تھی کیا؟'' حمزہ نے شرارتی انداز میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''میں مر سکتی ہوں لیکن ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتی۔'' وہ جل کر بولی۔

''بائی داوے، رات کے اس پہر اس ایکسیڈنٹ کا کوئی جواز نہیں بنتا۔'' وہ ہنوز اسے چھیڑ رہا تھا۔

''میں اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔'' وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''تم اپنے حواسوں میں نہیں تھیں تب ہی تو پولیس آفیسر سے مجھے کال کروائی، ورنہ میرے نصیب کی بارشیں اس بار بھی ارتضیٰ حیدر کی چھت پر ہی برسنی تھیں۔''

اس کے شرارتی انداز پر وہ ہلکا سا چڑی۔

''یہ ارتضیٰ تو لگتا ہے آپ کے بھی حواسوں پر اچھا خاصا سوار ہو گیا ہے، کم از کم رقیب تو اپنے لیول کا ڈھونڈا ہوتا۔''

''تم میرے مقابلے میں اگر کسی دیوار یا کھمبے کو بھی اہمیت دو گی تو میں اس سے بھی ایسے ہی جیلس ہوں گا۔''

''پھر تو بہت ہی چھوٹا ظرف ہے آپ کا۔'' شہزاد نے طنز کیا۔

''تمہارے معاملے میں میرا ظرف اتنا ہی چھوٹا ہے، اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔'' حمزہ بہت دنوں بعد پرسکون ہوا تھا اس لیے کھل کر مسکرا رہا تھا۔

شہزاد کو اس پر رشک آیا جبکہ وہ تو ابھی بھی رومیصہ کے دیے ہوئے شاک سے سنبھل نہیں پائی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے دھیان کی کھڑکیاں بار بار اپنے گھر کی جانب کھل رہی تھیں۔ وہ جسمانی طور پر اس کے ساتھ ضرور تھی لیکن ذہن میں ابھی بھی وہی سب کچھ چل رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کے سر میں ٹیس سی اٹھی اور اس نے رک کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''شہزاد! کیا ہوا ہے؟'' وہ فکر مند ہوا۔

''کچھ نہیں۔'' اس کی آواز پست تھی اور حمزہ کو وہ پہلی بار الجھی سی محسوس ہوئی۔

''کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو تم؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' اس کے دل پر اتری ہوئی پریشانی حمزہ تک نہ پہنچتی یہ کیسے ممکن تھا۔

''اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے تھوڑا ڈسٹرب ہوں۔'' اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔'' اس نے فوراً اس کی بات کو رد کیا تو شہزاد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس سے بڑے اور خوفناک حادثوں پر تم کبھی خوف زدہ نہیں ہوئیں تو میں یہ کیسے مان لوں۔ یہ ایکسیڈنٹ تمہیں پریشان کر رہا ہے۔'' تشویش حمزہ کی آنکھوں اور لہجے میں در آئی۔

شہزاد نے ایک لمبا سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے کی دانستہ کوشش کی۔ ماتھے اور بازو پر لگی ہوئی چوٹ سے زیادہ تکلیف اسے وہ حقیقت جان کر ہوئی تھی جو رومیصہ ان سب سے چھپائے ہوئے تھی۔

''میں تھک گئی ہوں حمزہ!'' اس کے لہجے میں موجود تھکن نے اسے تعجب میں مبتلا کیا۔

''مجھے وہ بات بتاؤ جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔'' وہ اب براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہے ایسا۔'' شہزاد نے نظریں چرائیں۔

''تم اگر کچھ شیئر نہیں کرنا چاہتیں تو الگ بات ہے لیکن پلیز میرے ساتھ جھوٹ مت بولو۔ میں بچہ نہیں ہوں۔'' وہ خفا ہوا۔

''پہلے آپ میرے گھر کا پی ٹی سی ایل نمبر ملائیں، میں مام کو بتا دوں کہ آپ کے ساتھ ہوں۔ وہ اپ سیٹ ہو رہی ہوں گی۔'' اسے اچانک خیال آیا کہ اسے گھر سے نکلے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

''زیادہ دیر باہر رہنے سے کوئی پرابلم تو نہیں ہوگا؟'' وہ فکرمند ہوا۔

''میری کال سے پہلے تو شاید مام کو پتا بھی نہ ہوگا کہ میں گھر سے باہر ہوں، یہی تو ہماری کلاس کا سب سے بڑا المیہ ہے۔'' وہ استہزائیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

حمزہ نے اس کے گھر کا پی ٹی سی ایل نمبر ملا کر اس کی طرف بڑھایا تو کال رشیدہ مائی نے اٹینڈ کی، جس سے اسے پتا چلا کہ ثمینہ بیگم خود ابھی تک گھر واپس نہیں آئی تھیں اور رومیصہ اپنے کمرے میں شاید سو چکی تھی۔ اس نے مختصراً اسے بتا کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رومیصہ کی کیفیت اس مجرم کی سی تھی جسے صبح ہوتے پھانسی لگنے والی ہو۔

شہزاد کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے فوراً ارسل کا نمبر ملایا اور اس کے بعد وہاں سے ملنے والی تفصیل سنتے ہی اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ ارسل کی کہی ہوئی باتوں کے بعد تو اب کسی شک وشبے کی گنجائش بچتی ہی نہیں تھی۔

شہزاد کے سامنے ان دونوں کا راز جتنے بھونڈے طریقے سے کھلا تھا اس کے بعد رومیصہ کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ وہ اب اس کا ساتھ بھی نہیں دے گی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی بغیر سوچے سمجھے بولنے کی۔'' رومیصہ کا سارا غصہ ارسل پر اترا۔

''یار مجھے کوئی الہام تھوڑی ہوا تھا کہ دوسری طرف تمہاری بہن ہوگی اور ویسے بھی انسان کو اتنے ایٹی کیٹس اور مینرز تو ہونے چاہئیں کہ وہ کسی کا فون بغیر اجازت نہ اٹھائے اور اگر اٹھا ہی لیا تھا تو کم از کم بتا تو دے۔'' ارسل کی جھنجھلاہٹ بھی جائز تھی۔

''میری وجہ سے وہ جتنے مسائل کا شکار ہو چکی ہے اس کے بعد اس کا اتنا چیک اینڈ بیلنس تو بنتا ہے۔'' وہ بے زار کن انداز میں گویا ہوئی۔

''تمہاری بہن کے چیک اینڈ بیلنس نے ہماری زندگی کو ڈس بیلنس کر دیا ہے۔ پہلے ہی زندگی میں مسائل کم تھے جو بیٹھے بٹھائے ایک نئی مصیبت آ گئی ہے۔'' ارسل کا لہجہ اکتاہٹ سے لبریز تھا۔

وہاج کی گمشدگی اور پھر اس کی ناگہانی موت اور اس کے بعد درشہوار کی اچانک واپسی نے ارسل کے پورے خاندان کو اچھی خاصی ذہنی اذیت سے دوچار کر رکھا تھا۔ وہ لوگ پچھلی کئی راتوں سے سکون سے سو نہیں پائے۔ اب رہی سہی کسر رومیصہ کی اس کال نے پوری کر دی تھی۔ جسے سنتے ہی ارسل کا اپنا دل بے شمار خدشات سے بھر گیا۔

''مجھے تو اس بات کی سخت ٹینشن ہے جب شیری، مام کو بتائے گی تو ان کا ری ایکشن کیا ہوگا۔''

''بے فکر رہو، کچھ نہیں کہتیں وہ۔'' ارسل نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

''تم جانتے نہیں ہو میری مام کو، وہ تو میرا گلا گھونٹ دیں گی۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''کوئی بھی ماں اپنی حقیقی اولاد کا گلا اتنی آسانی سے نہیں گھونٹتی، اور ویسے بھی ہمارا نکاح ہوا ہے، اس لیے تمہیں ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' ارسل نے اسے نرمی سے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ویسے بھی اتنی دور بیٹھ کر وہ یہ ہی کر سکتا تھا۔

''یہ کیسا نکاح ہے جسے صرف چند لوگ ہی جانتے ہیں اور تم تو خود ملتان جا کر بیٹھ گئے ہو اور اوپر سے تمہارا تعلق بھی اس خاندان سے ہے، جس سے میری ماں اور بہن کو سخت نفرت ہے۔'' رومیصہ پھٹ پڑی۔ شہزاد والی بات کا سارا غصہ وہ اس پر نکال رہی تھی۔

''میرے خاندان نے تمہاری والدہ اور بہن کا کیا بگاڑا ہے، جو وہ ان سے اتنی نفرت کرتی ہیں۔'' وہ بھی بھڑک اٹھا۔

''یہ تم جا کر اپنے اس کزن وہاج سے پوچھو، جس نے ریپ کیا تھا اس بے چاری لڑکی صندل کا۔'' رومیصہ بھی میڈیا کے ذریعے ساری حقیقت جان چکی تھی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ ریپ اسی نے کیا تھا۔'' ارسل کو غصہ آیا۔

''صندل ہماری ملازمہ رشیدہ کی بیٹی ہے اور اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط اور ساری میڈیکل رپورٹس شیری کے پاس ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا ارسل اور اس وقت تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ یہ وہاج تمہارے کسی فرینڈ کا کزن ہے۔'' رومیصہ کو عین وقت پر پرانی بات یاد آئی۔

''تمہیں شاید تمہاری بہن نے یہ نہیں بتایا کہ اس کیس کی لاسٹ ہیرنگ میں صاف صاف بتایا گیا تھا کہ میر وہاج میڈیکل کی رو سے باپ نہیں بن سکتا، اگر ایسا ہوتا تو میری فارحہ بھابھی ابھی تک بے اولاد نہ ہوتیں۔'' ارسل کی اس بات پر وہ ہکا بکا ہوئی۔

''اب جا کر تم اپنی ملازمہ رشیدہ بیگم سے پوچھو اس کی بیٹی نے کس کے ساتھ مزید منہ کالا کیا تھا۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخا تو رومیصہ کو چپ لگ گئی۔

''تمہاری بہن نے تو شاید قسم کھا رکھی ہے میرے خاندان کو برباد کرنے کی اور انہیں ہر وقت ٹینشن دینے کی، ان کو بٹھا کر پوچھو کہ آخر انہیں ہم سب سے پرابلم کیا ہے؟ ایسا کیا بگاڑ دیا ہے ہم نے ان کا؟ ہم لوگ تو خود پہلے سے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزائیں بھگت رہے ہیں۔'' وہ مزید تلخ ہوا۔

''شیری کے کیے کی سزا تم مجھے کیوں دے رہے ہو۔'' رومیصہ کی آواز بھر آئی۔

''اس لیے کہ تم ہمیشہ دوسروں کا غصہ مجھ پر اتارنے کی کوشش کرتی ہو، تم نے کبھی میری پوزیشن کو نہیں

سمجھا، اس بات کا مجھے ہمیشہ دکھ رہے گا۔" ارسل کا لہجہ اس بار تھوڑا نرم تھا شاید اسے اس کی کنڈیشن کا احساس ہو گیا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" رومیصہ بھی اس کی پوزیشن سمجھ گئی تھی۔

"میری جان، میں جلد آ جاؤں گا، پلیز تم ٹینشن مت لو، یہ تمہارے اور ہمارے بچے کے لیے ٹھیک نہیں۔" اس کے لہجے میں ابھی بھی تفکر تھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں شیری کو کیسے ہینڈل کروں؟" رومیصہ کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"مل کر، کرلیں گے یار، جب بات اپنے خونی رشتوں کی آتی ہے تو اچھے خاصے لوگ بھی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ویسے بھی اتنا بُرا نہیں ہوں میں کہ تمہاری فیملی مجھے قبول ہی نہ کرے۔" اس کے لہجے کی شگفتگی نے رومیصہ کو رنجیدہ کیا۔

"بات اچھا یا بُرا ہونے کی نہیں ہے ارسل، اینی ہاؤ میں شیری کو ہینڈل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ تم ٹینشن مت لو۔"

"اپنا خیال رکھنا، میں دو تین دن میں واپس آ جاؤں گا اور اس کے بعد مل کر سوچتے ہیں کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔" ارسل کی بات پر وہ پھیکے انداز میں مسکرا دی، اگلے پانچ منٹ بعد جب اس نے فون بند کیا تو اس کی پریشانی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں ہاسپٹل کے کیفے ٹیریا میں موجود تھے۔

حمزہ نے کافی کا مگ اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنساتے ہوئے بہت اپنائیت بھری فکر مندی سے اس کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے درمیان تعلقات اب بالکل نارمل ہو چکے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے درمیان میں کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہی نہ ہو۔

شہرزاد کا چہرہ ستا ہوا اور بال بُری طرح سے الجھ چکے تھے لیکن وہ اپنے حلیے سے بے نیاز اب کچھ مطمئن انداز میں اس کے سامنے بیٹھی تھی اسے یقین تھا وہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لے گا۔ وہ اسے مکمل تفصیل کے ساتھ پورا واقعہ بتا چکی تھی۔

"بہت اوور ری ایکٹ کیا ہے تم نے، کم از کم میں تم سے اس چیز کی توقع نہیں کرتا۔" حمزہ کی بات پر وہ شرمندہ ہوئی۔

"میں جانتی ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ مجھے رومیصہ کو تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا۔" اس نے بھی فوراً اپنی غلطی قبول کی۔

"یہ تھپڑ بہت سال پہلے تمہاری مام نے اسے مارا ہوتا تو وہ کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچتی۔" حمزہ کی بات پر وہ بے دلی سے مسکرائی، اس بات کا تو اسے بھی گلہ تھا کہ مام نے رومیصہ کو وہ توجہ نہیں دی، جس کی وہ حق دار تھی اور اس کا خمیازہ اب دونوں کو ہی بھگتنا پڑ رہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، اس نے کوئی غلط قدم اٹھایا ہے۔" حمزہ نے محتاط انداز میں اس سے پوچھا۔

"وہ میری بہن ہے حمزہ! اس میں لاکھ برائیاں اور عیب سہی لیکن وہ کچھ ایسا غلط نہیں کر سکتی اور جس اسٹائل میں وہ لڑکا اس کے لیے فکر مند تھا تو اس سے تو مجھے یہی لگا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی مضبوط تعلق بن چکا ہے۔" شہرزاد کی بات پر وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"تو پھر ٹینشن کس بات کی ہے یار؟ تم کیوں اپ سیٹ ہو رہی ہو؟"

"مجھے ٹینشن اس لڑکے اِرسل کی ہے؟ آخر کون ہے وہ؟ کس فیملی سے تعلق ہے اس کا؟ رومی کو کہاں ملا؟ اور دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے اور رومی ابھی تک مام اور مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتا رہی؟" شہزاد نے کھل کر بتایا۔

"یہ ساری باتیں تو تم رومی سے بھی پوچھ سکتی ہو اور مجھے یقین ہے اس بار وہ جھوٹ نہیں بولے گی۔" وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"پتا نہیں کیوں جب بھی میری فیملی کا ایسا کوئی ایشو سامنے آتا ہے تو میرا دماغ کام کرنا کیوں چھوڑ دیتا ہے۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"اٹس نیچرل، کوئی تجربے کار سرجن بھی جب اپنے کسی بہت قریبی یا خونی رشتے کا آپریشن کرنے والا ہو تو وہ بھی ایسے موقعوں پر نروس ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ خونی رشتے انسان کو کمزور کر دیتے ہیں۔" حمزہ نے اسے شرمندگی سے نکالنے کے لیے مثال دی۔

"سچ بتاؤں تو مجھے زیادہ ٹینشن مام کی ہے۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

"وہ کیوں۔ تم کھل کر کیوں نہیں بات کرتی ہو مجھ سے؟"

"ایکچوئلی حمزہ! میری مام بہت زیادہ اسٹیٹس کانشس ہیں اور وہ ساری چیزیں جنہیں ہم دونوں بہنیں قطعاً اہمیت نہیں دیتیں، مام کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن جاتی ہیں اور مجھے ڈر ہے اگر اس لڑکے کا تعلق کسی ایسی ویسی فیملی سے ہوا تو مام مر کر بھی نہیں مانیں گی۔" وہ آہستہ اور رسانیت سے بولی۔

"یہ بتاؤ، میرے لیے مان جائیں گی؟" اس نے اتنے برجستہ انداز میں سوال کیا کہ شہزاد ٹپٹا گئی۔

"آپ خود کو کہاں سے لے آتے ہیں درمیان میں؟" وہ سرخ ہو گئی۔

"تم مجھے درمیان سے نکالتی ہی کیوں ہو؟" اس کی گہری نظروں کا ارتکاز اب شہزاد کو مشکل میں ڈال رہا تھا۔

"کم آن حمزہ، میں بہت اپ سیٹ ہوں، پلیز کم ٹو دا پوائنٹ۔" وہ جھنجلائی۔

"بہت ظالم ہو تم اور تمہارا بس ہمیشہ مجھ پر ہی چلتا ہے۔ لیکن خیر جہاں تک رومیصہ کے معاملے کا تعلق ہے، اب بات تمہاری مام کے ماننے یا نہ ماننے کے دائرے سے نکل چکی ہے۔ اب ہر حال میں اور ہر سچویشن میں تم لوگوں کو صرف اور صرف کمپرومائز کرنا ہوگا۔ یہ بتاؤ، جسٹس محمود کے کیس کا کیا بنا؟ کوئی نئی اپ ڈیٹ نہیں دی تم نے۔" حمزہ کو اچانک یاد آیا، وہ معاملہ خاصا ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔

"وہ کیس تقریباً اینڈ پر ہے، جسٹس محمود اپنے بھتیجے کو بچانے کے لیے ہر قسم کی مصالحت کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔ اس ویک اینڈ پر وہ کیس پراپر طریقے سے وائنڈ اپ کروا دیں گے۔"

"دیٹس گریٹ۔ اینی ہاؤ، تم ریلیکس رہو، میں صبح ہی رومی کے فون کی ساری ڈیٹیل نکلواتا ہوں اور کل بارہ بجے سے پہلے پہلے۔۔۔ اس لڑکے کا سارا بائیو ڈیٹا تمہاری ٹیبل پر ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھ سے پرامس کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟"

"تم اس چیز کو ابھی اپنی مام کے سامنے ڈس کلوز نہیں کرو گی کیونکہ اس سے معاملات مزید خراب ہوں گے۔" حمزہ کی بات پر وہ مبہم انداز میں مسکرائی۔

"آپ اگر مجھے ایسا نہ بھی کہتے تو ٹرسٹ می، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"اچھی بات ہے، آئی تھنک، اب ہمیں نکلنا چاہیے، بہت رات ہو چکی ہے تمہیں تو میرے جیسے ہینڈسم

بندے کے ساتھ بیٹھتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔" حمزہ نے اسے دانستہ چھیڑا، وہ اسے ریلیکس کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں ایسے ہی رلیجہ اندر ہیں آپ، تبھی ہر وقت لڑکیوں کے ساتھ لنچ ڈنر کر رہے ہوتے ہیں۔" شہرزاد نے کیفے ٹیریا سے نکلتے ہوئے اس پر طنز کیا۔

"ایکسکیوزمی، میری چھوٹی بہن تھی وہ حریم۔" اس نے ہنستے ہوئے وضاحت دی۔

"میں نے پوچھا ہے آپ سے؟" وہ کندھے اُچکا کر مسکرائی۔

"سچ سچ بتاؤ اس دن ٹینشن تو بہت ہوئی ہوگی تمہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس بات کا حوالہ دے رہا تھا جس دن اس نے سرینہ ہوٹل میں حریم کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے اسے بُری طرح اگنور کیا تھا۔

"میرا ظرف اتنا چھوٹا نہیں ہے حمزہ، مجھے ٹینشن اس لڑکی پر نہیں بلکہ اس رویے پر ہوئی تھی جو آپ نے اس وقت میرے ساتھ روا رکھا تھا۔" وہ اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ حمزہ نے بڑی احتیاط سے اس کی طرف کا دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"اب پتا چلا، رویے کس طرح انسانوں کو توڑتے ہیں؟"

وہ اس کے برابر بیٹھا ہوا سنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوا تو شہرزاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے وہی چاہت کا جہان آباد تھا، جس کی کمی اس نے پچھلے دنوں شدت سے اپنی زندگی میں محسوس کی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے گویا ہوئی تو حمزہ کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکان رقصاں ہوئی۔

"تم بہت اہم ہو میرے لیے، میں تم سے جتنا بھی خفا ہوں، مجھے پلٹ کر تمہاری طرف ہی آنا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھے اسے یقین دلا رہا تھا اور بہت دن بعد شہرزاد نے خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

بڑی حویلی میں آج کا دن بہت ہلچل بھرا تھا۔

میر وہاج کی کالز کا ریکارڈ نکلوانے کے بعد پولیس ان کے بیسٹ فرینڈ حیدر تک پہنچ چکی تھی جن سے ان کی آخری بار بات ہوئی تھی اور حیدر کے متضاد بیانات اور بوکھلاہٹ نے پولیس کو اس کی طرف سے مشکوک کر دیا تھا اور سب کو یقین تھا کہ میر وہاج کے قاتل کو پکڑنا اب مشکل نہیں۔

حاکم علی اور اس کے گھر کے مردوں کی توجہ ایک بار پھر درشہوار سے ہٹ کر اس معاملے کی طرف ہوگئی تھی۔ اس بار قسمت درشہوار کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی لیکن حاکم صاحب اور تاجدار بیگم کے درمیان سرد جنگ ابھی بھی جاری تھی جسے ان میں سے کسی نے بھی ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"یہ خدیجہ کون تھیں امی؟" اس رات درشہوار نے ماں سے لپٹ کر سوتے ہوئے وہ سوال پوچھا۔ جو شام سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

"ایک تھی بے چاری، قسمت کی ماری، جو تمہارے دادا کی خودسری کی بھینٹ چڑھ گئی۔" تاجدار کا لہجہ تلخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"آپ لوگوں نے اس کے لیے اسٹینڈ کیوں نہیں لیا؟" درشہوار نے اپنے ازلی منہ پھٹ انداز میں کہا۔

"اسٹینڈ لینے اتنے آسان نہیں ہوتے۔ رسموں اور رواجوں سے ٹکرانے کے لیے بہت بڑا جگرا چاہیے اور اتنے سالوں بعد اگر میری زبان کھلی ہے تو صرف اس لیے کہ میرے اپنے کلیجے میں ہاتھ پڑا ہے، میرا وہاج مجھے

جیتے جی مار گیا، میں اب اپنی کسی اور اولاد کی قربانی نہیں دوں گی۔" تاجدار بیگم جذباتی ہوئیں تو درشہوار سمجھ گئی کہ جب تک انسان کے اپنے سینے پر ہاتھ نہیں پڑتا وہ تب تک بیٹھ کر خاموشی سے بس دوسروں کا تماشا دیکھتا ہے۔

"لیکن تم یہ بتاؤ، یہ مناہل وہی لڑکی ہے ناں، جس سے برہان شادی کرنا چاہتا تھا۔" ہلکے سے توقف کے بعد تاجدار بیگم نے آہستہ سے پوچھا تو درشہوار فوراً اٹھ کے بیٹھ گئی۔ وہ لمحہ آچکا تھا جس سے وہ ڈرتی تھی۔

"ہاں وہی ہے لیکن انہوں نے مجھے نہیں ورغلایا، میں خود ان کے گھر گئی تھی کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں تھا۔" درشہوار نے اپنے سچ میں ہلکی سی جھوٹ کی آمیزش کی۔ اسی وقت سائیڈ میز پر رکھے اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور ہادی کا نمبر دیکھ کر اس کا دل بے اختیار دھڑکا۔

"کس کا فون ہے اس وقت درشہوار؟" تاج دار بیگم نے وال کلاک کی طرف دیکھا جس پر اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"مناہل کا، میں اس سے بات کر کے آتی ہوں۔" وہ سیل فون اٹھا کر بڑی سرعت سے کمرے سے نکلی۔

کوریڈور بالکل خالی تھا اور دسمبر کی سرد رات میں ہر کوئی اپنے کمروں میں دبکا بیٹھا تھا، وہ کال اٹینڈ کر کے ایک کونے میں چلی آئی۔ دوسری طرف ہادی مسز قریشی کے بیڈ روم میں تھا اور ان کے بہت زیادہ اصرار پر اس نے درشہوار کا وہ نمبر ڈائل کیا تھا جو مسز قریشی نے جاتے ہوئے زبردستی اسے دیا تھا جس سے ان کا رابطہ ہو سکے۔

"کیسی ہو درشہوار؟" ہادی کے سنجیدہ انداز پر درشہوار کے دل کی دھڑکن بہت عرصے بعد اس طرح بے ربط ہوئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

"فائن، ممی کو تمہاری بہت ٹینشن ہو رہی تھی، ان ہی کے کہنے پر میں نے یہ کال کی ہے۔" ہادی کی اگلی بات نے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔

"مجھے معلوم ہے میں اتنی قسمت کی دھنی نہیں ہوں، جسے آپ جیسا بندہ خود سے یاد کر سکے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ کر گئی اور اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو ہادی بھی ہلکی سی خفت میں مبتلا ہوا۔

"یہ لو ممی سے بات کرو۔" اس نے فوراً ہی فون مسز قریشی کی طرف بڑھا دیا جو اس کی آواز سن کر بڑے اپنائیت بھرے انداز میں اس کا حال احوال پوچھ رہی تھیں انہیں درشہوار سے کافی انسیت ہو گئی تھی اور ویسے بھی وہ اتنے دن ان کے ہاں رہ کر گئی تھی اور یہ ایک فطری بات تھی۔

"بیٹا کوئی بڑا ری ایکشن فیس تو نہیں کرنا پڑا تمہیں اپنی فیملی کی طرف سے؟" چند رسمی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"آنٹی، جتنا بڑا دکھ اور تکلیف، میں ان کو دے کر گئی تھی اس کے مقابلے میں کوئی چیز بھی بڑی نہیں ہو سکتی۔" وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔

"غلطی تو کسی بھی انسان سے کبھی بھی ہو سکتی ہے۔" مسز قریشی نے اسے حوصلہ دیا۔

"لیکن ہماری سوسائٹی کسی عورت کی دانستہ کی گئی غلطی کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرتی۔ ہمارا ظرف عورت کے معاملے میں کبھی بڑا نہیں ہوتا۔" درشہوار نے چند ہی دنوں میں زندگی کا بہت گہرا تجربہ کیا تھا۔

"تم ٹینشن مت لو، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور تمہارے بھائی کے قاتل تک تو پولیس پہنچ ہی چکی ہے، لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے تمہارے بھائی کو کیوں مارا؟ بیچ میں ایسا کیا ہوا ہوگا۔" مسز قریشی نے کھل کر تبصرہ کیا۔

"مجھے لگتا ہے وہاج بھائی کے جرم میں یہی شخص ان کا معاون ہوگا، جس نے اپنا نام سامنے نہ آنے کے چکر

یں انہیں ہی جان سے مار دیا۔" درشہوار روانی میں وہ بات کر گئی، جس کی طرف ابھی تک کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ وہ چونک گئیں۔

"تم یہ بات کیسے کر سکتی ہو درشہوار؟" ان کے چہرے پر دبا دبا سا جوش دیکھ کر پاس کھڑا ہادی بھی تھوڑا متجسس ہوا۔

"اس کے علاوہ اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ وہ وہاج بھائی کا بیسٹ فرینڈ تھا اور فارحہ بھابھی کے مطابق جن دنوں صندل والا معاملہ ہوا ان دنوں حیدر بھائی بھی ان کے ہاں آئے ہوئے تھے۔" درشہوار کی بات پر ان کے کان کھڑے ہوئے۔

"اس کا مطلب ہے صندل کی میڈیکل رپورٹ غلط نہیں تھی۔" مسز قریشی کو اپنے کیس کے لیے وہ پوائنٹ مل گیا تھا جس پر وہ مزید کھیل سکتی تھیں۔

"ہاں ایسا ہی ہے، لیکن مجھے لگتا ہے، آپ کو ایک اور خاتون کی بھی مدد کرنی چاہیے جس کے پورے خاندان کو میر حاکم نے جلا دیا تھا۔" درشہوار کی اس بات پر مسز قریشی ہل گئیں جبکہ درشہوار کو خود پتا نہیں چلا کہ اس نے یہ بات مسز قریشی کے ہی سامنے کیوں کی۔

"تم اپنے خاندان کے خلاف بات کر رہی ہو درشہوار۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔

"ظلم تو پھر ظلم ہوتا ہے آنٹی، وہ میرے خاندان کا کوئی شخص کرے یا کوئی اور اسے اس کا خمیازہ بھگتنا چاہیے، تاکہ آنے والی نسلیں ان سے عبرت پکڑیں اور ہو سکتا ہے اس کے بعد ہمارے خاندان پر ٹوٹنے والی ناگہانی آفتوں کا سلسلہ رک جائے۔" وہ عالیہ قریشی کو لمحہ لمحہ چونکا رہی تھی۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں ہوں بیٹا، میری خواہش ہے تم یہ بات مجھ سے فیس ٹو فیس کرو۔" وہ اب اس کی باتوں پر سچ مچ پریشان ہوئیں۔

"میں ثبوت کے ساتھ بہت جلد آپ سے ملوں گی، اپنا خیال رکھیے گا۔" درشہوار فون بند کر چکی تھی۔

مسز قریشی نے بھی بات ختم کر کے سیل فون پریشانی سے ہادی کی طرف بڑھایا جو ان کے چہرے پر موجود تشویش کے سائے دیکھ کر فکر مند ہو رہا تھا اور جب مسز قریشی نے اسے ساری بات تفصیل سے بتائی تو وہ بھی ہکا بکا رہ گیا۔

"یہ لڑکی پاگل تو نہیں ہو گئی، اب کیا اپنے ہی خاندان کے خلاف آپ کو ثبوت دے گی؟"

"وہ پاگل نہیں دل کی صاف اور سر پھری ہے، ایسے لوگوں پر جب کسی چیز کی دھن سوار ہوتی ہے تو وہ اسے کر کے ہی دم لیتے ہیں، لیکن مجھے لگتا ہے اس حادثے نے اسے بہت بدل دیا ہے، بہت سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہے وہ۔" مسز قریشی نے اس کی طرف داری کی۔

"یہ کیسی سمجھداری ہے، جو اپنے ہی خاندان کا کچا چٹھا آپ کے حوالے کرنے پر تل گئی ہے۔"

"تمہیں یاد نہیں، اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمارا بھرپور ساتھ دے گی۔" مسز عالیہ قریشی نے اسے یاد دلایا۔

"لیکن کیوں؟" ہادی تحیر میں مبتلا ہوا۔

"یہ سوال تم مجھ سے نہیں اپنے آپ سے کرو ہادی، وہ یہ سب تمہارے لیے کر رہی ہے۔"

مسز قریشی کے صاف انداز پر وہ ہکا بکا ہوا جبکہ وہ مبہم انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں اور کمرے سے نکل گئیں۔ ہادی دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کے بیٹھ گیا، درشہوار ہمیشہ کی طرح اسے پھر حیران اور پریشان کر گئی تھی۔

☆☆☆

ذوالکفل، مونیکا کو اس کے میکے میں چھوڑ کر خود واپس لاہور چلا گیا تھا۔

مونیکا نے اپنی پریگنینسی کا سارا وقت اپنی ماں کے پاس گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور ذوالکفل کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، وہ روزانہ اپنی بیوی سے فون پر بات کرتا اور ہر دس پندرہ دن کے بعد ملتان کا چکر بھی لگا لیتا۔

جارج اور مارتھا کو گھر خالی کرنے کے لیے ملنے والی دھمکیوں کا انداز کافی جارحانہ ہو چکا تھا اور ایک دن تو مونیکا جب اپنے شوہر کے سامنے رو پڑی تو ذوالکفل کو مجبوراً بڑی حویلی میں دوبارہ قدم رکھنا پڑا، جہاں نہ جانے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی، وہیں جا کر اسے بی جان کی علالت کا پتا چلا تو وہ مزید بے چین ہو گیا، اپنی ماں سے اسے دنیا میں سب سے زیادہ محبت تھی۔

''بہت اچھا ہوا یہ بھی پتا چل گیا کہ تمہاری بیوی کا تعلق اس گھٹیا خاندان سے ہے جس نے زبردستی مسجد کے برابر والی زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' اس کے باپ کے لہجے میں موجود زہر میں اضافہ ہوا۔

''آخر آپ کو اس زمین میں کیا انٹرسٹ ہے؟ ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟'' ذوالکفل اپنے باپ کے سامنے ڈٹ گیا۔

''مسئلہ مجھے نہیں علاقے کے لوگوں کا ہے، وہ لوگ کونسلر کے پاس روزانہ شکایتیں لے کر آتے ہیں، ایک پاک جگہ کے برابر میں ناپاک لوگوں کی موجودگی سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔'' اپنے باپ کی اس بے تکی دلیل پر ذوالکفل استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

''حالانکہ یہ بات سارا علاقہ جانتا ہے کہ آپ کارنر کے اس پلاٹ پر کوئی کمرشل پلازہ بنانا چاہتے ہیں۔''

''بکواس بند کرو تم اپنی، تمہارے باپ کے پاس زمین کی کون سی کمی ہے، ہم مربعوں کے مالک تمہارے سسرال کے اس دو ٹکے کے گھر پر نظر رکھیں گے۔'' وہ حد درجہ مشتعل ہوئے۔

''بابا آپ کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، آپ کی زمین کی ہوس کبھی ختم نہیں ہو گی لیکن میں آپ کو بتا رہا ہوں اس خاندان کو اگر دوبارہ آپ کے کونسلر نے کوئی دھمکی دی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' ذوالکفل نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دھمکی دی۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

اس کے والد کے تن بدن میں تو گویا آگ لگ گئی اور ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں، وہ تو پہلے ہی جارج کی خودسری سے خائف تھے اور جب انہیں پتا چلا کہ اسی خاندان کی لڑکی نے ان کے خالص سادات گھرانے میں نقب لگائی ہے تو ان کی نفرت میں دگنا اضافہ ہو گیا، انہوں نے اسی رات علاقے کے کونسلر کو حویلی میں بلوا کر وہ خوفناک، گھٹیا منصوبہ بنایا، جسے کوئی بھی انسانیت بھرا دل رکھنے والا انسان سنتا تو کانپ اٹھتا۔

کچھ دن تو بہت خاموشی اور سکون سے گزر گئے، مونیکا کا پورا خاندان مطمئن ہو گیا کہ شاید ذوالکفل کے سمجھانے پر شاہ صاحب نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے، ان ہی دنوں مونیکا کی ڈلیوری کے دن قریب آ گئے اور اس دن اس کی صبح سے ہی طبیعت خراب تھی اور چونکہ ڈلیوری میں پورے ایک ہفتے کا ٹائم باقی تھا اس لیے مارتھا اپنی بیٹی کو لے کر نشتر ہاسپٹل چیک اپ کے لیے پہنچ گئی جہاں اسے ایمرجنسی میں آپریشن کے لیے ایڈمٹ کر لیا گیا۔

مونیکا اور مارتھا دونوں صبح آٹھ بجے سے ہاسپٹل میں تھیں اور انہیں اس بات کی قطعاً خبر نہیں تھی کہ ان کے پیچھے کتنی بڑی سازش ہو چکی ہے۔

جارج کے گھر کے سامنے سیوریج لائن سے ملنے والے مذہبی مواد نے پوری گلی کے مذہبی جذبات کو بھڑکا دیا اور رہی سہی کسر کونسلر کے مسجد میں کیے جانے والے اعلان نے کر دی جس میں اس نے نعوذباللہ بے حرمتی کرنے کا الزام اس خاندان پر لگا دیا تھا جو اس شہر کے سب سے بڑے خاندان کے ذاتی عناد کا شکار تھا۔

اسپیکر پر کی جانے والی جذباتی تقریر سن کر بہت سے سر پھرے باہر نکل آئے جنہوں نے اس واقعے کی تصدیق کیے بغیر مونیکا کے والدین کے گھر پر حملہ کر دیا اور ان کا ساتھ دینے کے لیے ذوالکفل کے باپ کے کرائے کے غنڈے بھی پہنچ گئے اور چند ہی گھنٹوں میں پورے علاقے میں انتشار برپا ہو گیا، جارج کی کمیونٹی کے لوگ ان کی مدد کے لیے جب پہنچے تو دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف آگ کا طوفان برپا گیا۔

کچھ لوگوں نے جارج کے گھر پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی اور اس کا باپ اپنے بچوں کو باہر نکالتے نکالتے خود بری طرح سے جھلس کر موقع پر ہی انتقال کر گیا اور اس کی موت نے فسادات میں مزید اضافہ کر دیا۔

مونیکا ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دے کر اپنی ماں کے ساتھ گھر پہنچی تو اس کی دنیا اجڑ گئی تھی، اس کا خوب صورت گھر کوئلہ بن چکا تھا اور وہاں اب کالی سیاہ اینٹیں اور ان اینٹوں سے اٹھنے والا بدصورت یادوں کا دھواں تھا، ماں تھا جھولیاں اٹھا اٹھا کر بین کر رہی تھی اور خدا سے مدد مانگ رہی تھی۔

مونیکا کے بہن بھائیوں کے جھلسے ہوئے جسم ہاسپٹل پہنچنے سے پہلے ہی لقمہ اجل بن گئے۔ مونیکا کا دل صدمے سے پھٹ رہا تھا اور ذوالکفل جیسے ہی ملتان پہنچا اس وقت تک اس کا پورا سسرال اس کے باپ کے انتقام کا نشانہ بن کر ختم ہو چکا تھا۔

وہ مونیکا کو لے کر بڑی حویلی پہنچا تو ___ آپے میں نہیں تھا، اسے معلوم تھا کہ مونیکا کے خاندان نے اس کی اور مونیکا کی محبت کا خمیازہ بھگتا ہے اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا، اس نے حویلی پہنچ کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کے بھائیوں سے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کا پسٹل نکال کر لے آیا تھا جو اس کے بھائیوں نے بمشکل اس سے چھینا، اس کی ماں منہ پر ہاتھ رکھے صدمے بھرے انداز میں یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔

”مجھے نفرت ہے تم سب سے، میں زندگی میں تم سب کی شکلیں کبھی نہیں دیکھوں گا۔“ وہ مشتعل انداز میں چیخ رہا تھا۔

”بکواس بند کرو، نکالو ان سب کو حویلی سے۔“ اس کا باپ ابھی ابھی وہاں پہنچا تھا، اس کے چہرے پر فتح کا خماری تھا۔

”میں مونیکا نہیں، خدیجہ ہوں۔ میرے خدا نے میرا سینہ نور کی روشنی سے بھرا ہے، یہ اسی کی آزمائش ہے اور میرا رب بہترین انتقام لینے والا ہے، تم لوگ خود اپنے خاندان کی بربادی اپنے سامنے دیکھو گے۔ ان شاء اللہ یہ میرے رب کا وعدہ ہے، جو کسی سے زیادتی کرے گا اس کا انجام بھگتے گا۔“

وہ اپنے نومولود بیٹے کو فرش پر رکھ کر دل چیر دینے والے لہجے میں روتے ہوئے پورے خاندان کو بتا رہی تھی، سب جانتے تھے اس واقعے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے لیکن سب کے ہونٹوں پر مصلحت کے تالے تھے۔

مونیکا کی ماں نے اسی شام ریل کی پٹری کے نیچے آ کر جان دے دی، وہ کیسے اپنے پیاروں کے بغیر اکیلی رہ سکتی تھیں، ذوالکفل اپنے خاندان سے سارے تعلق ختم کر کے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ وہ شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئے۔

مونیکا کو لگا اس کا سارا خاندان اس کی وجہ سے تباہی کا شکار ہوا ہے اور ان پر یہ عذاب اسی کی وجہ سے اس کے شوہر کے خاندان نے مسلط کیا ہے۔ اسی لیے اسے ذوالکفل سے بھی بےزاری محسوس ہو رہی تھی، اس کے لیے زندگی اسی دن ختم ہو گئی۔ وہ اپنے بیٹے کو بڑی حویلی والوں کی نفرت سہنے کے لیے ان کے پاس نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

اس رات جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ نکلی تو دل میں ٹھان چکی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اس پورے خاندان سے دور رکھے گی اور اس سلسلے میں اسے اب اپنے شوہر پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا، اسے اس چیز کا بھی خوف تھا کہ

کہیں اس کی اولاد اپنی شناخت پالے یے حق کے لیے اس حویلی کے در پر دوبارہ نہ چلی آئے تبھی اس نے ٹرین میں بیٹھے ہوئے وہ فیصلہ کیا جو کوئی ماں کبھی نہیں کر سکتی۔

جس فیصلے کو کرنے کے لیے لوہے جیسا جگرا چاہیے تھا، جسے سوچتے ہی جھرجھری سی محسوس ہوتی تھی۔

مونیکا کا ارادہ قطعاً بھی خودکشی کا نہیں تھا لیکن جب اس نے اپنے بیٹے محمد احمد کو ویران اسٹیشن پر چھوڑا تو اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ جذبات سے مغلوب ہو کر یہ قدم تو اٹھا چکی تھی لیکن اب اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا، اس سے پہلے کہ وہ ٹرین کی زنجیر کھینچ کر اسے روکتی، اس کا پیر پھسلا اور اجل نے اسے بڑی مہارت سے دبوچ لیا اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے پورا خاندان چوبیس گھنٹوں میں ختم ہو گیا۔

☆☆☆

''تم بریک فاسٹ ڈھنگ سے کیوں نہیں کر رہی ہو؟''

ڈائننگ روم میں پائن ایپل جوس کا گلاس پکڑے ٹینا بیگم نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی رومیصہ کو ٹوکا، جس نے سردی کی شدت سے بچنے کے لیے کم اور اپنا پھیلتا ہوا وجود چھپانے کے لیے کشمیری شال اچھی طرح سے اوڑھ رکھی تھی۔ سردیوں کے موسم نے اس کی اچھی خاصی بچت کر دی تھی۔

''آپ کو ہمیشہ میرے کھانے پینے کی ہی ٹینشن لگی رہتی ہے، کر تو رہی ہوں بریک فاسٹ۔'' وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

''جب خود ماں بنو گی تو تب پتا چلے گا ماں کی کیا فیلنگز ہوتی ہیں اولاد کے لیے۔''

ٹینا بیگم کی اس بات پر اس کا دل بے اختیار دھڑکا اور وہ نظریں چرا کر جلدی جلدی بوائل انڈا کھانے لگی، وہ شہزاد کے آنے سے پہلے ناشتے کی ٹیبل سے اٹھنا چاہتی تھی تاکہ اس کا سامنا نہ ہو سکے لیکن جیسے ہی اس نے دودھ کا گلاس اٹھایا، شہزاد ڈائننگ روم میں داخل ہوئی اور رومیصہ نے گھبرا کر ہاتھ میں پکڑا گلاس بغیر پیے میز پر رکھ دیا۔ جو تھوڑا سا چھلک کر میز کی سطح کو بھی خراب کر گیا۔

''اوہ مائی گاڈ، شیری یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' ٹینا بیگم اس کے ماتھے اور بازو پر ہوئی بینڈیج دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ایکسیڈنٹ کے بعد شہزاد سے ان کا پہلی بار سامنا ہو رہا تھا رات وہ بھی خاصی لیٹ واپس آئی تھیں۔

''ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔'' اس نے یوں بتایا جیسے یہ کوئی انتہائی عام سی بات ہو۔

''واٹ؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' وہ پریشان ہوئیں، رومیصہ نے بھی کن انکھیوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا، جو خود بھی دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

''آپ تو خود انکل سیفی کے ساتھ ڈنر پر تھیں تو آپ کو کیا پریشان کرتی۔ حمزہ کو کال کی تھی، وہ آ گیا تھا فوراً۔'' شہزاد نے تھرماس سے چائے، کپ میں ڈالتے ہوئے سرسری انداز میں رومیصہ کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''تم یہ دودھ کیوں نہیں پی رہی ہو، آج کل تو ویسے ہی تمہیں اس کی ضرورت ہے۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے رومیصہ کی طرف دیکھا، جس کا اس بات پر رنگ فق ہوا لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال کر گلاس منہ سے لگا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا خالی کر گئی۔

''تم اسے چھوڑو، مجھے بتاؤ، کیسے ہوا یہ حادثہ؟ اور گاڑی کہاں ہے تمہاری؟'' مسز قریشی کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''مام حادثے کسی سے پوچھ کر تھوڑی ہوتے ہیں، ایک وین کو بچاتے ہوئے الیکٹرک پول سے ٹکرا گئی تھی۔ گاڑی حمزہ نے ورکشاپ بھجوا دی ہے، دو تین دن میں واپس آ جائے گی، باقی یہ چھوٹی موٹی چوٹیں تو لگتی ہی رہتی ہیں۔ ڈونٹ وری۔''

وہ ٹوسٹ پر جیم لگا کر ایسے لاپروائی سے بات کررہی تھی جیسے یہ حادثہ کوئی بڑی بات نہ ہو۔ رومیصہ کو اس کے انداز سے اتنا تو علم ہو گیا تھا کہ وہ اس کا راز کم از کم ابھی مام کے سامنے نہیں کھولے گی اور اس سوچ نے اسے خاصا پرسکون کردیا تھا۔

"پتا نہیں اتنی ریش ڈرائیونگ کرنا کہاں سے سیکھ لی ہے تم نے، لگتا ہے تم پر بھی رومی کا اثر ہوتا جارہا ہے۔" ٹینا بیگم نے گرین ٹی کپ میں ڈالتے ہوئے ہلکی سی ناراضی کا اظہار کیا تو وہ مسکرادی۔

"آپ بتائیں، آپ کی کیا مصروفیت ہے، مجھے اگلے دو تین دن کے لیے آپ کی گاڑی کی ضرورت ہوگی۔" اس نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کے لیے یونہی کہا، اور اس میں کامیاب بھی ہوگئی۔

"فی الحال تو تم مجھے ائیرپورٹ ڈراپ کرو، کراچی میں فیشن ویک چل رہا ہے، ایک ہفتے کے لیے جانا ہے مجھے۔" ٹینا بیگم کا پروگرام سنتے ہی رومیصہ کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

"اچانک کیسے بیٹھے بٹھائے آپ نے پروگرام بنالیا؟" شہرزاد حیران ہوئی۔

"یہ تمہارے لیے اچانک ہے میرے لیے نہیں، پچھلے ایک ماہ سے تیاریاں چل رہی ہیں۔" انہوں نے اپنی بیٹی کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"چلیں ٹھیک ہے، جلدی کریں، مجھے آج آفس میں کافی کام نبٹانے ہیں۔"

شہرزاد ٹھیک دو گھنٹے بعد ٹینا بیگم کے ساتھ اسلام آباد انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر موجود تھی، جہاں ان کی آدھے گھنٹے بعد کراچی کی فلائٹ تھی، اس وقت ائیرپورٹ پر رش کافی کم تھا۔ جب وہ مام کو سی آف کرنے کے لیے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کرکے اندر کی طرف بڑھ رہی تھی، اسی وقت کسی فلائٹ کے مسافر باہر آرہے تھے۔

ٹینا بیگم، اسے رومیصہ اور گھر کے حوالے سے کچھ ضروری ہدایات دے رہی تھیں، جسے شہرزاد سرسری انداز میں سن رہی تھی، جیسے ہی وہ دونوں لاؤنج کے پاس پہنچیں، ٹینا بیگم کے قدم سست ہوئے اور وہ رک گئیں۔ شہرزاد نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے چونک کر دیکھا۔

ٹینا بیگم متنفر نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھیں، ان کا چہرہ ایک دم تناؤ کا شکار ہوا، شہرزاد نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ ان کے عین سامنے حاکم علی، میر خاقان کے ساتھ ملتان سے آنے والی فلائٹ سے باہر نکلے تھے۔ ان دونوں کو میر وہاج کیس کے سلسلے میں ایمرجنسی میں واپس آنا پڑا تھا۔ اس وقت ان دونوں کے درمیان صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا، میر حاکم کی سرد نگاہیں شہرزاد پر اور ٹینا بیگم کی زہر آلود نگاہیں میر خاقان پر جمی ہوئی تھیں۔ جو ان سے نظریں چرائے کھڑے تھے۔ ٹینا بیگم نے شیری کا بازو پکڑا اور پراعتماد انداز میں آگے بڑھ گئیں۔

"یہ وہی لڑکی ہے نا بیرسٹر شیری، جس نے پہلے شجاع غنی اور اب صندل کیس میں ہاتھ ڈال رکھا ہے۔" میر حاکم علی کے زہر آلود لہجے پر خاقان نے شاکڈ انداز میں اپنا سر ہلایا، ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔

"بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہے یہ، لگتا ہے پر کاٹنے ہی پڑیں گے۔"

میر حاکم اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ میر وہاج کے ہونٹوں پر قفل لگا ہوا تھا۔ ان کے لیے صدمے کی بات اتنے سال بعد ٹینا بیگم سے سامنا نہیں بلکہ ان کے برابر میں سر اٹھا کر بڑے اعتماد کے ساتھ کھڑی بیرسٹر شیری تھی۔ جس کے نقوش میں انہیں جانی پہچانی شباہت نظر آرہی تھی۔ انہیں اپنے خاندان کی بربادی کے پیچھے چھپا، نامعلوم ہاتھ آج پہلی دفعہ نظر آیا اور پہلی ہی بار انہیں احساس ہوا کہ ان کے گریبان تک پہنچنے والے اس ہاتھ کو وہ زندگی بھر نہیں جھٹک پائیں گے۔

باقی آئندہ

شازیہ الطاف ہاشمی

آسمان تلے

اسپتال میں آج عاصمہ کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ عباس ٹیکسی والے کی تلاش میں نیچے گئے تھے۔ تین دن کی ثمن اس کی گود میں آنکھیں موندے پڑی تھی۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ تھی۔ مگر اسپتالوں کا مخصوص ماحول، اسٹریچرز کے آنے جانے دھکیلے جانے کی آواز، اردگرد بھاگتے وارڈ بوائز، نرسیں، دوائیاں، اسپتالوں سے وہ ہمیشہ دور بھاگا کرتی۔ مگر اب کی بار پھر میجر آپریشن ہی اس کا نصیب ہوا، نصیب کا لکھا کون ٹالے اور پھر ہزار دعاؤں کوششوں کے ساتھ وہی ہوا جو رب کو اس کے لیے منظور تھا اور اللہ جو کرتا ہے وہ کبھی بھی غلط نہیں ہوتا۔

ساتھ والے بینچ پر بے زار صورت لیے ہاجرہ خاتون بیٹھی تھیں۔ بیٹے کی وجہ سے وہ بس مارے باندھے ہی آئی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ ابھی اٹھ کے بھاگ جائیں گی۔ ساس والے قصے ہیں تو پرانے گھسے پٹے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ساس کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ کہیں بنی بھی ہو گی تو اس کے علم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ کہاں سے کہاں جا نکلی تھی۔ بیٹھے بٹھائے خیالات کہاں نکل جائیں، کسی کو کیا پتا۔

ہاجرہ خاتون بھی کہیں سفر پر نکلی ہوئی تھیں کہ پتا نہیں کب جان چھوٹے، سامان سارا بندھا رکھا تھا۔ پانی کی بوتل۔ کل کے کھانے والے برتن اور ننھی ثمن کی فراکیں۔ وہ بچوں کی شاپنگ خوب دل لگا کے کیا کرتی تھی۔

سعدیہ کا استقبال بھی اس نے خوب محبت سے کیا تھا کہیں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اور ثمن کی دفعہ بھی اس نے کپڑوں اور کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ دنیا کی سب سے پیاری چیز بچے ہی تو ہیں۔ نوزائیدہ بچے کی صورت سے بڑھ کر پیاری شے اور کون سی ہو سکتی ہے بھلا۔ پھول جو ابھی کھلا بھی نہیں اور کھل جائے تو اور بڑھ کے حسین۔ بس بچے بڑے جلدی ہو جاتے ہیں چھوٹے چھوٹے کیوں نہیں رہ جاتے۔ سعدیہ عباس کے ساتھ نیچے گئی تھی، وہ مینگو جوس کی ضد کر رہی تھی تو عباس اسے بھی ساتھ لے گئے۔

''چلو جلدی کرو بھئی۔ گاڑی مل گئی ہے راشد بھائی کی۔

اب اٹھ جاؤ، اچھا پہلے میں اماں کو بٹھا آؤں پھر تمہیں لے چلتا ہوں۔''

وہ اماں کو بازو سے پکڑ کر نیچے لے گئے تھے۔ وہ چلنے پھرنے میں کسی کا سہارا لیتی تو نہیں تھیں مگر عباس اپنی ماں کے لیے ایسے ہی تھے۔

''اب تم ذرا ہمت کر لو۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور کامیاب ٹھہری۔ ثمن کو لیے وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ عباس نے جلدی سے اسے بیٹھنے میں مدد دی۔ پیچھے کی سیٹ پر ہاجرہ خاتون اور وہ بیٹھ گئیں۔

''مبارک ہو بھابی۔'' راشد بھائی نے مبارک دی تھی۔

''خیر مبارک بھائی۔'' وہ بھی مسکرا دی۔ راشد بھائی کے ساتھ فرنٹ والی سیٹ پر سولہ سترہ برس کی بچی بھی تھی، وہ چپ چاپ چادر میں خود کو سمیٹے آگے دیکھ رہی تھی۔

''جگنی کو اسکول سے لینے آیا تھا تو سامنے روڈ پر عباس بھائی مل گئے سوان کا مسئلہ بھی حل ہوا ورنہ تو ان ٹیکسی والوں کے ریٹ اور نخرے بھی بہت بڑھے ہوئے ہیں آج کل۔''

راشد بھائی مہارت سے گاڑی چلاتے ہوئے اماں سے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے جبکہ عاصمہ کا سارا دھیان ثمن میں تھا۔ وہ ہلکا سا کسمسائی۔

ان کا گھر آ گیا۔ عباس اور نذر بھائی (دیور) نے اسے اترنے میں مدد دی اور راشد بھائی واپس چلے گئے۔

''السلام علیکم خالہ جی۔'' بہت موٹی خاتون سامنے تھیں۔ ان کے اخلاق نے عاصمہ کا دل جیت لیا تھا۔

''بہت پیاری بیٹی ہے ماشاء اللہ، اللہ نصیب اچھے کرے۔'' خالدہ خالہ کی اپنی تین بیٹیاں تھیں اور آخر میں بیٹا۔ باتوں باتوں میں وہ اپنی ساس مرحومہ کا ذکر لے بیٹھیں اور ان کی زندگی کا اتار چڑھاؤ کا سن کر تو عاصمہ کو اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔ یہاں تو صرف سرد مہری اور لاتعلقی کا عذاب برداشت کرنا پڑ رہا تھا اور خالدہ خالہ نے عملاً عذاب سہا تھا۔ ان کی باتوں نے عاصمہ کے آنسوؤں سے بھرے دل کو کافی تسکین پہنچائی تھی۔ خالدہ خالہ رخصت ہوئیں اور پھر ان سے گھر آنے کا وعدہ بھی لے گئیں۔

جاتے جاتے انہوں نے ثمن کو سو کا نوٹ بھی تھما



دیا۔ وہ سو روپے کے نوٹ کو دیکھتی رہی۔ بات سو روپے کی نہیں تھی بلکہ اصل حقیقت تو دوسروں کی ذات میں دلچسپی لینے کی تھی۔

انہوں نے جس طرح محبت سے تھوڑا سا وقت عاصمہ کو دیا تھا۔ وہ قابل قدر سے بھی بہت آگے کی چیز تھا۔

☆☆☆

وقت ذرا سا آگے سرکا۔ وہ صحت یاب ہو کر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ ثمن چھ ماہ کی ہو گئی۔ خالدہ خالہ کے گھر میلاد تھا۔ بلاوا آیا تھا۔ اس نے جلدی سے گھر سمیٹا اور روانہ ہو گئی۔ بہت سی خواتین ان کے درمیانے درجے کے گھر باتوں میں مشغول تھیں۔ خالدہ خالہ کی بیٹیاں ان کے برعکس بہت دبلی پتلی اسمارٹ سی تھیں۔

تینوں لڑکیاں اسے سلام کرنے آئیں تو ایک کو اس نے پہلے تعارف سے ہی پہچان لیا۔ وہ حمنیٰ تھی۔ دھیمی سی مسکراہٹ والی پیاری سی بچی جو ان دنوں نائنتھ کے پیپرز دے کر فارغ تھی۔ حمنیٰ سب سے بڑی تھی اور بے حد بااخلاق سمجھ دار لڑکی تھی۔

”بہت سوچتی ہے اپنے بہن بھائیوں کے لیے۔ بیٹی نہیں بیٹا ہے میرا۔ پیٹ کاٹ کاٹ کے پڑھا رہی ہوں، اللہ کرے محنت ٹھکانے لگے۔ بہت ذہین ہے میری بچی، پوری کلاس میں سب سے زیادہ نمبر لیے ہیں۔ اب آگے بھی بہت محنت کی ہے۔ اچھے نمبروں سے پاس ہو گی ان شاء اللہ!“

ان کی آنکھوں میں بالکل عاصمہ جیسے خواب سجے تھے جنہیں وہ ٹوٹنے کے ڈر سے بہت سنبھال سنبھال کے پلکوں پر سجائے پھرتی تھیں۔ شوکت چاچا (خالدہ خالہ کے شوہر) کی چھوٹی سی دکان تھی۔ گھر کے سو خرچ تھے مگر ان کے سلیقے طریقے سے ہزاروں کی آمدن لاکھوں کی کمائی لگ رہی تھی۔ لان کے سوٹ جو لڑکیوں نے خود سی کر پہنے ہوئے تھے۔ نفاست و خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھے اور چہروں پر نرم سا تاثر۔

عاصمہ اپنی سعدیہ کو ایسا ہی پُرعزم اور سمجھ دار دیکھنا چاہتی تھی۔ سعدیہ پاس بیٹھی بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

حمنیٰ نے اسے ٹھنڈا ٹھار شربت پیش کیا اور سبز شیفون کا لہراتا دوپٹہ اس کے ساتھ ہی رخصت ہوا۔ لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے، مضبوط اور آگے بڑھنے کی لگن رکھنے والی۔

راشد بھائی حمنیٰ کو اکیڈمی چھوڑتے اور لے جاتے تھے۔ خالدہ خالہ نے کرائے کی بچت کی خاطر ہی جٹھانی کی اکڑ کو نظر انداز کر کے راشد، جو حمنیٰ کے تایا زاد بھائی تھے ـــــ یہ ذمہ داری سونپی تھی۔

”صبر و رضا کے پیکر لوگ اس دنیا میں کم رہ گئے ہیں مگر ناپید نہیں ہوئے ابھی“ عاصمہ نے ہر بار یہی سوچا تھا۔

”اللہ کرے یہ لڑکی اپنی منزل کو ضرور پالے۔ اس کی محنت اور خلوص ٹھکانے لگے۔“

سعدیہ پانچویں سال میں قدم رکھنے ہی والی تھی کہ عاصمہ نے اس کی سالگرہ آنے سے پہلے ہی بیگ اور یونیفارم تیار کر لیا۔ نیلے اور سفید یونیفارم میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ عاصمہ کو کام اور وہ بھی وقت پر ہر کام نبٹانے کی عادت تھی اور کام تو ہے ہی وہ جو وقت پر ہو جائے، دیر کا کیا سوال۔ کم از کم عاصمہ کی ڈکشنری میں تو یہی درج تھا جلی الفاظ میں۔ ہیڈ مسٹریس کو عباس کا شناختی کارڈ تھما کر وہ بیگ سے سعدیہ کا برتھ سرٹیفکیٹ نکال رہی تھی تو کمرے میں کوئی داخل ہوا تھا۔

”السلام علیکم......“ سلیقے سے دوپٹہ لپیٹے وہ حمنیٰ تھی۔

عاصمہ عمر کے اس حصے میں تھی کہ وہ حمنیٰ کو نہ بیٹی کہہ سکتی تھی نہ بہن کیونکہ خود اس کی شادی بھی بڑی جلدی ہو گئی تھی۔ اٹھارویں سال میں تو سعدیہ اس کی گود میں تھی۔ اب وہ حمنیٰ کی چاچی تو بننے سے رہی۔ خیر رشتہ دوستی اور محبت کا جڑا تو جڑ ہی گیا۔ بات خاندان کے رویوں اور دکھوں سے نکل کر اس کے خوابوں کی دنیا تک پہنچ گئی۔ اس لڑکی کے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا۔ یہ تو اسے پہلے ہی علم تھا مگر ایسی حساس بھی ہو گی یہ آج پتا چلا تھا۔

پتا نہیں لوگ والدین کی غلطیوں کی سزا ان کی اولاد کو کیوں دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے خالدہ خالہ نے شوکت چاچا سے بھاگ کے شادی کی تھی اور وہ غیر ذات سے تھیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی تربیت ان اچھی ذات والے غرور بھرے انسانوں سے

بڑھ کے کی تھی مگر لوگوں کو بھی کوئی سمجھا سکا ہے بھلا۔
حمنیٰ نے بی ایس ایس کے بعد سرکار کا اسکول جوائن کر لیا تھا۔ اسکول کی ٹیچر صاحبہ کی طبیعت خراب تھی۔ کچھ گھریلو مسائل تھے سو انہوں نے اپنی کلاس حمنیٰ کے حوالے کی اور پانچ ہزار ماہانہ اسے دینے لگیں اور وہ بھی اپنی آگے کی پڑھائی کا خرچا اٹھانے کی خاطر آنے لگی۔
عاصمہ کی دعائیں حمنیٰ کے ساتھ تھیں۔

☆☆☆

''بڑی جلدی آگئے آج؟'' ابھی ابھی سعدیہ ہوم ورک کر کے اپنے گڑیا والے گھر سے کھیلنے میں مگن بھی نہ ہو پائی تھی کہ عباس آگئے۔
''ہاں، آج جلدی نکل آیا۔ کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ۔''
وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی۔ ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالی اور سالن گرم کرنے رکھ دیا۔
''تمہیں پتا ہے۔ حمنیٰ بھاگ گئی ہمارے ہی ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور بھاگی بھلا کس کے ساتھ ہے؟''
''حمنیٰ بھاگ گئی!! وہ ایسی نہیں ہے۔'' عاصمہ ان کی بات رد کرتے ہوئے بولی۔
''عاشر نے بتایا تھا مجھے۔ وہ راشد نہیں۔ اسی کے ساتھ چکر چل رہا تھا اس کا اور ہماری بیگم صاحبہ کو علم ہی نہیں۔ سارے محلے میں راشد کے ساتھ معاشقے کی دھوم تھی۔ بھئی کتنی ہی بار تو ہوٹلوں میں۔''
''کیا کہہ رہے ہیں آپ، لوگ تو یوں ہی اڑاتے رہتے ہیں۔ ان کی زبانیں تو بس۔ خالدہ خالہ غیر جو ہیں تو سب نے انہیں ذلیل کرنا فرض سمجھ لیا ہے۔''
''واہ بھئی، ہماری بھولی بیگم!''
عباس نے روٹی ہاٹ پاٹ سے نکالی اور آلو مرغی کا سالن پلیٹ میں نکالنے لگے۔ پاس بیٹھی عاصمہ سوچوں میں گم تھی۔
''ایسا نہیں ہو سکتا حمنیٰ ایسی نہیں ہے۔''

☆☆☆

''کہاں جا رہی ہیں خالہ؟'' ہاجرہ خاتون سر پر چادر لیے تیار تھیں۔
''خالدہ کے ہاں جا رہی ہوں، وہ راشد ہے

ناں حمنیٰ کی تائی کا لڑکا اسی کے ساتھ نکاح ہے حمنیٰ کا۔ ایک تو یہ آج کل کی لڑکیاں پتا نہیں پیسے کو ہی سب کچھ کیوں سمجھتی ہیں۔ راشد اس کے ابا کے برابر ہے۔ ہاتھوں میں کھیلی ہے اور اب عشق لڑانے لگی۔ توبہ توبہ آج پچاس ہزار والا ماں نے پھانس دیا ہے کل کسی لاکھ والے کے ساتھ چل نکلے گی۔''
اماں جب شروع ہوئیں تو پھر بولتی گئیں۔

☆☆☆

''عاشر کے ہاں میلاد ہے عاصمہ! تم چلی جانا۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''
پھر سعدیہ، ثمن اور عاصمہ ہی گئے۔ میلاد کی محفل ختم ہوئی تو لڑکیوں نے موبائل نکال لیے۔ لمبے سیاہ بال اور باریک سرخ قمیص میں سے زیر جامہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گلے میں موٹی سی چین اور دوپٹے کے نام پر مفلر سا پھر جب مڑ کر اس نے دیکھا، عاصمہ کے حلق سے آواز تک نہ نکلی۔
''حمنیٰ......!'' اور خالدہ خالہ کا چست پاجامہ اور ناچ ناچ کر چلنا پھرنا اُن کے اصل رنگ ڈھنگ۔ ......اف عاصمہ حمنیٰ کے میک اپ کی تہہ میں چھپے چہرے کو پہچان ہی نہ پائی۔ غلطی کس کی تھی؟ حمنیٰ کی، راشد بھائی کی یا خالدہ خالہ کی؟
حمنیٰ تو کم عمر تھی، نادان تھی۔ کچی عمر کی لڑکیوں میں سوجھ بوجھ کہاں ہوتی ہے۔ مرد کی میٹھی میٹھی باتوں کو محبت سمجھ کر تن من وار دیتی ہیں۔
راشد بھائی کو ایک کم عمر، خوب صورت لڑکی کا ساتھ مل رہا تھا تو وہ یہ موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔ خالدہ خالہ نے کرایہ بچانے کی خاطر اپنی کم عمر خوب صورت بچی کو راشد بھائی کے سپرد کر دیا۔ یہ نہ سوچا کہ عورت مرد کا ساتھ آگ اور تیل کا ہوتا ہے۔ حمنیٰ تو پھر خوش قسمت تھی۔ راشد بھائی نے شادی کر لی تھی ورنہ مرد تو کھیل کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔
خالدہ خالہ ہی مجرم تھیں۔ قصور ان کا تھا اور سزا حمنیٰ کو بھگتنا تھی۔

☆

عجب تلاش مسلسل کا اختتام ہوا
حصولِ رزق ہوا بھی تو زیرِ دام ہوا

تھا انتظار منائیں گے مل کے دیوالی
نہ تم ہی لوٹ کے آئے نہ وقتِ شام ہوا

ہر ایک شہر کا معیار مختلف دیکھا
کہیں پہ سر کہیں پگڑی کا احترام ہوا

ذرا سی عمر عداوت کی لمبی فہرستیں
عجیب قرض وراثت میں میرے نام ہوا

نہ تھی زمین میں وسعت مری نظر جیسی
بدن تھکا بھی نہیں اور سفر تمام ہوا

ہم اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہیں پچھتاوا
خیال لوٹ کے جانے کا گام گام ہوا

آنس معین

یوں کریں آپ یہ گنجینۂ گوہر دے دیں
آپ اس دردشناسی کو کہاں رکھیں گے

رکھ تو لیں گے مجھے ہمراہ مگر دل زدگاں
میری درویش لباسی کو کہاں رکھیں گے

سوچتے روز ہیں کمرے کے لیے تازہ گلاب
پھر خیال آتا ہے باسی کو کہاں رکھیں گے

دان کرنے کو خود آئی ہے مگر پوچھتی ہے
پہلے بتلائیں کہ داسی کو کہاں رکھیں گے

ٹھیک ہے آپ ہی رکھ لیجیے جنت اپنی
آپ اس میں کسی عاصی کو کہاں رکھیں گے

وہ نہیں آئے گا کہتے ہیں... اگر آ گیا تو
ثانی اس پیش قیاسی کو کہاں رکھیں گے

وجیہ ثانی



عادت سی بن گئی ہے راتوں کو اُٹھ کے رونا
یہ چوٹ ہی عجب ہے پا کر کسی کو کھونا

تری بے وفائیوں نے بے حس بنا دیا ہے
ہے اب تو سب برابر ہو جاگنا یا سونا

بے چین کر رہی ہے تیری بے وجہ خاموشی
کیوں بولتا رہوں میں تم بھی تو کچھ کہو نا

تجھے بھولنے لگا ہوں پھر بھی ہے بے قراری
کانٹوں سے بھر گیا ہے میرا اوڑھنا بچھونا

محسوس کر رہا ہوں، مجھے عشق ہو گیا ہے
کبھی یوں ہی مسکرانا، کبھی یوں اُداس ہونا

مہناز رانی

جو چراغ سینے کی آندھیوں میں جلتے ہیں
وہ ذرا سی کوشش سے
جھلملا بھی سکتے ہیں
حوصلے کے آدمی
اپنے دل کے زخموں پر
مسکرا بھی سکتے ہیں
بُت بنانے والے ہاتھ
فیصلے کے لمحوں میں
بُت گرا بھی سکتے ہیں

مصطفیٰ زیدی

ادارہ

اسٹاپ ہنس کی سدا میٹھا

احتیاط

ریٹائرمنٹ کے بعد جج صاحب ایک غیر ملکی بینک میں کیشیئر لگ گئے۔ ایک روز ایک شخص آیا، جو بڑی رقم کا چیک جلدی کیش کرانا چاہتا تھا۔

جج صاحب بولے "آپ کی شناخت کا ثبوت واضح نہیں ہے۔"

وہ شخص انہیں پہچانتا تھا، طنزیہ لہجے میں بولا۔ "جناب والا! کسی زمانے میں آپ اس سے بھی کم تر ثبوت پر ملزم کو پھانسی پر چڑھانے کا حکم صادر فرما دیا کرتے تھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" جج صاحب تحمل سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "لیکن جب معاملہ کیش کا ہو تو احتیاط کرنا پڑتی ہے۔"

فیس بک

"کیا کھایا تھا؟" ڈاکٹر نے نوجوان لڑکی سے پوچھا۔

"برگر، فرنچ فرائز، پیزا اور کوک۔" لڑکی نے بھرم بازی میں کہا۔

"یہ فیس بک نہیں ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔" ڈاکٹر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"جی ٹینڈے کھائے تھے!" لڑکی نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔

سمجھ دار

لڑکی نے بے چارگی سے کہا۔ "بابا جی، دعا کریں کہ میری شادی کسی سمجھ دار شخص سے ہو جائے۔"

"بچی! گھر چلی جا، سمجھ دار آدمی شادی نہیں کرتا۔" بابا جی نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

یورپ میں گھر کا ایڈریس بتانے کا طریقہ

اسٹریٹ نمبر 4، فورتھ ایونیو،
ہاؤس نمبر D-126 لندن

پاکستان میں گھر کا پتہ بتانے کا طریقہ۔

بس اڈے پر اتر کر رکشہ لے لینا اور اس کو بیس روپے سے زیادہ نہ دینا۔ اس سے کہنا کہ جامع مسجد والی گلی میں اتار دے۔ سامنے کیبل کا ٹاور آئے گا، وہاں سے سیدھے ہاتھ کی تین انگلیاں چھوڑ کر الٹے ہاتھ پر دیکھنا تو نیلے رنگ کا گیٹ نظر آئے گا اور سامنے پکوڑوں کی دکان ہوگی۔ اس سے آگے اونچی نیچی جگہ آئے گی، وہاں پہنچ کر مجھے مس کال دینا، میں وہاں بائیک لے کر آ جاؤں گا اور وہاں سے اکٹھے گھر چلیں گے۔

بی ایم ڈبلیو

لڑکے نے لڑکی سے موبائل فون پر پوچھا۔

"کہاں پر ہو......؟"

لڑکی نے بتایا۔ "میں اپنے ڈیڈی کی بی ایم ڈبلیو کار میں کلب جا رہی ہوں، اس کے بعد مال میں شاپنگ کر کے تمہیں کال کروں گی، تم کہاں پر ہو؟"

"ویگن میں تمہاری سیٹ کے پیچھے بیٹھا ہوں، تم کرایہ مت دینا۔" لڑکے نے جواب دیا۔

فون

منیجر تبریز صاحب نے کسی کام سے چپراسی کو بلایا لیکن بات ادھوری چھوڑ کر واش روم میں چلے گئے۔ ابھی وہ وہیں تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

چپراسی نے فون ریسیو کرلیا۔

اسی اثناء میں منیجر صاحب واپس آ گئے۔

چپراسی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ریسیور ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سر! میرا خیال ہے کوئی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"خیال ہے، کیا مطلب؟ تم یقین سے کیوں نہیں کہہ رہے ہو، یہ میرا فون ہے۔" منیجر تمریز صاحب نے ریسیور تھامنے سے پہلے جرح کی۔

"سر!" وہ دراصل جیسے ہی میں نے ریسیور اٹھایا، دوسری طرف سے کوئی بولا۔

"گدھے! ذرا غور سے میری بات سنو۔"

قصوروار

ایک دفعہ جنگل میں دن کے وقت ایک چیتے اور گدھے میں بحث ہوگئی۔ چیتے نے کہا کہ آسمان نیلا ہے جبکہ گدھا بضد تھا کہ آسمان کالا ہے۔ اگرچہ بات چیتے کی ٹھیک تھی پھر بھی چیتے نے کہا۔

"چلو جنگل کے بادشاہ شیر کے پاس چل کر فیصلہ کرواتے ہیں۔"

دونوں شیر کے پاس گئے اور واقعہ سنایا۔ شیر نے کہا "چیتے کو جیل میں ڈال دو۔"

چیتے نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "بادشاہ سلامت! یہ کیسا انصاف ہے۔ بات بھی میری درست ہے اور جیل بھی مجھے جانا پڑ رہا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "بات سچ اور جھوٹ کی نہیں۔ تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ایک گدھے سے بحث کی۔"

علاج

نوجوان مارتھا کے سر میں پہلی بار درد ہوا تو وہ ڈر گئی۔ سمجھی کہ موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ وہ بھاگی بھاگی پادری کے پاس پہنچی اور اس نے کہا۔ "فادر! میں مرنے سے پہلے اعتراف کرنے آئی ہوں کہ اب تک میری بارہ لڑکوں سے دوستی رہ چکی ہے۔"

پادری نے کہا۔ "گھر جاؤ اور بارہ لیموؤں کو نچوڑ کر شربت بناؤ اور اسے پی جاؤ۔"

"کیا اس طرح میرے سب گناہ دھل جائیں گے؟" مارتھا نے سوال کیا۔

"نہیں! شربت پینے سے تمہارے سر کا درد ختم ہوجائے گا۔" پادری نے جواب دیا۔

کوئی فائدہ نہیں

ایک جاپانی سیاح بھارت کے شہر امرتسر میں تھا۔ ایک روز گھومتے ہوئے اپنے ہوٹل کا راستہ بھول گیا۔ قریب دو کانسٹیبل کھڑے تھے۔ سیاح نے ان سے انگریزی زبان میں اپنے ہوٹل کا راستہ دریافت کیا۔ سپاہی کچھ نہ سمجھے۔ انہوں نے سر ہلا کر معذرت کی کہ وہ انگریزی نہیں جانتے۔ سیاح نے اپنا سوال فرانسیسی میں دہرایا۔ سپاہیوں نے پھر معذرت کی کہ وہ یہ زبان بھی نہیں جانتے۔

چنانچہ سیاح نے اپنا سوال پہلے جاپانی، فرانسیسی، پھر روسی زبان میں دہرایا مگر کانسٹیبل ہر بار منہ لٹکا کر رہ گئے اور سیاح مایوس ہوکر آگے بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد ایک کانسٹیبل دوسرے سے بولا۔ "مہتا جی، ہمیں کوئی غیر ملکی زبان ضرور سیکھ لینی چاہیے تاکہ ہم سیاحوں کی مدد کرسکیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں رنجیت سنگھ جی۔" دوسرا کانسٹیبل سنجیدگی سے بولا۔ "تم نے دیکھا نہیں۔ یہ سیاح کتنی زبانیں جانتا تھا مگر ایک بھی اس کے کام نہیں آئی۔"

بیماری کی جڑ

دو نرسیں ایک مریض کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ ایک نرس نے کہا۔ "میرے خیال میں سامنے والے بیڈ کے مریض کی بیوی اسے اچھا ہونے نہیں دے گی۔"

"کیوں کیا بات ہوئی؟" دوسری نرس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"آج جب وہ آئی تو مریض سے حال احوال پوچھنے کے بجائے بولی۔

"کل مارکیٹ میں نئی سلک کی ساڑھی بڑی اچھی لگی تھی۔ اجازت ہو تو خرید لوں؟"" ☆



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا،

"قیامت والے دن جہنمیوں میں سب سے زیادہ ہلکے عذاب والا آدمی وہ ہوگا جس کے پاؤں کے تلووں میں دو انگارے رکھے جائیں گے۔ جن سے اس کا دماغ کھولے گا، وہ خیال کرے گا کہ اس سے زیادہ سخت عذاب والا کوئی نہیں، حالانکہ ان جہنمیوں میں سب سے زیادہ ہلکے عذاب والا ہوگا۔"

(بخاری مسلم)

حضرت علیؓ نے فرمایا،

حضرت علیؓ نے فرمایا، سات باتیں شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔

1. بہت زیادہ غصہ۔
2. زیادہ پیاس۔
3. جلدی جلدی جمائی کا آنا۔
4. قے۔
5. نکسیر۔
6. بول و براز۔
7. یادِ الٰہی کے وقت نیند کا آنا۔

اہل جنت کے نام،

ابن سعد نے عمران بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ حسن اور حسین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) دونوں نام اہل جنت کے ہیں۔ عہدِ جاہلیت میں یہ نام نہیں رکھے گئے۔

یادِ خدا،

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک انجینئر بلڈنگ کی دسویں منزل پر کام کر رہا تھا۔ ایک مزدور بلڈنگ کے نیچے اپنے کام میں مصروف تھا۔ انجینئر کو مزدور سے کام تھا۔ انجینئر نے مزدور کو کئی دفعہ آواز دی لیکن اس نے نہیں سنی۔ انجینئر نے دس ڈالر کا نوٹ نکالا اور نیچے پھینکا تاکہ مزدور اوپر کی طرف متوجہ ہو جائے۔

لیکن مزدور نے نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور اوپر دیکھے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دوسری دفعہ انجینئر نے پچاس ڈالر کا نوٹ نکالا اور نیچے پھینکا کہ شاید اب کی بار مزدور اوپر کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مزدور نے اوپر دیکھے بغیر نوٹ جیب میں ڈال دیا۔

اب تیسری دفعہ انجینئر نے ایک چھوٹی سی کنکری اٹھائی اور اسے نیچے پھینک دیا۔ کنکر کا مزدور کے سر پر لگنا تھا کہ اس نے فوراً اوپر کی طرف نگاہ کی۔ انجینئر نے اسے اپنے کام کے بارے میں بتایا۔

یہ درحقیقت ہماری زندگی کی کہانی ہے۔

ہمارا مہربان اللہ ہمیشہ ہم پر نعمتوں کی بارش کرتا ہے کہ شاید ہم سر اٹھا کر اس کا شکریہ ادا کریں۔ اس کی باتیں سنیں۔ لیکن ہم اس کی بات نہیں سنتے۔ لیکن جونہی کوئی چھوٹی موٹی مشکل، پریشانی یا مصیبت ہماری زندگی میں آتی ہے، ہم فوراً اس ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف مشکلات میں اللہ یاد آتا ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ ہر وقت جب بھی پروردگار کی طرف سے کوئی نعمت ہم تک پہنچے، فوراً اس کا شکریہ ادا کریں۔ شکریہ ادا کرنے اور اللہ کی بات سننے کے لیے سر پر پتھر لگنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

اقصیٰ ناصر، گلستان جوہر

مانگی ہوئی محبت،

اگر کسی سے کچھ مانگنا ہے تو محبت مانگو
محبت مل جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے
محبت کے بغیر ہر چیز ایسے ملتی ہے
جیسے مرنے کے بعد کفن ملتا ہے
مگر...
میری مانو تو
محبت بھی نہ مانگو
کیونکہ...
مانگی ہوئی محبت کا مزہ
بگڑی ہوئی شراب جیسا
ہوتا ہے
(بانو قدسیہ)

سعدیہ وحید سعدی۔ اسلام آباد

دلیل،

پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن ہر وقت پریشان رہنا انسان کا اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

اچھی بات،

تمہارے والدین تمہیں بچپن میں شہزادوں کی طرح پالتے ہیں لہٰذا تمہارا یہ فرض بنتا ہے کہ اُن کے بڑھاپے میں اُن کو بادشاہوں کی طرح رکھو۔

سحر سکیم۔ کراچی

ورلڈ رپورٹ،

فجر کی اذان سب سے پہلے انڈونیشیا میں شروع ہوتی ہے اور پھر ملائیشیا، ڈھاکا، سری لنکا، انڈیا، پاکستان، افغانستان، مسقط، سعودی عرب، کویت دبئی، یمن، ایراق، ایران، لیبیا، استنبول، امریکہ تک لگاتار نو گھنٹے فجر کی اذان ہوتے ہوئے واپس انڈونیشیا میں پہنچتی ہے جہاں ظہر کی اذان کا وقت ہو جاتا ہے۔ اس طرح پانچ وقت کی اذان سے پوری کائنات میں ایک بھی سیکنڈ ایسا نہیں جب اذان کی آواز نہ آتی ہو۔

طوبیٰ شوال انصاری۔ ملتان

تین باتیں،

جب بھی گناہ کی طرف مائل ہونے لگو تو تین باتیں لازمی یاد رکھو۔
1۔ اللہ دیکھ رہا ہے۔
2۔ فرشتے لکھ رہے ہیں۔
3۔ موت ہر حال میں آنی ہے

نمرہ، اقرا۔ کراچی

نصیحت،

حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت۔
☆ عبادت کے وقت اپنے دل کو قابو میں رکھنا۔
☆ جب دستر خوان پہ بیٹھو تو اپنے پیٹ کو قابو میں رکھنا۔
☆ کسی کے گھر جاؤ تو اپنی آنکھوں کو قابو میں رکھنا۔
☆ کسی محفل میں بیٹھو تو اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔
☆ اللہ اور موت کو ہمیشہ یاد رکھنا، اپنی نیکیاں اور دوسروں کی برائیاں بھلا دینا۔

نادیہ یاسر۔ گوجرہ

کتوں کو مارنا،

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ رضی اپنے بیان میں تکلیف دہ کتوں کو مارنے اور کھیل کے طور پر اُڑائے جانے والے کبوتروں کو ذبح کر دینے کا حکم دیتے رہتے تھے۔ (جو دوسروں کے کبوتروں کو لے آتے ہوں)

(اخرجہ احمد 72/1)



خالدہ جیلانی

کتنا سچ کیوں امید دل کا معاملہ

زاہدہ محمد خان ـــــــ شادی وال گجرات

ایک تو دل کے رستے دشوار بہت ہے
پھر میں پیاسا، اچھے سائیں دھوپ بہت ہے
کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں
کس سے کہتا، اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

حمیرا اکرم ـــــــ ٹنڈو محمد خان

اپنے مسیحا سے اب کوئی امید نہ رکھ ساغر
وہ تنگ دل ہے اور تیرے زخم کی گہرائی بہت

غذیمہ ریاض ـــــــ گاؤں سدو کی گجرات

تھکا دیا ہے اسے آندھیوں نے مل جل کے
وہ اک پرندہ جو اونچی اڑان رکھتا تھا

کوثر خالد ـــــــ جڑانوالہ

جس کی خاطر ساری دنیا چھوڑنے کو جی چاہے
اس کے ساتھ بھی رہ کر، آدمی تنہا ہو سکتا ہے
دنیا داروں میں اکثر درویش نکل آتے ہیں
اور درویش کا کیا ہے صاحب دنیا ہو سکتا ہے

ایشال چوہدری ـــــــ ینومری

ذرا سی بات پہ وہ ہو گیا خفا ہم سے
ذرا سی بات کا دل کو ہوا ملال بہت

نوال افضل گھمن ـــــــ کراچی

وہ مجھ سے دور خوش ہے، خفا ہے، اداس ہے
کس حال میں ہے کچھ تو میرا نامہ بر کھلے

عائشہ ـــــــ گوجرہ

رات باقی تھی جب وہ بچھڑا تھا
عمر گزری ہے رات باقی ہے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

ہم مبتلائے عشق تھے ہرگز نہ کہہ سکے
خاموش ہی رہے کہ تقاضا وفا کا تھا
ترک تعلقات کے اسباب کیا بتائیں
بس ہو گئے جدا، سوال انا کا تھا

نورینہ حنیف ـــــــ کاندان سرگودھا

آپ اپنی نیند لے لیجیے
قافلہ کب کا کوچ کر گیا

اقرار جلبانی ـــــــ گاؤں دریا خان جلبانی

اس کی امید ناز کا ہم سے یہ مان تھا
عمر گزار دیجیے، عمر گزار دی گئی

صدف عمران ـــــــ کراچی

تیری غفلتوں کو خبر کہاں
میری اداسیاں ہیں عروج پر

ریحانہ چوہدری ـــــــ مدوکے

کر کے ایک دوسرے سے عہد وفا
آؤ کچھ دیر جھوٹ بولیں ہم

رضوانہ شکیل راؤ ـــــــ لودھراں

ذرا سی بات پر محسن جھگڑ لیتے ہو تم آنکھیں
سنو ایسا نہیں کرتے، زمانہ بیچ کھائے گا

ہدیٰ نور ـــــــ کراچی

ہم زمانے سے فقط حسن گماں رکھتے ہیں
ہم زمانے سے فقط توقع ہی کہاں رکھتے ہیں

کوثر خالد سودا ـــــــ جڑانوالہ

رات اندھیری ہے تو کچھ نے دھیان کی مشعل جلا
خیال یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا کر

سدرہ شہزاد ـــــــ گوجرہ

چلو بتائیں تمہیں نشانی اداس لوگوں کی
کبھی غور کرنا، یہ ہنستے بہت ہیں

اقصیٰ ناصر ـــــــ گلستان جوہر

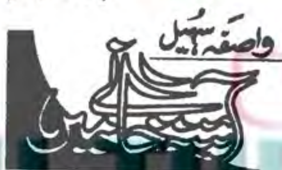
میرا چارہ گر نڈھال ہوا
یعنی میں کیا ہوا؟ وبال ہوا



(کیا عمران عباس کسی ایسی لڑکی سے شادی کر رہے ہیں جو ...... بھئی دبنگ ہوگی ناں جب ہی تو وہ اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں۔)

مدد

گلوکارہ اور اداکارہ (بھئی ماضی کی) کومل رضوی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جب بھی پاکستان آئیں گی تو گلوکاری اور اداکاری کے ساتھ ساتھ اپنا زیادہ وقت سماجی کاموں میں صرف کریں گی (لیکن وہ اداکاری کہاں کرتی ہیں مطلب عام زندگی کے علاوہ اور گلوکاری تو ......؟) وہ زیادہ تر غیر ملکی دوروں پر رہتی ہیں (پر کیوں جی ......؟) اس لیے جب بھی موقع ملتا ہے وہ کراچی آ کر کسی نہ کسی فلاحی تنظیم کے مرکز جا کر وہاں سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں کیوں کہ وہ عبدالستار ایدھی سے بہت متاثر ہیں (اب ہم کیا بولیں اس لیے چپ ......)



فیصلہ

عمران عباس نے اداکاری چھوڑنے کا اعلان کر دیا ہے تاہم وہ شوبز کے دوسرے شعبوں میں کام کرتے رہیں گے۔ (مثلاً ......؟) کس شعبے میں یہ ابھی نہیں بتا سکتے (یعنی فیصلہ کر بھی لیا لیکن کس شعبے کام کریں یہ نہیں بتا سکتے۔ تو فیصلہ کیا کیا؟)

عمران عباس کے بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ اداکاری سے کنارہ کشی ڈائریکشن کی دنیا میں قدم رکھنے کے باعث کی ہے یا (بھئی بولی وڈ میں کام مل گیا کیا ......؟ لیکن اداکاری ......؟) کسی اور وجہ سے۔

ویسے پچھلے دنوں اپنے ایک انٹرویو میں عمران عباس نے شادی کرنے کا اشارہ بھی دیا تھا (کس سے ......؟) لیکن بات یہ ہے کہ عموماً خواتین اداکارائیں شادی کے بعد شوبز چھوڑتی ہیں مرد تو ......



گزشتہ دنوں بھی وہ کراچی کی جدید ترین ایمبولینس سروس فراہم کرنے والی ایک سماجی تنظیم کے دفتر پہنچ گئیں۔ جہاں انہیں ادارے کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا تاکہ کومل اپنے فنکارانہ تعلقات استعمال کرتے ہوئے ان کے پیغام کو آگے پہنچانے میں مدد کرسکیں۔ (کومل تو ویسے بھی مدد کرسکتی ہیں اگر چاہیں تو......؟) اس پر کومل رضوی نے کہا کہ وہ وہاں زیر تعلیم بچوں کی بہبود کے لیے جو بھی کرسکیں ضرور کریں گی۔ (تو کیا کیا پھر؟)

غصہ

ہمارے کچھ فنکار اپنی فیملی کے بارے میں اتنے حساس ہوتے ہیں کہ بعض اوقات وہ بلاوجہ اپنے آپ کو متنازع بنالیتے ہیں۔ حال ہی میں ہونے والی ایک نجی چینل کے ایوارڈ شو کی تقریب میں جب میزبان نے ماحول کو مزید خوشگوار بنانے کے لیے ایک چھوٹا سا مذاق کرتے ہوئے کہا کہ اس سال پاکستان کی ٹی وی انڈسٹری میں کئی نئی جوڑیاں سامنے آئی ہیں۔ جیسے اقراء عزیز، فرحان سعید کی جوڑی۔ احد میر اور سجل علی کی جوڑی اور فیروز خان اور علیزے کی جوڑی۔ (واضح رہے کہ اسکرپٹ میں فیروز خان اور ان کی



بیگم علیزے کا نام نہیں تھا) اس مذاق پر فیروز خان غصے میں آگئے اور ایوارڈ انتظامیہ کو کہا کہ ”آئندہ اگر کسی ایوارڈ شو میں میری فیملی کے ساتھ مذاق کیا گیا تو میں اس کا بائیکاٹ کردوں گا۔ میں شوبز کا حصہ ہوں میری فیملی نہیں (تو کیا حمیمہ ملک اور دعا ملک فیملی کا حصہ نہیں صرف بیگم ہی) لہٰذا بولنے سے پہلے ایک بار سوچ لیں۔ (حالانکہ غصہ تو عروہ کو آنا چاہیے کہ فرحان کے ساتھ اقرا کی جوڑی بنادی؟) کہنے والے تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اس میں اتنا غصہ آنے والی بات نہیں تھی۔ یہ سستی شہرت حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ (آہم)

ادھر ادھر سے

☆ جب حسین نقی عدالت عظمیٰ میں یہ الفاظ ادا کررہے تھے کہ میں عدالت سے معافی مانگتا ہوں تو یہ لفظ ہماری تاریخ پر تازیانہ تھے۔

(مجاہد علی......ہم سب)

☆ صحافی اقتدار کے کھیل میں فریق نہیں ہوتا اور اقتدار کی کشمکش میں غیر جانبدار نہیں ہوسکتا۔ صحافی کو اس سے غرض نہیں کہ عوام کس جماعت اور کس رہنما کو ووٹ کی امانت سونپتے ہیں۔ صحافی کا کام یہ دیکھنا ضرور ہے کہ ووٹ کا عمل شفاف تھا یا نہیں؟

آئین کی بالادستی برقرار ہے یا نہیں؟ ریاست شہریوں کا تحفظ کررہی ہے۔ یا نہیں؟ عدالت میں انصاف ہورہا ہے یا نقشہ نویسی؟ صحافی حرف قانون کا پابند ہے اور حرف انکار کا امین ہے۔

(وجاہت مسعود......شیشہ نظر)

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ...... فوزیہ خادم

میک اپ ...... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ...... موسیٰ رضا





آپ کے خطوط اوران کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں

آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ رب العزت آپ کو بے حساب رزق، خوشیاں اور آسانیاں عطا فرمائے، آمین۔

پہلا خط پتوکی سے فائزہ بھٹی کا ہے، لکھتی ہیں

شعاع کا ٹائٹل اچھا تھا اور زیادہ اچھا ہوسکتا تھا اگر لڑکی کے گلے میں سانپ سے مشابہ چین نہ ہوتی تو...... (چلیں آپ کی مرضی)۔ ''پہلی شعاع'' رضیہ جمیل ملک کی موجودہ صورت حال پر نہایت خوب صورتی سے اظہار خیال کررہی تھیں۔ احادیث کے مطالعہ کے بعد آگے بڑھے۔ آخاہ...... یہ اپنی سائرہ رضا کہاں سے نکل آئیں۔شاہین رشید اتنا اچھا کام۔شاہین رشید زندہ باد۔ زندہ باد۔ سائرہ آپ اٹھیں، آگے بڑھیں اسی چیز کو اللہ نے پسند فرمایا اور اس کا پھل عطا کیا، مگر آپ تو کراچی میں تھیں۔ اٹھ کر ساحل کے پاس پہنچ گئیں، ہم کہاں جائیں؟ خالی آسمان آپ نے کیسے کہہ دیا کہ اس کو اتنی پذیرائی نہیں ملی۔ میں آپ سے بات کرسکتی تو بتاتی کہ پذیرائی اور کسے کہتے ہیں۔ ایک ہم ہیں، ہر دوسرے دن ''خالی آسمان'' کو یاد کرکے رو رہے ہوتے ہیں اور آپ کہتی ہیں اس کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ سائرہ آپ ''برف کا موسم'' کو کیسے بھول گئیں۔ ''شہرزاز'' درشہوار تم نے تو ہمیں بھی دکھی کردیا۔ ''شام کی حویلی میں'' بہت اچھا چل رہا ہے یہ ناول۔ پڑھ کر مزا آرہا ہے، اس میں ساری لڑکیاں خودسر دکھائی گئی ہیں۔ ''پھول منڈی'' فرزانہ کھرل آئیں اور چھا گئیں مگر یہ کیا آئندہ ماہ (فرزانہ آپ بھی)۔ ''کڑی دھوپ'' بس ٹھیک تھی یہ کہانی، پڑھ کر مزا نہیں آیا۔ تو بور بھی نہیں ہوئی۔ ''جتلائے ملال کر'' یہ کہانی اچھی رہی۔ پڑھ کر مزا بھی آیا۔ ''اس برس رہنے دو'' واہ یہ کہانی اس دفعہ رسالے کی شان تھی۔ پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ کچھ جگہ پر تو اتنی ہنسی آئی کہ حد نہیں۔ ''اجالا اور سویرا'' حقیقت کا تلخ لبادہ اوڑھے ہوئے یہ کہانی بھی نارمل رہی۔ ''خط آپ کے'' زاہدہ محمد خان نے جانے کیوں ان رسالوں سے کچھ نہیں سیکھا۔ میرے لیے یہ چیز باعث حیرت ہے۔ یقیناً اور بھی بہت سوں کے لیے ہوگی۔ آپ کے ہاں ابھی تک جون کا موسم چل رہا ہے، ہمارے ہاں تو اتنی اچھی سردی آبھی گئی ہے کبھی آیے گا

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔ 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

ہمارے ہاں، پھر دیکھنا کہ کتنی اچھی سردی پڑتی ہے۔ کیونکہ کھیتوں کے درمیان ہمارے گھر ہیں، چاروں اطراف فصلیں اور درخت لاتعداد ہیں۔ اس وجہ سے اچھی خاصی سردی ہوجاتی ہے، گھر کے سامنے سے جو فصلیں شروع ہوتی ہیں پھر تاحد نگاہ وہ ہی نظر آتی ہیں۔ مگر لگتا ہے کراچی میں آنے سے پہلے لان کے کپڑے بنانے پڑیں گے۔ اگر کبھی کراچی آنے کا ارادہ بنا تو......(اگر کوئی آپ سے ملنے آئے تو آپ لوگ ملتے ہیں کہ نہیں؟)۔ ''یار دل دار'' اچھا رہا۔ ہمارے گھر میں پندرہ بیس سال بعد کسی بچے کی پیدائش ہوئی ہے۔ بھائی کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے، ''مہکاشہ فاروق''۔ باجیوں کی شادیاں پہلے ہوئی تھیں مگر ان کے ہاں اولاد نہیں تو...... اب مہکاشہ آئی ہے تو مہمانوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

☆ پیاری فائزہ! بھتیجی کی پیدائش پر مبارک باد۔ پندرہ بیس سال بعد کسی بچے کی پیدائش آپ کے لیے کتنی بڑی خوشی ہے انداز کرسکتے ہیں۔ مہکاشہ نام بہت منفرد

ہے۔ پہلی بار سنا ہے اس کے معنی کیا ہیں؟
گھر کے سامنے حد نگاہ تک فصلیں، شدید سردی اور لاتعداد درخت...... سچ فائزہ! دل چاہ رہا ہے کہ فوراً آپ کی دعوت قبول کرلیں اور چتو کی پہنچ جائیں۔
کوئی ہم سے ملنے آئے تو ہم ملیں گے یا نہیں؟ یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ جب چاہے تشریف لائیں، ہمیں خوشی ہوگی آپ سے مل کر۔
تبصرہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور جامع ہے، ہر کہانی اور تمام سلسلوں پر آپ نے اپنی ــ رائے کا اظہار کیا، بہت شکریہ۔

فیضہ، زنیرا، ماریہ مرید کے ضلع شیخوپورہ سے، شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ہم خاموش قاری ہیں۔ شعاع، خواتین اور کرن پڑھتے ہیں۔ جس کہانی نے ہمیں خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے "خواب شیشے کا"۔ عفت آپی یہ کیا کیا آپ نے موحد اور نمیر کو ایک کردیا، اچھا نہیں کیا اور سومیہ کا بھی کلیئر نہیں کیا، کبھی موحد سے ملتی تھی اور کبھی نمیر سے۔ پلیز کلیئر کردیں۔ اب آتے ہیں "شہزاد" کی طرف۔ صائمہ جی پلیز حمزہ اور شہزاد کا بھی موڈ ٹھیک کردیں، مزا نہیں آرہا۔ وہاج کی موت پر تھوڑا افسوس ہوا، اسے قانونی سزا ملنی چاہیے تھی۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ سارے افسانے ہی اچھے تھے۔ "اس برس رہنے دو" بہت ہی زبردست۔ "کڑی دھوپ" بھی اچھا تھا "اجالا، سویرا" بس ٹھیک تھا۔ سب سے زیادہ پسند آئی "مبتلائے ملال کر" بہن بھائیوں کا رشتہ ایسا ہی ہونا چاہیے اور اب آخر میں ایک فرمائش سائرہ رضا صاحبہ سے، ہم نوال کو بہت مس کررہے ہیں۔ "یار دل دار" بہت اچھا سلسلہ ہے، اس کو ختم نہ کریں، پلیز۔

فیضہ، زنیرا اور ماریہ! ہماری خاموش قارئین کو زبان ملی، بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا۔ آپ کی رائے جاننے کا ایک ذریعہ آپ کے خطوط بھی ہیں۔
حمزہ اور شہزاد کے موڈ کی فکر نہ کریں، روٹھے ہیں تو مان بھی جائیں گے۔ محبت کرنے والوں کے درمیان اس طرح کی نوک جھونک اور کھٹا میٹھا لڑائی جھگڑا تو چلتا رہتا ہے۔ کہانی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مونیکا کا کردار بھی جلد کھل جائے گا۔
سائرہ رضا نوال والی کہانی لکھ رہی ہیں، یہ ہے کہ معروف زیادہ ہیں اس لیے تھوڑا وقت لگے گا مکمل کرنے میں۔

دعا نور یاسین نے خانقاہ ڈوگراں سے لکھا ہے

سائرہ رضا سے ملاقات، لکھا دیکھا تو سوچا شاید سنگر سارہ رضا ہو۔ لیکن جب دیکھا اور پتا چلا کہ یہ اپنی سائرہ رضا ہی ہیں، خوشی سے چیخ نکل گئی۔ ہم تو سارے گھر والے ہی خوش ہوگئے۔ "خالی آسمان" ایک شاندار تحریر ہے بلاشبہ ناقابل فراموش۔ فرزانہ کھرل کی تحریر بہت دلچسپ ہے۔ دیکھیں اب اگلی قسط میں کیا بنتا ہے۔ "کڑی دھوپ" بھی بہت اچھا لگا۔ "اس برس رہنے دو" کچھ روایتی سا لگا۔ ہم تو ابھی تک صائمہ اکرم کی "دیمک زدہ محبت" اور "سیاہ حاشیہ" کے سحر میں مبتلا ہیں۔ "شہزاد" تو پھر ایک اعلا ترین ناول ہے ان کا۔ رخسانہ نگار تو جب بھی لکھتی ہیں، کمال لکھتی ہیں۔ "بیڑی اور زنجیر" سبق آموز افسانہ تھا اور میمونہ صدف بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ان کی "گمشدہ محبت" اچھی تحریر تھی۔ "سحر عترت" جیسی کسی تحریر کے منتظر ہیں۔ لکھاری شاید سحر ساجد تھیں، یاد نہیں آرہا۔ گزارش ہے کہ اس طرح کی کوئی تحریر، اچھوتی سی دوبارہ لکھیں۔ راحت جبیں اور نبیلہ ابر راجہ سے بھی کچھ لکھوائیں۔

☆ پیاری دعا! "سحر عترت" میمونہ صدف کی تحریر تھی۔ آپ کی فرمائش ان تک پہنچارہے ہیں کہ وہ "سحر عترت" جیسا ناول لکھیں شعاع کے لیے۔
راحت جبیں تو جب سے ٹی وی کو پیاری ہوئی ہیں، ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔ آپ کا خط شاید انہیں یاد دلادے کہ کبھی ہم بھی تھے آشنا۔

آمنہ میر جڑانوالہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

"اس برس رہنے دو" بھی بس ٹھیک ہی تھا۔ "بیڑی اور زنجیر" سو دفعہ کی لکھی کہانی ایک بار پھر آگئی۔ "مجھے مبتلائے ملال کر" کہانی اور موضوع ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ "پھول منڈی" پر تبصرہ محفوظ ہے ابھی۔

"شہرزاد" تھوڑا انٹرسٹنگ تھا۔ "اجالا اور سویرا" بھی بس سو سو تھا۔ "مسکراہٹوں" میں موبائل کا نشہ پسند آیا۔ "سنہری باتیں" واقعی سنہری تھیں۔ کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ میں ایسے ایسے بونگے اشعار ہوتے ہیں کہ بے ساختہ دل سے یہ مصرعہ نکلتا ہے......

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

آپ سے کسی چیز کی فرمائش کر دیں، وہ بھی پوری نہیں ہوتی۔ کم از کم میری تو آدھی بھی پوری نہیں ہوئی ایک تو بڑی دور کی بات ہے۔ پھر میں نے اشعار بھیجے، غزلیں بھیجیں، لطیفے بھیجے، اچھی باتیں بھیجیں، مجال ہے جو ایک بھی چیز شائع کی ہو۔ پتہ نہیں کیا دشمنی ہے، آپ کی مجھ چالاک سے۔ میں نے پوچھا نا قابل اشاعت ہیں تو بتا دیں، کیسے قابل اشاعت ہوں۔ اگر میں کراچی میں رہتی ہوتی ناں تو میں نے سچ میں سائرہ کی طرح آپ کے دفتر میں لڑنے پہنچ جانا تھا۔ میرا مطلب ہے آپ کو سیدھا کرنے، آہم۔ ابھی پھر فرمائشیں کر رہی ہوں، سن لیں۔

نمرہ احمد کا انٹرویو (شدید ترین خواہش)۔ سمیرا حمید کا انٹرویو (شدید خواہش)۔ نمرہ کا، سمیرا کا، عمیرہ کا تو سلسلے وار ناول شعاع میں شروع کریں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی، نور الدین زنگی اور رضیہ سلطانہ کی سوانح تاریخ کے جھروکوں میں شامل کریں۔ اونچے جوڑے یا پونی کے متعلق احادیث۔

مجھے بھی نمرہ احمد سے ایسے ڈائریکٹ بات کرنی ہے پلیز مجھے بتا دیں کہ ان کو کس ایڈریس پر لیٹر لکھا جائے۔

☆ پیاری آمنہ! جب آپ کی کسی سے لڑائی ہوئی ہو، کسی بات پر غصہ آ رہا ہو، امی سے ڈانٹ پڑی ہو یا کھانا آپ کی پسند کا نہ ہو تو اس صورت حال میں ہمیں شعاع پر تبصرہ لکھ کر نہ بھجوائیں۔ آپ کو اس ماہ پرچے کی کوئی بھی تحریر پسند نہیں آئی۔ اس کا ہمیں سچ مچ بہت افسوس ہے۔

نمرہ احمد اور دوسرے مصنفین کی کتابوں کی قیمت اور دیگر معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نمبر پر فون کریں۔

021-32735021

نمرہ احمد کے لیے خط ہمیں بھجوا دیں، ہم ان کو پوسٹ کر دیں گے۔

مہرین سجاد شاہین آباد گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

1982ء کی پیدائش اور 1994ء میں رسالے پڑھنا شروع کیا۔ 2002ء میں شادی ہوئی اور اب ماشاء اللہ چار پیاری پیاری بیٹیاں ہیں میرے شوہر کا فیکٹری ایریا میں دال چاول کا ہوٹل ہے اور میرا رسالہ ہاکر ہوٹل پر ہی دے کر جاتا ہے۔ جسے کبھی میرے سسر اور کبھی میرے شوہر گھر لے آتے ہیں۔ اب 2011ء سے مسلسل نئے لے کے پڑھ رہی ہوں اور کور چڑھا کے بیٹیوں کے لیے سنبھال کر رکھتی ہوں۔ سارے کام خود کرتی ہوں پھر بھی ان کے لیے وقت نکال لیتی ہوں۔ بچوں کے دو رسالے پھول اور تعلیم و تربیت بھی لیتی ہوں کیونکہ بچوں سے زیادہ خود پڑھتی ہوں۔ میری نند جو کہ فیصل آباد میں ہوتی ہیں جب ان کے پاس جاتی ہوں تو خواتین ڈائجسٹ ان سے لے کر پڑھتی ہوں۔

☆ پیاری مہرین! شعاع کی محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ پرچوں سے آپ کی محبت کا حال جان کر خوشی ہوئی۔ آپ کی لکھائی بھی بہت اچھی ہے اور آپ نے خط بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ آپ کے اگلے خط کے منتظر رہیں گے۔

عابدہ مغل نے بھیر کنڈ، مانسہرہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

"شام کی حویلی میں" میرو کی حالت سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ وہی زینب کا مجرم میر منصور ہے۔ "شہرزاد" سب سے بہترین فیصلہ در شہوار کے گھر جانے کا لگا۔ "اس برس رہنے دو" اگر ناول کو تھوڑا سا طویل لکھا جاتا تو بے حد مزے کا ہوتا۔ مدیحہ سعید نیا اور اچھا اضافہ ہیں۔ اجالا، سویرا کی پرمشقت زندگی کے بعد بھی کوئی حسین صلہ نہ ملنے کا دکھ ہوا۔ "یار دل دار" میں کھانے لگنے اور مرغے بننے والے سین سے تو مزا آ گیا۔ دوسرا بہترین افسانہ

''نظر بد'' تھا۔ ''بیڑی اور زنجیر'' مصنفہ نے جانے کتنے ہی فیصلوں کو کمزور کر دیا ہوگا۔ ''زہر طلب'' میں روبی کا خالی ہاتھ رہ جانا دل کو کچھ کر گیا یعنی نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ ''گمشدہ محبت'' کے لیے صرف ایک شعر......

اک داغ باقی ہے
محبت کی آگ باقی ہے

غزل میں احمد مشتاق اور نظم وقار احمد امر یہ دونوں بازی لے گئے۔ باقی تاریخ کے جھروکے سے اس بار بہترین تھا۔ سائرہ رضا سے ملاقات اچھی لگی۔ سائرہ رضا نے کہا کہ ''خالی آسمان'' کو وہ پذیرائی نہیں ملی، غلط کہا جی میرے پاس آج بھی وہ ڈائجسٹ موجود ہے جس میں وہ شائع ہوا تھا۔ اس طرح کا ناول واقع میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوا۔ حمد اور شعر ذرا زیادہ دیا کریں۔ نمرہ احمد کا کوئی مکمل ناول دیں پلیز پلیز۔

☆ پیاری عابدہ! نمرہ احمد خواتین ڈائجسٹ میں ''حالم'' لکھ رہی ہیں۔ وہ مکمل ہو جائے تو پھر ان سے شعاع کے لیے مکمل ناول کی فرمائش کریں گے۔ انٹرویو کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

ثانیہ صدیق ریناله خورد اوکاڑہ سے لکھتی ہیں
شعاع، خواتین اور کرن سے تب کا ساتھ ہے جب سے اردو کو سمجھنا شروع کیا۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ شروع میں سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ کون سی کہانیاں ہیں جو ایک دفعہ کا ذکر ہے'' کے بجائے درمیان سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ میں چھٹی کلاس میں ہوں گی۔ (بچپن کی یادیں......ہی ہی لاجواب)۔ میری ذات ذرہ بے نشاں میں نے آپیوں سے چھپ چھپ کے چارپائی کے نیچے گھس کے پسینے میں شرابور ہو کے پڑھا تھا۔ پڑھنے کے بعد ایک دن وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ناول کے متعلق ہی تو میں نے بھی ان کی گفتگو میں حصہ ڈالنا فرض سمجھا اور کمنٹ کیا کہ کتنا دکھیا ناول ہے۔ یہ ایک بولی کہ ابھی تم دوسرا پڑھنا، وہ اس سے بھی زیادہ دکھیا ہے۔ میں نے کہا اچھا وہ کہاں ہے۔ انہوں نے یہ دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ ان دونوں کی گفتگو میں کوئی تیسری بندی بھی شامل ہو گئی ہے اور جب دھیان دیا تو دونوں لڑاکا طیاروں نے مجھ پر ہلا بول دیا۔ مت پوچھیں پھر کہ میری زبان کی اس وقت کی تیزی نے مجھے کیا دن دکھایا (دکھایا سمجھتے ہیں نا؟)۔ اگر آج مجھے اپنی سوچ مثبت لگتی ہے تو صرف شعاع کی ہی وجہ سے۔ فعل حال کی بات کروں تو شہزاد بہت اچھا جا رہا ہے۔ ہر ماہ درشہوار کے لیے سب قارئین کے خیالات پڑھ کے دکھ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے اس نے برا کیا، اسلام میں لڑکی کی رضامندی لینے کا بھی حکم ہے۔ ایک لڑکے کی یکطرفہ محبت ہمیں اتنی بری کیوں نہیں لگتی جتنی درشہوار کی لگ رہی ہے۔ زاہدہ محمد خان جن تین ناولز کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ ان کو پڑھتے ہوئے انہیں لگا کہ وہ مطالعہ پاکستان کا پیریڈ لے رہی ہیں۔ وہ تینوں ناولز پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ کاش میرے پاس کوئی جادو ہو، میں ہجرت پاکستان سن 1947ء میں چلی جاؤں اپنے پاکستان کے لیے کچھ ایسا کروں کہ میری آنے والی نسلیں فخر سے میرا نام لیں۔

☆ پیاری ثانیہ! آپ ہی نہیں ہم بھی بہن زاہدہ محمد خان کے بھی ممنون ہیں جن کے پچھلے ماہ شائع ہونے والے خط نے آپ کو قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ درشہوار سے سب کو ہمدردی ہوتی اگر وہ غلط قدم نہ اٹھاتی۔ ایک ایسے لڑکے کی محبت میں گھر چھوڑ دینا جو آپ کو پسند بھی نہیں کرتا انتہائی احمقانہ بلکہ خطرناک اقدام ہے۔ اس طرح اگر حقیقی زندگی میں ہو تو سوچیں اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ لڑکا اور اس کے گھر والے ایسی لڑکی کو کس نظر سے دیکھیں گے۔ محبت کا مطلب صرف حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ محبت کی اس سے بڑی تذلیل نہیں ہو سکتی کہ کوئی آپ کو بار بار ٹھکرائے، ذلیل کرے اور آپ اس کے پیچھے پاگل ہوتے رہیں۔ لڑکوں کی بات جانے دیں، ایک عورت نسلوں کی امین ہوتی ہے اس کو اپنی عزت اور وقار کا خیال ہونا چاہیے۔ دنیا میں عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا، محبت بھی نہیں۔

ثمینہ اکرم بہار کالونی کراچی سے رونق محفل ہیں، لکھا ہے
نومبر کا شعاع اپنے خوب صورت سرورق سمیت

بہت جلدی مل گیا۔ آج 5 نومبر ہے، 4 نومبر کو ہماری شادی کی سالگرہ ہوتی ہے۔ ویسے جب سے معیز اکرم جدا ہوا ہے، اپنی کوئی بھی خوشی (خاص طور پر 4 نومبر) منانے کا جی نہیں چاہتا۔ 11 نومبر کو معیز اکرم کو جدا ہوئے پورے چھ سال ہو جائیں گے۔ اللہ اس کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ مگر سائرہ رضا سے ملاقات دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا اور شعاع کھولتے ہی سب سے پہلے ان کا انٹرویو پڑھا (ماشاء اللہ ہم تو پہلے ہی سائرہ کے متاثرین میں سے ہیں۔ اب ان کا ڈرامہ ''دل موم کا دیا'' دیکھ کر ہمارا پورا حلقہ احباب ان کا فین ہو گیا ہے۔ آپ کو بہت مبارک ہو اور میں بہت فخر سے کہتی ہوں کہ بھئی یہ تو ہماری ڈائجسٹ رائٹر ہیں۔ کراچی سے آپ کی والہانہ محبت...... واہ جی واہ، دل شاد ہو گیا۔ میں تو خود اپنے شہر کی عاشق ہوں، خاص طور پر لیاری جو کہ اپنی گندگی سمیت میرے دل میں بستا ہے۔ ''شام کی حویلی میں'' بہت اچھا جا رہا ہے۔ ہلکی پھلکی سادہ سی اسٹوری ہے۔ ''یار دل دار'' ہر ماہ یہ افسانہ دلچسپ رنگ لے کر لکھا جاتا ہے۔ ''شہرزاد'' در شہوار سے ہادی کی جان چھوٹی۔ آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے؟ افسانے تو تقریباً سب ہی اچھے لگے۔ اکتوبر کے شمارے میں جو قابل ذکر کہانی تھی وہ ''موچنگ'' (سحر ساجد) کا ناول تھا۔ پورا ناول میں نے بہت دل سے پڑھا۔ اس کی زبان و بیان اور طرز تحریر کی سادگی سلامت۔ یہ کہانی آج کے ماحول سے مختلف ماحول میں لکھی گئی اور یہی انفرادیت من کو بھائی۔ حیا بخاری کی ''اس برس رہنے دو'' اور ناولٹ ''کڑی دھوپ'' فرح بھٹو کا بہت پسند آیا اور فرح بھٹو شاید کوئی نئی رائٹر تو نہیں؟ پرانے رائٹرز کی جگہ جس خوبی سے نئے رائٹرز نے سنبھالی ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ یا پھر اس میں سارا کمال آپ کی ذہانت اور جوہری والی نگاہ خاص کا ہے۔

☆ پیاری ثمینہ! نام اور عزت دینے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ہمارا کام تو صرف کوشش کرنا ہے، یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہماری کوششیں کامیاب رہی ہیں اور ادارہ خواتین بہت ساری مصنفین کی صلاحیتوں کو سامنے لانے کا ذریعہ بنا ہے۔

شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ معیز اکرم کا غم بھولنے والا تو نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سر جھکانے اور اس کی رضا پر راضی ہونے کا بھی اجر ہے۔ یہ بھی اس کا کرم ہے کہ وہ دکھ دیتا ہے تو صبر بھی دیتا ہے۔

تبصرہ آپ کا حسب روایت جان دار ہے، تہہ دل سے شکریہ۔

مہروش بلوچ، پری وش بلوچ اور دل وش بلوچ نے کوہلو بلوچستان سے محفل کو رونق بخشی ہے

تبصرہ صرف اتنا سا کہ سرورق کو ہماری امی جی غور سے دیکھنے بھی نہیں دیتیں، فوراً ماڈل بے چاری کے میک اپ آلود چہرے پر اسٹیکر (جو پہلے سے میز کے دراز میں ماڈل چہرے پر لگانے کے لیے دستیاب ہوتا ہے) چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ ہم سب کا موسٹ فیورٹ ناول شہرزاد اس دفعہ بھی اپنے عروج پر تھا۔ مہروش کا کہنا ہے جب ''شہرزاد'' کو پڑھتے ہیں تو بجی کھانے کا سا مزا محسوس ہوتا ہے۔ ''یار دل دار'' افشین نعیم کا مزے دار سلسلہ ہے، جاری رکھیے گا اسے۔ رخسانہ نگار عدنان کے ناول کی شروعات تو بہترین رہی۔ اگر آپ ہماری معلومات میں اضافہ کریں کہ درج ذیل مصنفات کے ناموں میں سے کون کون سی رائٹرز بہنیں ہیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔ نمرہ احمد، عمیرہ احمد۔ سائرہ رضا، ایمل رضا۔ مریم عزیز، نبیلہ عزیز۔ تنزیلہ ریاض، آمنہ ریاض۔ مہوش افتخار، فائزہ افتخار۔ کنیز نبوی، کنیز نور علی۔

پری کی خواہش ہے کبھی کراچی آئے اور آپ کے ادارے میں آ کر چھپ چھپ کر دیکھے کہ آپ کس طرح کام کر رہے ہیں؟ شاہین آپا سے وسیم بادامی کے انٹرویو کا کہا تھا لیکن ہر ماہ (مایوسی ہوتی ہے)۔

☆ واہ بھئی! مہروش کو شہرزاد پڑھتے ہوئے بجی کھانے کا مزا محسوس ہوتا ہے، بہت دلچسپ اور مزے دار تعریف ہے۔

پری سے کہیں کراچی آنا ہو تو دفتر ضرور آئیں اور چھپ چھپ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں، ہم آپ کے سامنے بھی کام کر سکتے ہیں۔

آپ نے جن مصنفین کے آپس کے رشتوں کے

بارے میں دریافت کیا ہے ان میں صرف تنزیلہ ریاض اور آمنہ ریاض بہنیں ہیں۔ فاخرہ جبیں اور راحت جبیں بھی بہنیں ہیں۔

شازیہ طارق نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سائرہ رضا نے بالکل ٹھیک کہا ہے ان کے ناول خالی آسمان کو وہ رسپانس نہیں ملا جو ملنا چاہیے تھا۔ تبصروں میں وہ رسپانس بے شک نہیں ملا ہوگا جو انہیں ملنا چاہیے تھا مگر ہم جیسے خاموش قاری بہن بھائیوں نے جو رسپانس آنسوؤں کی شکل میں انہیں دیا ہے وہ انہیں دکھائی تو نہیں دیا مگر وہ بہت زیادہ تھا۔ میری چار بیٹیاں ہیں، تین بیٹیاں ذہنی معذور ہیں۔ ان کے دماغ پیدائشی طور پر چھوٹے ہیں، چلڈرن ہسپتال میں کافی عرصے تک ان کا علاج بھی چلا مگر پھر انہوں نے جواب دے دیا۔ جو میرے بس میں تھا میں نے کیا مگر وہ ٹھیک نہ ہو سکیں۔ آپی میری بیٹیاں کموڈ کے بغیر باتھ روم میں نہیں بیٹھ سکتیں، نہ بول سکتی ہیں نہ خود سے کھانا کھا سکتی ہیں یہاں تک کہ گلاس میں پانی بھی خود سے پلانا پڑتا ہے۔ (آپ کو یہ سب لکھتے ہوئے میرے آنسو ہی نہیں رک رہے)۔ میری اور ان کے پاپا کی جان ان میں بستی ہے، ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں تو کبھی یہ بچیاں تائی، چاچی کے کمرے کی طرف چلی جائیں تو جھڑکیاں دے کر اور بعض اوقات تو دھکا دے کر نکال دیتے ہیں کئی دفعہ چھوٹی والی کا سر پھٹ گیا تھا۔ میرے شوہر کا روزگار نہیں ہے، وہ بیمار ہیں تو میری ساس اپنی پنشن سے گھر کا خرچ چلاتی ہیں۔ ذرا سوچیے، ایک کمرے میں سارا دن کیسے گزرتا ہوگا۔ بس ٹی وی پر میوزک چینل لگا دیتی ہوں اور اسی کی طرف دھیان لگا دیتی ہوں۔ امتل آپی! میں پہلے بھی نماز پڑھتی تھی مگر اتنی پابندی سے نہیں جب سے نمرہ احمد کا نمل پڑھا تب سے قرآن بھی ترجمے سے پڑھتی ہوں اور نماز بھی کوئی کوئی ہی چھوٹتی ہے اور اس کا کریڈٹ میں نمرہ احمد کو دیتی ہوں ورنہ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی کہ ماں باپ کے بعد ان بچیوں کا خیال کون رکھے گا، کون کھلائے گا، کون پلائے گا، کون باتھ روم لے جائے گا۔ نمرہ احمد نے اللہ پر بھروسا کرنا سکھایا اور بتایا کہ صرف ماں باپ نہیں ہوتے، ایک اللہ بھی ہوتا ہے جو اپنے بندوں کو کسی حال میں اکیلا نہیں چھوڑتا۔ آخر میں آپ سے اتنی سی گزارش ہے کہ میری بیٹیوں کے لیے بہت بہت دعائیں کیجیے گا۔ سائرہ رضا سے کہیں، ہم جیسے لاکھوں پڑھنے والوں نے یہ خالی آسمان آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھا تھا اور یہی ان کا اصل رسپانس ہے۔

☆ عزیز بہن شازیہ! ذہنی معذوری بہت بڑا مسئلہ ہے، جس دکھ میں آپ مبتلا ہیں اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ سائنس روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ بیماریوں پر تحقیق ہو رہی ہے، ممکن ہے کہ ــــــــ اس بیماری کا علاج بھی دریافت ہو جائے۔

ہم دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو صحت و تندرستی دے اور ان کے روزگار کا کوئی ذریعہ بنائے۔

قارئین سے بہن شازیہ کے کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

مریم امان نے لیہ سے لکھا ہے

شعاع سے کافی عرصے سے تعلق ہے اس کا کریڈٹ جاتا ہے ہمارے پیارے سے ماموں جان کو جو ہمارے لیے نئے پرانے شعاع لاتے ہیں۔ ویسے تو بہت سارے ناول پڑھ لیے میں نے لیکن امر بیل اور یارم نے تو گویا سحر میں ہی جکڑ لیا۔ یارم پڑھا تو بہت مزا آیا سب کریکٹر بہت اپنے اپنے سے لگے۔ ''شام کی حویلی میں'' نام بہت منفرد ہے تھوڑا آگے چل کر پتا چلے گا کہ کیا کیا چل رہا ہے۔ نازیہ اشرف کا شعر بہت پسند آیا۔

بہت خاموش لوگوں سے
بہت الجھا نہیں کرتے

☆ پیاری مریم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا خط تاخیر سے موصول ہوا، اس لیے پچھلے ماہ شامل نہیں ہو سکا۔ شعاع آپ کو پسند ہے جان کر خوشی ہوئی، اپنے پیارے ماموں جان کا ہماری طرف سے بھی شکریہ ادا کریں۔

اقراء طارق، عاصمہ طارق، طیبہ، کومل، سمیعہ شرق پور شریف سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

بہتیرے خط تر ڈالے ہم نے مگر مجال ہے عزت مآب نے شرف قبولیت بخشا ہو۔ ہر بار انتظار، طویل اور کٹھن انتظار، اس بار نہیں تو اگلی دفعہ، پر ہمت نہیں ہارنی۔ خواتین اور شعاع دوست بھی ہیں، ڈاکٹر بھی اور استاد بھی۔ ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور سیکھ رہے ہیں۔ میرے گھر بھانجی ہوئی ہے، اس کا کوئی پیارا سا نام بتادیں۔ سمیرا حمید، ایمل رضا، سائرہ رضا، عفت سحر جی کو ہمارا سلام۔

☆ پیاری بہنو! کامیاب وہی ہوتے ہیں جو ہمت نہیں ہارتے آپ سب کو بھانجی کی مبارک باد۔ اگر بھانجی کا نام آپ نے ابھی تک نہیں رکھا تو اس کا نام "ماہ نور، حریم، تحریم یا ریحاب رکھ سکتی ہیں۔ ریحاب کے معنی ہیں خانہ کعبہ کا غلاف۔

آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کا سلام پہنچا رہے ہیں۔

خزیمہ ریاض نے گاؤں سکلی گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میرے سب سے چھوٹے بھائی جو مجھ سے سات سال بڑے ہیں، وہ بہت اچھے ہیں نہ صرف مجھے شعاع لا کر دیتے ہیں بلکہ میرے لیٹرز وغیرہ بھی اکثر پوسٹ کرتے ہیں۔ رخسانہ جی کا میں تیسرا ناول پڑھ رہی ہوں، "شام کی حویلی میں" پہلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی بہت اچھا ہوگا۔ مکمل ناول "پھول منڈی" بہترین تھا۔ "مبتلائے ملال کر" میں صلہ میں مجھے اپنا بچپن نظر آیا۔ سائرہ رضا سے ملاقات نے تو رنگ جمادیا۔ سائرہ رضا اور ایمل رضا دونوں کی ہی میں تو فین ہوں جی۔

☆ پیاری خزیمہ! معذرت خواہ ہیں۔ آپ کے پچھلے خط پر آپ کا نام نہ لگ سکا۔ آپ کا خط اس ماہ شامل کر رہے ہیں۔

ثمرین اشفاق، نگین اشفاق نے چک نمبر 201 تحصیل فورٹ عباس ضلع بہاولنگر سے شرکت کی ہے

آپی! میں نگین (بی ایس سی) کی اسٹوڈنٹ ہوں اور میری آپی ثمرین (بی اے) کر چکی ہے۔ ہم نے جنوری 2016 سے باقاعدہ رسالے لینے شروع کیے ہیں ہمارا اور رسالوں کا ساتھ تقریباً سات آٹھ سال سے ہے۔ ہمیں سمیرا حمید، نمرہ احمد، عمیرہ احمد، صائمہ اکرام، نبیلہ عزیز بہت زیادہ پسند ہیں۔ ایمل رضا کی کہانی پیال ساز ہمیں بہت زیادہ پسند آئی تھی۔ ناول "شام کی حویلی میں" بہت زبردست جارہا ہے اور فرح بھٹو کی کڑی دھوپ بھی مزا کرا گئی۔ صائمہ اکرم کا شہزاد ہمیں بہت زیادہ پسند ہے۔ اس ناول میں ہادی شہزاد کو پسند کرتا ہے لیکن اپنی دوستی کی وجہ سے اظہار نہیں کرتا۔ اس میں ہادی ذوالکفل کا بیٹا ہے اور ذوالکفل کا تعلق محتشم علی خان کے خاندان سے ہے۔ "پھول منڈی" فرزانہ کھرل کی دوسری اور آخری قسط کا انتظار رہے گا اور افسانے سارے ہی اچھے تھے۔

پیاری ثمرین! ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری قارئین بہت ذہین ہیں اور ان کے اندازے سو فیصد نہ سہی لیکن بہت حد تک درست ثابت ہوتے ہیں آپ کے اندازے کس حد تک درست ہیں۔ یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا ویسے بھی اب "شہزاد" کی چند ہی اقساط باقی ہیں۔

شازیہ ہاشم میواتی کھڈیاں خاص قصور سے شریک محفل ہیں

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں پڑھیں سائرہ رضا کے بارے میں پڑھا زبردست رہا بٹ آپی سائرہ کا "کرن" کے آفس میں پہنچنا چہرے پر مسکراہٹ لے آیا۔ "شام کی حویلی میں" موحد کا لگتا ہے زینب سے تعلق نکل آئے گا۔ بلکہ مجھے تو یہ میرو کا بیٹا لگا ہے۔ میرا موسٹ فیورٹ کیریکٹر "کشف" ہے۔

"کڑی دھوپ" زبردست جب ٹیپو پر گولیاں برسائی گئیں اور پھر اس کے منہ کو دولت کے بل بوتے پر بند کروانا نجانے کہاں مجھے لے گیا۔ آج پتا نہیں ہمارے معاشرے میں کتنی ماؤں کے دل نوچے جاتے ہوں گے۔ کتنے نوجوانوں کی آنکھوں سے سپنے نوچے جاتے ہیں۔

ج: پیاری شازیہ! طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ موجودہ حالات سے آپ

ہی نہیں ہم سب ہی پریشان ہیں جب باڑھ ہی کھیت کو کھانے لگے تو کیا کیا جاسکتا ہے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلی فیورٹ اسٹوری شہزاد کو پڑھا واہ جی واہ اس بار قسط تو بڑی انٹرسٹنگ رہی۔ دوسرا ناول پھول منڈی اچھا تھا۔ تبصرہ محفوظ۔ اس برس رہنے دو کچھ خاص نہیں لگا۔ ہاں شعر لاجواب لگا۔ کڑی دھوپ ذرا ہٹ کے لگا۔ مجھے جتلائے ملال کر، مجھے بے حد پسند آئی۔ اجالا اور سویرا، ہمارے معاشرے کا احساس موضوع افسانہ یار دل دار اس بار ایویں سا لگا۔ آئینہ خانے میں دھندلا نظر آرہا ہے۔ کچھ وراثتی لائیں البتہ تاریخ کے جھرکے اس بار بھی دلچسپ تھا۔

فوزیہ، ہانیہ اور آمنہ! آپ ہماری ان قارئین میں سے ہیں جو باقاعدگی سے پرچا پڑھتی ہیں اور ہر ماہ خط لکھ کر نہ صرف ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی ہیں۔ بلکہ خواتین اور شعاع کے تمام سلسلوں میں شرکت بھی کرتی ہیں۔ شعروں کا انتخاب ہو یا دوسرے سلسلے، آپ کا انتخاب بھی خوب ہوتا ہے۔ اس تعاون کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

زینب نور نے جہانیاں سے لکھا ہے

واہ مزہ ہی آگیا فرزانہ کھرل کو دیکھ کر۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔“ بس بس تھا۔ اس بار میری بہن ”کوثر ناز“ بھی اس سلسلے میں حصہ لے رہی ہیں۔ ناولٹ دونوں ہی اچھے تھے۔ افسانوں میں ”یار دل دار“ اور ”بیڑی اور زنجیر“ بے حد اچھے لگے۔

پچھلی بار ایک بہن نے خط لکھا تھا۔ کچھ بیٹیوں اور ان کے سپنوں کے بارے میں۔ تو جناب میں خود عمر کے اسی دور میں ہوں۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میرے خیال میں اپنی چادر کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ہمارے خواب ہمارے رسالے نہیں بنتے، بلکہ ان کی پیداوار ہمارے ذہن و دماغ سے ہوتی ہے جب مجھے پتا ہے کہ ہم جیسی لڑکیوں کے نصیب میں کوئی ڈرائیور، سبزی فروش یا کریانہ اسٹور والا ہی ہے تو ہم کیوں اونچے خواب دیکھیں۔ اگر کوئی فوجی یا چھوٹا موٹا ڈاکٹر مل جائے تو ہم بے چاریاں خوشی سے پاگل ہی ہوجائیں (تب ہی تو ملتے نہیں ہیں)

خدا گواہ ہے کہ جب سے رسالے پڑھنا شروع کیا ہے۔ بہت سے طور طریقے سیکھ لیے ہیں۔ بول چال میں بھی واضح فرق...... علم میں بھی اضافہ۔

پیاری زینب! بہت عمدگی سے آپ نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک خاص عمر میں بہت کم لڑکیاں حقیقت سے سمجھوتا کرتی ہیں۔ زیادہ تر لڑکیاں خوابوں کی دنیا میں بھٹکتی رہ جاتی ہیں۔ ان کا موقف بھی اپنی جگہ غلط نہیں تھا۔ ہم اپنی قارئین سے درخواست کریں گے کہ مزید اس موضوع پر نہ لکھیں، اللہ تعالیٰ آپ کے تمام خوابوں کو پورا کرے آمین۔

ایشال چوہدری نیو مری

السلام علیکم! کیا حال ہے ڈیئر آپی، پچھلے شمارے میں خط دیکھا تو وہ کسی اور ایشال چوہدری کا لکھا ہوا تھا اتنا کم تبصرہ حالانکہ میں نے اپنی طرف سے مکمل تبصرہ کیا تھا۔ اگر آپ ٹیکس اور مہنگائی کے سارے بدلے مجھ سے نکال رہی ہیں تو سچ میں میرا ووٹ ہی نہیں ہے میں غریب کیا کسی کو وزیر یا مشیر بناؤں گی۔

پیاری ایشال! ہماری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قارئین کے خط شامل کیے جائیں۔ اس لیے ہم خطوط کو ایڈٹ کرکے مختصر کردیتے ہیں صرف آپ کا خط ہی نہیں تمام خطوط ایڈٹ کیے جاتے ہیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کچھ عہد کرتے ہیں

سمیرا حمید

ادارہ خواتین نے جس طرح بدلتے ہوئے مشکل اور پیچیدہ حالات کا مقابلہ صبر و ہمت سے کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ کاغذ کی فراہمی اور اس سے منسلک مسائل سے ادارہ کیسے نبرد آزما ہو رہا ہے، اس پر بات کرنے کے لیے حوصلہ اور صفحات دونوں چاہئیں۔

آپ سب سے مخاطب ہونے کا بہترین ذریعہ ڈائجسٹ ہے۔ گو سوشل میڈیا نے انقلاب برپا کیا ہے، لیکن، ہمارا انقلاب آج بھی خواتین ڈائجسٹ ہی ہے، کیونکہ یہ ان تک بھی پہنچ رہا ہے، جن تک فی الحال صرف روشنی اور آکسیجن ہی پہنچ رہی ہے۔ کمپیوٹر، فون اور انٹرنیٹ نہیں۔ اسی ڈائجسٹ کی وجہ سے ہم سب ایک مضبوط تعلق میں جڑے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنا حال سنا رہے ہیں، ایک دوسرے سے اپنی زندگیاں شیئر کر رہے ہیں۔ میں کچھ سوال اور کچھ عہد لے کر آپ کے پاس آئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

جب دو عالمی جنگیں (ورلڈ وار) ہو چکی تھیں تو ماہرین کا کہنا تھا کہ اب ایک تیسری (آخری) عالمی جنگ ہو گی، جس سے انسان تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ یہ تیسری جنگ شروع ہو چکی ہے، اس کا نام ہے ''ڈپریشن''۔ جو انسان، قوم، نسل، اس جنگ میں جیت جائے گی وہی وقت اور زمانے کو لیڈ کرے گی۔ لیکن اس جنگ سے جیت جانا آسان نہیں ہے۔ یہ بیماری اس وقت دنیا کی تیسری بڑی بیماری بن چکی ہے، اور دنیا کا ہر پانچواں فرد اس کا شکار ہے۔ ہر سال تقریباً آٹھ لاکھ انسان اس بیماری کے ہاتھوں خودکشی کرتے ہیں۔ تاریخ میں کبھی کسی بیماری کی وجہ سے اتنی بڑی تعداد میں خودکشیاں نہیں ہوتیں جتنی اس بیماری کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔

دو سے تین سال کے بعد یہ بیماری دنیا کی پہلی بڑی بیماری بن چکی ہو گی اور دنیا کا ہر شخص اس بیماری میں گرفتار ہو گا۔ اس وقت پاکستان میں ہر تیسرا انسان (آف دی ریکارڈ) اس بیماری کا شکار ہے۔ کچھ جانتے ہیں کہ یہ ڈپریشن ہے، اور کچھ اس سے بے خبر ہیں۔ ہر خاندان میں ایک، دو یا زیادہ افراد اس کا شکار ہیں۔ جو لوگ بظاہر نارمل نظر آتے ہیں، وہ لوگ اندر ہی اندر اس بیماری سے لڑ رہے ہوتے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ اس کی روک تھام کے لیے کام کریں۔ جسمانی بیماریاں اور نظر آنے والے زخم، ان کا علاج آسان ہے، لیکن جو چیز نظر نہیں آ رہی، جس بیماری میں ہر کیس کی نوعیت الگ ہے، اس بیماری سے لڑنا اور اس کا علاج کرنا تھوڑا مشکل ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ یقین رکھنا ہو گا کہ ہر شخص کسی نہ کسی محاذ پر لڑ رہا ہے۔ کچھ اندرونی محاذ (ذہنی، جذباتی) کچھ بیرونی محاذ (مشکلیں، رکاوٹیں وغیرہ)۔ ہم سب جد و جہد کی حالت میں ہیں۔ کچھ حالات سے، کچھ معاش سے، کچھ ناکامیوں سے، کچھ جسمانی تکلیفوں، صدمات اور سانحات سے اور بہت سے لوگ گہرے دکھوں سے۔ زندگی کے سمندر پر، بہت سے پل صراط ہیں، اور ہم سب ہی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی پل سے گزر رہے ہیں۔ ہم مشکل میں ہیں، تکلیفیں جھیل رہے ہیں، مصیبتیں کاٹ رہے ہیں، دکھوں سے سینہ چھلنی کیے ہوئے ہیں اور یہ سب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ (اور یہی زندگی ہے)

میں آج تک جتنے بھی لوگوں سے ملی ہوں، جس کسی کو بھی سنا ہے، اس کے دل کا ایک کونا دکھ سے سیاہ ہی پایا ہے۔ وہ محنت کش ہوں، عام انسان، مسافر،

مزدور، ڈاکٹر، بڑے نام یا کامیاب افراد، مجھے سب کی زندگیوں کے کچھ حصے زخم خوردہ ہی ملے ہیں۔ میں بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہر انسان اندر سے ٹوٹا ہوا ہے، اور مسلسل ٹوٹ رہا ہے، تو پھر کوشش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو جوڑیں، سہارا دیں، کچھ دوا کریں، کچھ دعا کریں۔ کچھ امید دیں، کچھ یقین دلائیں۔

ایک لڑکی کا کہنا ہے کہ اس کے ڈپریشن کی بس ایک ہی وجہ ہے، وہ ہے ساس کا تلخ رویہ۔ ہوسکتا ہے آپ ساس ہوں، اور آپ کی بہو کو آپ کی ایک مسکراہٹ کی ضرورت ہو...... بس...... تسلی بھرے چند لفظ اور محبت بھرے چند فقرے اس کی پوری زندگی بدل دیں۔ ہوسکتا ہے آپ ایک بہو ہیں اور ساس جو آپ کی ماں ہی ہیں، ان کو آپ سے احساس ذمہ داری اور ادب و احترام چاہیے۔ آپ کی ایک نند ہے، جسے آپ کا رعب نہیں "پیار" چاہیے، آپ کی ایک بھابھی ہے، جسے تکرار نہیں، "احترام" چاہیے۔ آپ ایک بیٹی ہیں، اور آپ کے والدین کو آپ کی فرماں برداری چاہیے اور آپ والدین ہیں، آپ کی اولاد کو آپ سے چند ضروری معاملات میں جائز آزادی چاہیے۔ شاید آپ کی بیٹی صرف پڑھنا چاہتی ہے، زندگی کے اہم معاملات میں اپنی جائز مرضی بتانا چاہتی ہے، اپنے چند خواب پورے کرنا چاہتی ہے...... بس...... ہوسکتا ہے آپ خاندان کے سربراہ ہیں اور آپ کے رویے میں جائز لچک، بہت سے مسائل حل کردے۔ خاندان کے افراد کی زندگیاں خوشیوں سے بھر دے۔ ضد، انا اور بے جا دباؤ، یہ کبھی کسی کو کوئی خوشی نہیں دے سکتے۔

ہوسکتا ہے کہ چند باتیں نظر انداز کردینے سے، کچھ درگزر کردینے اور باقی معاف کردینے سے ہماری اور آپ کی زندگیاں آسان ہوجائیں۔

عظیم ہونے کے لیے بہت بڑے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میزان پر سب سے بھاری "خوش خلقی" ہے۔ ہمارے مذہب نے "اخلاق" پر جتنا زور دیا ہے کہ اتنا کسی بھی عبادت پر نہیں دیا۔ اگر ہم پڑوسی رہ کر، خالہ، ماموں، پھوپھو، بھابھی، دادا، ساس، نند، ہو کر اپنی اپنی جگہ پر اپنا دل بڑا کر کے، بہت سی آسانیوں اور خوشیوں کی وجہ بن سکتے ہیں تو پھر دیر کس لیے؟ بن جائیں بہت ساری خوشیوں کی وجہ......

اچھا اخلاق...... یہ مہکتا ہوا وہ پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔ میں نے "اخلاق" کے ہتھیار کو کبھی کند ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہماری ایک مسکراہٹ بہت کچھ بدل سکتی ہے۔ ہمارا لہجہ، انداز، ہمارے الفاظ بہت بڑی تبدیلی لاسکتے ہیں۔ ہماری زندگیاں ایسی ہونی چاہئیں کہ ہم اپنے آس پاس کے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکیں۔ ان کی زندگیاں سنوار سکیں ورنہ انہیں کچھ مشکلوں سے ہی نکال سکیں۔

ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا معاملہ یا دکھ ہوتا ہے جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ جس کے بارے میں بات کرتے ہوئے اسے تکلیف ہوتی ہے۔ ناکام ازدواجی زندگی، جسمانی خامی، خاندانی مسائل، کچھ غلط فیصلے، پچھتاوے، نا آسودگیاں، وغیرہ۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ اس سوال یا بات سے وہ جز بز ہوتا ہے، اداس، پریشان ورنہ دل گرفتہ، تو چلیں ہم اس پر بات کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم وہ سوال ہی نہیں پوچھتے جو کسی کو اپ سیٹ یا دل گرفتہ کردے۔ ہم جسمانی ساخت کی نشاندہی کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ لمبا، چھوٹا، پتلا، موٹا، آنکھیں ایسی، ناک ویسی، رنگ ایسا، آواز ویسی، ہم ان سب پر انگلی اٹھانا روک لیتے ہیں۔

"باتیں...... لوگ باتیں کرتے ہیں...... تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

تو چلے آئیں...... ہم یہ "باتیں" کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

تھوڑا سا خود کو بدلتے ہیں۔ تھوڑی سی زیادہ توجہ خود پر دیتے ہیں۔ پہلے ہم خود سے محبت کرتے ہیں، خود کو اذیت سے نکالتے ہیں، پھر آس پاس

دیکھتے ہیں کہ کسے ہماری ضرورت ہے۔ اگر کوئی کسی پچھتاوے کا شکار ہے تو اس کی مدد کرتے ہیں، اس پر طنز سے خود کو روک لیتے ہیں۔ اگر کسی کا کوئی گناہ سامنے آہی گیا ہے تو چلیں اس کی پردہ پوشی کرکے دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی ناکامیوں سے دلبرداشتہ ہے، تو اسے کامیابی دلانے میں تھوڑی سی مدد کرتے ہیں۔ اگر کوئی آگے بڑھنا چاہتا ہے، لیکن پیچھے رہ گیا ہے، تو اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھتے ہیں۔

مشکلوں بھری زندگی میں، رائی کے دانے کے برابر پیدا کی گئی آسانی بھی "پہاڑ" جتنی بلند ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر بہت معمولی لگتی ہیں۔ میں انہیں درجات کے بلند مقامات پر دیکھتی ہوں۔ آخر ہم کیا کریں گے منفی جذبوں کی تجارت کرکے؟ اس سے تو ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ نہ رب کی رضا، نہ بندے کی خوشی۔ حسد، نفرت، ناپسندیدگی، غصہ، بے جا غم، بے صبری، تکبر، احساس برتری، یہ چیزیں ہمیں تباہ کررہی ہیں۔ تو پھر تباہی کی تجارت کیوں؟ یہ سب جذبے انسان کے وقار کے خلاف ہیں، تو پھر اپنے وقار کی ایسی تذلیل کیوں؟

چیزیں بدل جاتی ہیں، رویے اور سوچ بدلنی پڑتی ہے۔ اور میں آپ سب سے اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ دنیا اور انسانیت کو آپ بھی بچا سکتی ہیں۔ عظمت کے لیے بڑے کاموں کی نہیں، عظیم کاموں کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانیت کی بھلائی کے لیے کیا جانے والا ادنیٰ کام بھی عظمت کے بلند درجے پر فائز ہوتا ہے۔ ایک مسکراہٹ بھی "عظیم ترین کارخیر" ہے۔

ڈپریشن ایک ذہنی مرض ہے، اس سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی پوری روحانی قوت لگانی ہوگی، ہمیں اپنی مدد بھی کرنی ہے اور دوسروں کی بھی۔

مایوسی، ناامیدی، اداسی، روحانی طاقت میں کمی، یہ ذہنی امراض کی وجہ بنتی ہے یا اس مرض کے لیے زہر کا کام کرتی ہے۔ منفی جذبے ہماری روحانی طاقت کو کھا جاتے ہیں، ہمیں اللہ اور زندگی سے دور لے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی کمزوری کو طاقت میں بدلنا ہے، شک کو یقین میں، ناامیدی کو امید میں۔ اس کائنات کی سب سے قیمتی شے آپ ہیں۔ انسان ہے...... تو ہمیں اس انسان کے لیے سب سے زیادہ کوشش کرنی ہے۔

ہماری زندگیاں غیر اہم نہیں ہیں۔ وہ گاؤں کا کسان ہو، تندور پر روٹی لگانے والی خاتون، فٹ پاتھ پر خشک میوہ بیچنے والا، ٹھیلے والا، پڑھا لکھا پروفیسر، ذہین و فطین سائنس دان، یا صرف ماں، باپ...... ہم سب اہم ہیں......

خود کو اہمیت دیں، اپنی زندگی کی قیمت کو پہچانیں، دوسرے انسانوں کے لیے آسانیاں پیدا کرکے دیکھیں، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے رحمت کے سمندر بہا دے گا۔ خود کو دوسروں کے لیے نعمت بن کر دیکھیں، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتوں کے دروازے کھول دے گا۔ زندگی کو صرف رات سے دن نہ کریں، چلیں اٹھیں، انسانیت کے لیے بھی کچھ کریں، اپنے آس پاس، جس کی زندگی بدل سکتے ہیں اس کی زندگی بدل دیں۔ وہ آپ کی بہن ہو، بھائی، ماں، دوست، بھابھی، کزن، یا کوئی بھی...... اس کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں کردیں۔

بے جا غم سے خود کو روکیں، دکھ کو دکھ رہنے دیں، ناسور نہ بننے دیں۔ آج ناکام ہوئے ہیں، کل کامیاب ہوجائیں گے، آج مشکل وقت ہے، آنے والے کل میں بھول بھی جائیں گے کہ کبھی مشکل وقت آیا بھی تھا۔ بیمار ہیں تو یقین رکھیں کہ آپ ٹھیک ہوجائیں گے، آپ اللہ کے قریب ہیں...... اللہ کے قریب ہی رہیں...... خود کو زندگی اور زندگی دینے والے سے دور نہ لے جائیں......

مایوسی کفر ہے...... ہر حال میں اس سے بچیں۔ دوسروں کو بھی بچائیں۔ آئیں کچھ عہد کرتے ہیں، دلوں کو کشادہ، اور اندھیروں کو امید سے روشن کرتے ہیں۔



آمنہ صبور



شاہی دور کا باورچی خانہ

اس بناسپتی کے دور میں جب شاہی دور کے باورچی خانوں کا تصور دماغ میں گشت کرتا ہے تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے تھوڑی دیر کے لیے ہم دیوؤں اور پریوں کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں اور ان کے مفروضہ دسترخوان پر خیالی غذاؤں اور کھانوں پر بیٹھے طبع آزمائی رہے ہیں حالانکہ یہ سارے کے سارے دسترخوان کسی زمانے میں مشرقی تہذیب و تمدن کا ایک جزو تھے۔

نواب شجاع الدولہ کے دور میں یوں تو ہر امیر کا دسترخوان انواع و اقسام کی مرغن غذاؤں سے آراستہ ہوتا تھا لیکن نواب شجاع الدولہ کے دسترخوان کی بات ہی اور تھی۔ ان کے زمانے کے چھ باورچی خانے بہت مشہور تھے۔ اول خود نواب شجاع الدولہ کے محل میں خاص بہو بیگم کا باورچی خانہ جس کا یومیہ خرچ دو ہزار روپے تھا یعنی ساٹھ ہزار روپے مہینہ یا سات لاکھ بیس ہزار روپے سال۔ نواب کے دسترخوان کی خصوصیت یہ تھی کہ علاوہ اس کھانے کے جو خود بہو بیگم کے باورچی خانے میں تیار ہوتا تھا، پانچ دوسرے باورچی خانے کے اچھے اور لذیذ کھانے بڑے بڑے خوانوں میں چن کر آیا کرتے تھے اور نواب کے دسترخوان پر پیش ہوتے تھے۔ یہ پانچوں باورچی خانے جو شاہی باورچی خانے کے ہم پلہ تھے۔ چھوٹے باورچی خانوں کے نام سے موسوم تھے اور جس کے مہتمم اور نائب مہتمم بھی علیحدہ ہوتے تھے۔

مثلاً ایک باورچی خانے کے مہتمم مرزا احسن علی تھے، جن کی جگہ پر بعد میں عنبر علی خاں خواجہ سرا کو مقرر کر دیا تھا اور اس باورچی خانے کا یومیہ خرچ تین سو روپے یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے سال تھا۔ دوسرا باورچی خانہ شجاع الدولہ کی والدہ محترمہ کا تھا جو نواب بیگم صاحبہ کے نام سے مشہور تھیں۔ تیسرا باورچی خانہ مرزا علی خاں کا تھا اور چوتھا سالار جنگ کا اور پانچواں اور چھٹا شجاع الدولہ کے برادر نسبتی یعنی بہو بیگم کے بھائیوں کا تھا۔

جس نفاست پسندی کے ساتھ کھانے تیار کیے جاتے تھے، وہ تو خیر اس دور کی خصوصیت ہی تھی مگر شاہی دسترخوان کی صورت یہ تھی کہ چونکہ نواب شجاع الدولہ بہو بیگم کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تھے، اس لیے کھانا چننے میں بھی بڑے اہتمام سے کام لیا جاتا تھا۔ بہو بیگم صاحبہ پہلے سے دسترخوان پر موجود رہتی تھیں اور جو جو خوان دسترخوان پر آتے جاتے تھے، انہیں مہریاں بہو بیگم کے سامنے کھولتی جاتیں اور ان میں جو پسندیدہ چیزیں مرغوب ہوتیں، وہ دسترخوان پر نکال کر رکھ لیتیں۔ سب کھانے منتظمین مطبخ دیکھ کر اور ان کی باقاعدہ جانچ کر کے بھیجتے تھے کہ ان کے ذائقہ میں کوئی فرق تو نہیں ہے۔

باورچیوں کو ملازم رکھنے میں بھی بڑی جانچ سے کام لیا جاتا تھا۔ دلی یا دوسری جگہوں سے کوئی صاحب کمال باورچی پہنچ جاتا تو اس کا امتحان لینے کے بعد اسے پروانہ تقرری عطا ہوتا۔ صرف ایک چیز اچھی تیار کرنے والے باورچی کی بھی وہ قدردانی اور حوصلہ افزائی ہوتی کہ اس کا دل خوش ہو جاتا۔ چنانچہ نواب آصف الدولہ کے دور میں ایک نیا باورچی پیش ہوا جو صرف ماش کی دال پکاتا تھا۔ اس سے مشاہرہ دریافت کیا گیا تو بولا۔

"پانچ سو روپیہ ماہانہ لوں گا مگر دو شرائط کے ساتھ اور وہ یہ ہے کہ جب سرکار میرے ہاتھ کی پکی دال نوش فرمانا چاہیں تو ایک روز پہلے حکم دے دیں۔ دوسرے جوں ہی اطلاع دوں کہ خاصہ تیار ہے اسی وقت تناول فرمالیں۔"

نواب صاحب نے شرطیں منظور کرلیں اور باورچی ملازم ہوگیا۔ چند ماہ بعد باورچی کو دال پکانے کا حکم ہوا۔ چنانچہ اس نے دال تیار کی اور نواب صاحب کو خبر کی۔ نواب صاحب اس وقت کچھ ضروری باتوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ دستر خوان بچھاؤ میں آتا ہوں مگر کافی دیر تک نواب صاحب نہ آئے تو باورچی نے تیسری بار اطلاع دی کہ حضور خاصہ نوش فرمالیں مگر پھر بھی نواب صاحب باتوں میں مصروف رہے۔ اس پر باورچی اس قدر ناراض ہوا کہ اس نے دال کی ہانڈی چولہے پر سے اتار کر ایک سوکھے درخت کے تھالے میں انڈیل دی اور خود استعفیٰ دے کر چلتا بنا۔ کہتے ہیں کہ دوسرے روز وہ درخت جو بالکل سوکھا تھا سرسبز ہوگیا۔ نواب صاحب کو اس کے جانے کا بڑا قلق ہوا مگر باوجود تلاش کے اس کا سراغ نہ مل سکا۔

یہ واقعہ ہے کہ جیسے باکمال باورچی تھے، ویسے ہی ان کی قدر اور عزت افزائی کرنے والے بھی۔ چونکہ دولت کی فراوانی تھی اس لیے باورچیوں سے جو فرمائشیں کی جاتی تھیں ان پر مصارف کا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ بادشاہ، امراء اور روٴسا میں کھانے پکوانے میں اکثر مقابلے ہوتے تھے چنانچہ اس سلسلہ کے دو تین واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

ایک مرتبہ مرزا خرم بخت کے صاحب زادے مرزا آسماں قدر لکھنو کے آخری تاج دار واجد علی شاہ کے مہمان ہوئے تو دستر خوان پر ایک مربہ ایسا لاکر رکھا گیا جو بظاہر اس درجہ لطیف اور مرغوب معلوم ہوا کہ شہزادہ آسماں قدر نے مربہ سمجھ کر اس کا لقمہ کھایا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مربہ نہیں بلکہ قورمہ ہے۔ اس پر واجد علی شاہ مسکرادیے اور شہزادے کو بڑی ندامت ہوئی۔ کچھ عرصے بعد شہزادے نے بادشاہ کو دعوت دی اور وہ یہ سمجھ کر اس دعوت میں شریک ہوئے کہ شہزادہ ضرور اس کا بدلہ لے گا، اس لیے دستر خوان کی ہر چیز کو وہ سوچ سمجھ کر اٹھاتے۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ دھوکے پر دھوکے کھاتے رہے کیونکہ آسماں قدر کے مشہور باورچی شیخ حسین علی نے تمام کھانے جن میں پلاؤ، زردہ، بریانی، قورمہ، کباب، ترکاری، چٹنیاں غرض تمام الوان نعمت حتیٰ کہ اچار، روٹیاں، پراٹھے اور شیرمالیں شکر سے تیار کی تھیں، حد یہ کہ دستر خوان پر جتنے برتن تھے، وہ سب اور ان کے علاوہ سلفچی اور لوٹا تک شکر کا بنایا تھا۔ واجد علی شاہ جس چیز کو اٹھاتے دھوکہ کھاتے۔

جب امن اور سکون کی فضا ہوتی ہے تو لوگوں کے دماغ بھی طرح طرح کی جدت طرازیوں پر اتر آتے ہیں چنانچہ باورچیوں نے بھی بڑی بڑی جدتوں سے کام لیا۔ ہندوستان میں جو انار دانہ پلاؤ مشہور ہے وہ اسی دور کے باورچیوں کی جدت پسندی کا نتیجہ ہے۔ اس پلاؤ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاول کا ہر دانہ آدھا یاقوتی رنگ کا ہوتا اور آدھا سفید اور جب اسے قابوں میں رکھ دیا جاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ قابوں میں ہیرے جواہرات چن کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اسی دور کی ایجاد نورتن پلاؤ بھی ہے جس میں نو رنگ کے چاول ملے ہوتے تھے اور چاولوں کو ایسی صفائی اور نفاست کے ساتھ رنگا جاتا تھا کہ کہیں سے اس کا شبہ نہ ہوتا تھا کہ وہ چاول ہیں یا ہیرے جواہرات کے ٹکڑے۔

اسی دور کے مشہور رئیس نواب عبدالقاسم خاں تھے جن کے یہاں ایک نئی قسم کا پلاؤ پکتا تھا جو بھاری پلاؤ کہلاتا تھا۔ اس پلاؤ کے پکانے میں سب سے پہلے چھتیس سیر گوشت کی یخنی مقطر کرلی جاتی تھی اور اس کے بعد اس یخنی میں چاول دم کیے جاتے تھے۔ یہ چاول منہ میں رکھتے ہی اس طرح

گھل جاتے تھے کہ کھانے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ چاول کھانے کے بجائے کوئی شوربہ پی رہا ہے۔ اس سلسلے کا ایک بڑا لطیفہ سننے کے قابل ہے۔

اودھ کے آخری دور میں جب لکھنؤ تقریباً لٹ چکا تھا، ایک حکیم بندہ مہدی تھے جن کے یہاں ایک دن ایک پہلوان کو کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس پہلوان کی یومیہ غذا بھی عجیب تھی۔ وہ روز صبح کو بیس سیر دودھ پیتا تھا۔ اس کے بعد ڈھائی تین سیر بادام اور پستوں کا ناشتا کرتا تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں ایک بکرا اور دو ڈھائی سیر آٹے کی روٹیاں کھاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی دعوت کرنا کوئی آسان بات نہ تھی مگر اس دور میں چونکہ پیسے کی تنگی نہ تھی اس لیے لوگ اس قسم کی تفریحوں کے عادی تھے۔ پہلوان نے حکیم صاحب کے یہاں پہنچ کر کھانے کا انتظار کرنا شروع کیا لیکن حکیم صاحب ٹالتے رہے، جب پہلوان کی بھوک اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو حکیم صاحب نے اندر سے ایک مہری کے ہاتھ خوان بھیجا۔ پہلوان خوان کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ لیکن جب اس نے خوان پوش اٹھا کر دیکھا تو اس میں کم وبیش چھٹانک بھر پلاؤ کے دانے تھے۔ وہ بے حد ناراض ہوا، اس نے طشتری اٹھا کر منہ میں انڈیل لی، ظاہر ہے چھٹانک بھر پلاؤ کی بساط ہی کیا، اونٹ کے منہ میں زیرہ تھا لیکن چند ہی منٹ بعد پہلوان کو شدت سے پیاس لگی اور بے تاب ہو کر اس نے تین چار بار پانی پیا اور ڈکار لی۔ اتنے میں باقاعدہ دسترخوان بچھا اور حکیم صاحب نے پہلوان کو کھانے کی دعوت دی مگر پہلوان اس قابل نہ تھا کہ وہ ایک لقمہ بھی کھا سکتا، وہ کہتا تھا کہ مجھے ایسی توانائی محسوس ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

بعض شوقین اور دولت مند بڑے اہتمام سے مرغ پلاؤ پکواتے تھے اور یہ مرغ پلاؤ اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ مرغ مشک اور زعفران کی گولیاں کھلا کر پالے جاتے تھے اور جب وہ اچھے تن و توش کے ہو جاتے اور مشک اور زعفران ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتی کہ ان کے جسم سے خوشبو آنے لگتی تو مرغ کی یخنی نکال کر اس میں چاول دم کر لیے جاتے۔

اسی زمانے میں پلاؤ کی ایک قسم موتی پلاؤ کہلاتی تھی اور یہ موتی پلاؤ جب قاب میں رکھا ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سچے اور آب دار موتیوں کو پلیٹ میں لا کر رکھ دیا گیا ہے اس کے تیار کرنے کی ترکیب یہ تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ایک ماشہ سونے کے ورق، انڈے کی زردی میں ملا کر زردی کو حل کر لیا جاتا۔ اس کے بعد اس کی حل کی ہوئی زردی کو مرغ کے نرخرے میں بھر کر نرخرے کے ہر جوڑ پر باریک تاگا کس کے باندھ دیا جاتا اور اس کے بعد ایک معمولی جوش دے کر چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سڈول آب دار موتی نکل آتے جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دیے جاتے۔ بعض باورچی پنیر کے موتی بناتے اور اس پر چاندی کے ورق چڑھا دیتے۔ غرض سیکڑوں ہزاروں طرح کے کھانے اس دور میں ایجاد ہوئے اور ان کے پکانے میں نئی نئی جدتوں سے کام لیا جاتا۔ ان شاہی کھانوں میں جو دسترخوان پر ہوتے تھیں چالیس قسم کے پلاؤ اور بیس بائیس قسم کے سالن ہوتے مگر اب زمانے کے ساتھ ساتھ ان کھانوں کے بارے میں اگر غور کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ سب خواب وخیال کی باتیں ہیں۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دہلی والا قورمہ

اجزاء:۔

چکن	ڈیڑھ کلو
دہی	آدھا کپ
تیل	ایک چوتھائی کپ
پیاز	چار عدد
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد
لونگ	پانچ عدد
کالی مرچ	چھ عدد
جائفل	ایک چوتھائی ٹکڑا
جاوتری	دو ٹکڑے
ادرک لہسن پسا ہوا	دو چائے کے چمچے
نمک	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
کیوڑا	آدھا چائے کا چمچہ
زعفران	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

ایک چوتھائی کپ تیل میں باریک کٹی پیاز ڈال کر سنہرا ہونے تک تلیں۔ پھر تلی ہوئی پیاز کو نکال کر اخبار پر پھیلا دیں تاکہ کرسپی ہو جائے۔ اس کے بعد تیل میں چھوٹی الائچی، لونگ، کالی مرچ، جائفل، جاوتری کے ٹکڑے اور ادرک لہسن ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ پھر مرغی ڈال کر دوبارہ اچھی طرح بھونیں۔ ایک پیالے میں نمک، پسی لال مرچ اور پسا دھنیا ملائیں اور چکن کے آمیزے میں شامل کر دیں۔ ساتھ ہی پھینٹی ہوئی دہی اور ایک کپ پانی ڈال کر چکن کے گل جانے تک پکائیں۔ اب تلی ہوئی پیاز کو چل کر شامل کریں اور گریوی کے گاڑھا ہو جانے تک پکائیں۔ آخر میں کیوڑا اور زعفران ملا کر قورمے میں شامل کر دیں۔ اب اسے ڈھک کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھیں کہ تیل اوپر آجائے۔

مزے دار دہلی قورمہ تیار ہے۔

انڈے کا حلوہ

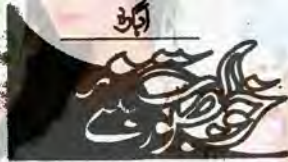
اجزاء:۔

انڈے	چھ عدد
گھی	ایک پاؤ
چینی	ایک پاؤ
کھویا	ایک پاؤ
سبز الائچی	پانچ عدد
بادام، پستے	حسب ضرورت
پسا کھوپرا	چار سے پانچ کھانے کے چمچے
جائفل	حسب ضرورت
چاندی کا ورق	حسب ضرورت

ترکیب:۔

پہلے ایک پیالے میں گھی اور انڈے کو اچھی طرح پھینٹ لیں پھر چینی ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ اب اس میں کھویا ڈال دیں۔ اور ایک پین میں اس آمیزے کو ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ پھر سبز الائچی کے دانے ڈال دیں جب تمام چیزیں یک جان ہو جائیں تو اس میں کھوپرا اور جائفل ڈال کر مزید بھونیں۔ انڈے کے حلوے کو بادام، پستے اور چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔





موسم سرما میں جلد کی حفاظت کیجیے

موسم سرما کی آمد کے ساتھ ساتھ تازگی کا احساس ہمیں اس کے استقبال کے لیے آمادہ کرتا نظر آتا ہے۔ مگر سرد موسم کے استقبال میں ہماری جلد ہمارا ساتھ نہیں دیتی اور موسم کی خشکی کے سبب رنگت ماند پڑ جاتی ہے۔ ایسے میں سرما کے خشک اثرات کو زائل کرنے کے لیے قدرتی اشیاء سے تیار کردہ ماسک جلد کو نکھار بخشتے ہیں۔

پپیتے کا ماسک

پکے ہوئے پپیتے اور کیلے کو پیس کر یک جان کرلیں، اس میں دو چمچ شہد ملالیں۔ اس کے بعد اس کو چہرے پر لگالیں۔ کچھ دیر کے بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ اس سے نہ صرف چہرے کی تازگی میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے چہرے پر پڑنے والی جھریاں بھی ختم ہوں گی۔

دودھ اور بادام کا ماسک

ایک چمچہ پسے ہوئے بادام اور دو چمچے دودھ لے کر اس کا پیسٹ بنالیں۔ اس کو چہرے پر لگا کر خشک ہونے دیں۔ اس کے بعد تازہ پانی سے منہ دھولیں۔ دودھ اور بادام کے اندر موجود وٹامن سی نہ صرف جلد کی رنگت کو بحال کرتا ہے بلکہ اس کو کھلا کھلا اور تروتازہ بناتا ہے۔

گلیسرین کا ماسک

گلیسرین ایک انتہائی سستا اور آسانی سے مل جانے والا جز ہے۔ چہرے کو سادہ پانی سے دھونے کے بعد ہلکا خشک ہونے کے بعد روئی سے دھیرے دھیرے گلیسرین کو چہرے پر لگادیں۔ اس کو دھونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دن بھر آپ کے چہرے کو موسم کی خشکی سے بچا کر رکھے گا۔

لیموں اور شہد کا ماسک

دو چمچے شہد میں آدھا لیموں نچوڑ لیں۔ اس کو اچھی طرح ملالیں اور پھر چہرے پر لگائیں، خشک ہونے کے بعد اس کو دھولیں۔ اس سے نہ صرف رنگت سفید ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جلد کے دھبے بھی صاف ہوتے ہیں۔

امید ہے ان ٹوٹکوں کے ذریعے نہ صرف آپ اپنی روٹھی ہوئی جلد کو منالیں گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ موسم کا لطف بھی اٹھاسکیں گی۔

لیموں اور بادام کا ماسک

داغ، چھائیاں دور کرنے کے لیے بادام کے چھلکے اتار کر گرائنڈ کرلیں۔ اس میں انڈے کی سفیدی اور نصف چائے کا چمچہ لیموں کا رس شامل کرکے مکس کرلیں۔ چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ بعد دھوئیں۔

لیموں اور بادام کے تیل کا ہینڈ لوشن

تین چائے کے چمچے لیمن جوس، چھ چائے کے چمچے شہد اور آٹھ چائے کے چمچے بادام کا تیل ایک برتن میں مکس کرلیں۔ اس سے دس سے بارہ منٹ تک ہاتھوں کی اچھی طرح مالش کریں۔ پھر یکساں مقدار میں پانی اور سرکہ کے آمیزے سے اسے دھولیں۔ یہ لوشن دو ہفتوں تک قابل استعمال رہتا ہے۔ اس لیے اسے کسی شیشی میں ڈال کر محفوظ کرلیں۔

چکنی جلد کے لیے لیموں اور پپیتے کا فیس پیک

آدھا چائے کا چمچہ ہلدی پاؤڈر، دو چائے کے چمچے لیمن جوس، تین چائے کے چمچے پپیتے کا گودا مکس کرکے ملائم پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر یکساں لگائیں۔ البتہ آنکھوں سے دور رکھیں۔ اس پیک کو بیس منٹ تک لگا رہنے دیں اور پھر دھولیں۔ یہ فیس پیک کو تیار کرنے میں نہایت آسان ہے لیکن یہ بے کیف رنگت صاف کرنے میں نہایت موثر ہے۔ ☆